گلزارِ خطابت

تقاریر

حضرت آیت اللہ حسین بخش جاڑا اعلیٰ اللہ مقامہ

ترتیب

مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون: 5425372

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب .... گلزار خطابت

مصنف .... حضرت علامہ حسین بخش جاڑا

مترجم .... مولانا ریاض حسین جعفری

پروف ریڈنگ .... شیخ خادم حسین

تعداد 1000

ایڈیشن .... نومبر 2002ء

ہدیہ .... 135 روپے

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون: 5425372

عناوین

پہلی مجلس: 7

معیار محبت، مصائب علی اکبرؑ، مصائب حسینؑ مظلوم

دوسری مجلس: 29

رحمت عالمینؐ، مصائب مخدرات عصمت

تیسری مجلس: 55

شانِ ابو طالبؑ

چوتھی مجلس: 82

حقیقت اسلام، شہادت علی اکبرؑ

پانچویں مجلس: 105

عظمت قرآن مجید

چھٹی مجلس: 119

تفسیر آیہ تطہیر

ساتویں مجلس: 141

بسم اللہ کی فضیلت، اسیری زینبؑ

آٹھویں مجلس: 152

علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ

نویں مجلس: 102

اپنی مجالس کو زینت دو علیؑ کے ذکر سے

مصائب حضرت سکینہؑ

دسویں مجلس: 176

علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ

غم حسینؑ ایک زندہ معجزہ ہے

گیارہویں مجلس: 185
ہم ایام کو لوگوں میں بدل بدل کر لاتے ہیں
واقعہ حضرت سلیمانؑ
بارہویں مجلس: 205
فضائل امام تقیؑ ' شہادت معصومہ قم
تیرہویں مجلس: 225
یوم ندعو اکل اناس بامامھم
زندانِ شام
چودہویں مجلس: 238
نور محمدؐ انبیاء کی سلطانی کا تاج ہے
پندرہویں مجلس: 254
کیا برابر ہیں وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو
نہیں جانتے ۔ مصائب حضرت سکینہؑ
سولہویں مجلس: 265
علیؑ کی محبت اس گناہوں کو کھا جاتی ہے۔ جس طرح
آگ خشک لکڑی کو
سترہویں مجلس: 276
الحسین منی وانامن الحسین
اٹھارویں مجلس: 291
وہ سلطان سلطان نہیں جس کا علیؑ سلطان نہیں
انیسویں مجلس:
جو آلِ محمدؐ کی محبت پر مرا وہ شہید ہوا

حرفِ اشاعت

علامہ حسین بخش جاڑا اعلیٰ اللہ مقامہٗ مذہب حقہ شیعہ خیر البریہ کے گرامی قدر مفسر قرآن اور معتبر خطیب عالی بیان تھے۔ انہوں نے تفسیر قرآن "انوار النجف" کی پندرہ جلدوں کے ساتھ ساتھ متعدد کتب بطور ورثہ چھوڑیں ۔ جن میں سے اصحاب الیمین' مناظرہ بغداد' امامت وملوکیت اور معیار شرافت نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتب میں موضوع کے حوالے سے مکمل انصاف' حقیقی معیار استدلال' اور لفظی ومعنوی حسن و جمال کو نہایت دسترس سے نبھایا گیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ موصوف کی تقاریر (مجالس عزا) بھی علمیت وعملیت اور دانش وحکمت نیز فہم دین اور ادراک مذہب کے بیش بہا خزانے ہیں۔ ملت جعفریہ کی موجودہ و آئندہ نسلوں کو جاڑا صاحب قبلہ مرحوم ومغفور کے افکار وملفوظات سے باخبر رکھنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ عقائد اور اصول وفروع کا بطریق احسن ادراک کرسکیں اور سیرت محمد وآل محمدؐ سے کاملاً آگاہ ہو کر اپنی زندگانیوں کو سنوار سکیں۔

علامہ صاحب سرائیکی زبان کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو زبانوں میں بھی خوب دلچسپی رکھتے تھے۔ ان مجالس میں سے کچھ اردو زبان میں تھیں اور کچھ سرائیکی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ انشاء اللہ ہم ان کی مزید سرائیکی مجالس کو بھی اردو میں ترجمہ کر کے منظر عام پر لائیں گے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے ادیب شہیر پروفیسر چوہدری مظہر عباس بھنڈر کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ احتیاطاً پیش کردہ اردو مجالس کو زباندانی کے حوالے سے نکھارنے اور تحقیق و تنقید کی سان پر پرکھنے کی ذمہ داری بھی پروفیسر صاحب موصوف کے ذمہ ہے۔ ادارہ ان کی دقت نظر اور اصلاح و تصحیح کا تہہ دل سے ممنون ہے۔ نیز ان کی معاون کار سیدہ صدف نقوی بھی ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں۔

اللہ تعالٰی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ترجمہ و تحقیق کے ساتھ ساتھ مجالس کی تدوین کے لحاظ سے بھی ہمارے ادارے کی کارکردگی باعثِ فخر ہے۔ ہم توضیح نمبرا جیسی پرانی کتب مجالس اور لکھنؤ کے نامور علماء کی مجالس کی اشاعت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بزرگ علماء علامہ حافظ کفایت حسین اعلیٰ اللہ مقامہٗ علامہ رشید ترابی مرحوم و مغفور، علامہ نسیم عباس رضوی، حمادِ اہل بیت سید محسن نقوی شہید، علامہ عرفان حیدر عابدی مرحوم اور علامہ نصیر الاجتہادی مرحوم کی مجالس کے مجموعے بھی یکے بعد دیگرے منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اور ان کی مقبولیت کے سلسلے میں قارئین مومنین و مومنات کے احسان مند ہیں۔ مزید کتب کی اشاعت اور علومِ محمدؐ و آل محمدؐ کی ترویج و اشاعت میں تعاون کی پرزور اپیل کے ساتھ اللہ حافظ۔

دعا گو!

مولانا ریاض حسین جعفری

سرپرست ادارہ منہاج الصالحین لاہور۔

پہلی مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم‘

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالنَّارُ لِلْعَاصِيْنَ وَالْمُعَانِدِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ‘ مُحَمَّدِ ۨالْمُصْطَفٰے وَآلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

وَلَعْنَةُ الدَّائِمَةُ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ مَلْعُوْنِيْنَ اَجْمَعِيْنَ مِنْ يَوْمِ عَدَاوَتِهِمْ اِلٰى قِيَامِ يَوْمِ الدِّيْنَ‘ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِىْ كِتَابِهِ الْمُبِيْنَ وَخِطَابِهِ الْمَتِيْنَ وَهُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم‘

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے‘ اپنے والدین کے گناہوں کی بخشش کے

لئے جس مرحوم کے ایصال ثواب کی مجلس ہے' اس کے گناہوں کی بخشش کے لئے اور تمام مومنین مرحومین کی بخشش کے لئے بآواز بلند صلواۃ۔

میں سٹیج پر آ کر اکثر مجبور ہو جاتا ہوں:

بہت سے لوگ خواہش کرتے ہیں کہ سرائیکی میں پڑھوں اور آج بانیانِ مجلس کا اصرار ہے کہ اردو میں پڑھوں۔ البتہ "میں اردو مجلساں ایسیاں پڑھیاں جھڑیاں تہاتوں سرائیکی نالوں وی سستیاں پوسن"۔

ارشاد قدرت ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ.

میرے حبیب! اپنی امت کو یہ بات واضح کر کے سمجھا دو کہ اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو اور اگر تم سمجھتے ہو کہ اللہ سے پیار کرنا چاہئے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ لیکن تنہا تمہارا اللہ سے محبت کرنا تمہارے لئے فائدہ مند نہیں۔

سامعین محترم!

بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو بے شک کرو' کیونکہ اللہ یقیناً اس لائق ہے کہ تم اس سے محبت کرو' لیکن تنہا تمہارا اللہ سے محبت کرنا تمہارے لئے فائدہ مند نہیں' جب تک اللہ تم سے محبت نہ کرے۔ اس لئے کہا یک طرفہ محبت کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کامیاب محبت وہی ہے جو دونوں طرف سے ہو۔ میں جس سے پیار کروں مجھے اس سے پیار کا تب تک کچھ فائدہ نہیں جب تک وہ مجھ سے پیار نہ کرے۔

میں جس سے محبت کرتا ہوں' خواہ مخواہ نہیں کرتا۔ محبت پیدا ہونے کے

اسباب ہوتے ہیں اور بغیر سبب کے محبت نہیں ہوتی۔ اگر محبت بغیر سبب کے ہوتی تو ہر شخص کو دوسرے شخص سے محبت ہوتی۔ لیکن ہر شخص کو کسی سے محبت ہے کسی سے نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں محبت کے اسباب ہیں وہاں محبت ہے اور جہاں محبت کے اسباب نہیں ہیں وہاں محبت نہیں ہے۔ (صرف انسانوں کی انسانیت سے محبت پر اس کلیے کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ دنیا کی ہر شے سے محبت کا یہی اصول ہے) انسان کو کسی سے محبت ہے' کسی سے نہیں ہے۔ چنانچہ محبت ہونے کے لئے بھی کچھ اسباب ضروری ہیں اور محبت نہ ہونے کے بھی کچھ اسباب ضروری ہیں۔ پیار بغیر سبب کے نہیں ہوتا اور نفرت بھی بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔ تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو یقیناً کوئی سبب ہے جو تمہیں اللہ سے محبت پر آمادہ کرتا ہے۔ ہمارے اسباب محبت میں جہاں حق ہے وہاں محبت ہے جہاں حق نہیں وہاں محبت نہیں۔ محبت بغیر غرض کے نہیں ہوتی لیکن اغراض جدا جدا ہیں۔ ہر شخص کی غرض ایک جیسی نہیں۔ لہٰذا غرض ہی معیار محبت ہے۔

سامعین محترم!

چونکہ ہمارے معیار محبت الگ الگ ہیں۔ اس لئے ہر شخص کا محبوب الگ ہے۔ اگر معیار ایک ہوتا تو محبوب ایک ہوتا۔ غرض ایک ہوتی تو محبوب ایک ہوتا.......... غرض ایک معیار الگ' اسی لئے محبوب الگ۔ کسی کے نزدیک محبت کا معیار ہے حسن' خوبصورتی.......... لہٰذا اس کی محبت خوبصورتی کے لئے ہوگی اور کسی کے لئے معیار محبت ہے۔ دولت.............. اس کی محبت دولت کے گرد گھومے گی۔ کسی کے نزدیک معیار محبت ہے کرسی.......... وہ وہاں محبت کرے گا جہاں سے کرسی کی امید ہوگی۔ کسی کے نزدیک معیار محبت ہے دین وہ اسی سے محبت کرے گا

جہاں سے دین کے ملنے کی توقع ہوگی۔

معلوم ہوا ہر شخص کی غرض الگ ہے' چنانچہ ہر شخص کی محبت الگ ہے۔ ہو سکتا ہے باپ کے نزدیک محبت کا معیار اور ہو' بیٹے کے لئے محبت کا معیار اور ہو۔ ایک بھائی کے نزدیک محبت کا معیار اور ہے' دوسرے بھائی کے نزدیک محبت کا معیار اور ہے۔ چنانچہ ہر شخص کا محبوب ایک نہیں ہوگا۔ باپ کو جس سے محبت ہو' ہو سکتا ہے بیٹے کو اس سے نفرت ہو۔ ایک بھائی کو محبت ہو' دوسرے کو ہو سکتا ہے اس سے نفرت ہو' اس لئے کہ محبت معیار کے پیچھے دوڑتی ہے۔ اب اللہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری محبت معیار کے پیچھے دوڑتی ہے تو میں ہر معیار پر پورا اترتا ہوں۔ اگر تمہارے نزدیک معیار محبت حُسن ہے تو حُسن کا خالق میں ہوں۔ اگر تمہارے نزدیک معیار محبت کرسی ہے تو کرسی کا مالک میں ہوں۔ تمہارے نزدیک معیار محبت دین ہے تو میں دین کا مالک ہوں۔ جس چیز کو تم غرض سمجھتے ہو' جس شے کو معیار محبت سمجھتے ہو میں ہر شخص کے معیار محبت پر پورا اترتا ہوں۔ مجھ سے جو شخص بھی کوئی شے مانگے میں اس کی مانگ کو پورا کرتا ہوں' بے شک ہر شخص مجھ سے محبت کرے کیونکہ ہر شخص کے مطلب کو پورا کر سکتا ہوں............ میں کائنات کے ہر شخص کا محبوب بن سکتا ہوں' کیونکہ ہر شخص کا معیار محبت مجھ میں موجود ہے۔ لیکن تنہا تمہارا اپنے مزاج کو دیکھنا یہ بھی تمہاری حماقت ہے کہ تم اپنا معیار محبت دیکھو اور یہ نہ دیکھو کہ اس کا معیار محبت کیا ہے؟

حضرات گرامی!

میں تو محبت اس سے کرتا ہوں' اور اس لئے کرتا ہوں کہ اس میں میرا معیار محبت ہے تو اس کا بھی کوئی معیار محبت ہونا چاہئے کہ وہ کس معیار پر محبت کرتا

ہے۔ نالائق ہے وہ محب جو اپنا معیار تو محبوب میں دیکھئے اور محبوب کا معیار اپنے اندر پیدا نہ کرے............

اللہ فرماتا ہے!

تم مجھ سے محبت کرو' تمہارا معیار مجھ میں تو ہے لیکن کیا تمہارے اندر وہ معیار ہے جس پر میں محبت کرتا ہوں۔ اگر نہیں تو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے.........

مذہب شیعہ ایک معیار کا مذہب ہے ۔ ہمارے نزدیک دعویٰ خدائی کرنے والا ہر دعویدار خدا نہیں۔ خدائی کا بھی ایک معیار ہے۔ ہر دعویٰ نبوت کرنے والا نبی نہیں' بلکہ ہمارے نزدیک نبی کا ایک معیار ہے۔ ہم ہر شخص کو امام نہیں مانتے' امامت کے لئے بھی ایک معیار ہے۔ اگر خدا خدائی کے معیار پر پورا نہ اترے تو ہم اسے خدا نہیں مانتے اور اگر امام امامت کے معیار پر پورا نہ اترے تو ہم اسے امام نہیں مانتے۔

جس طرح ہم معیار توحید کے بغیر خدا نہیں مانتے اللہ بھی دیکھتا ہے کہ اس شخص میں بندہ ہونے کا معیار ہے؟ میں نے تو اسے انسان کی شکل دے دی ہے۔ انسان بنا دیا ہے لیکن کیا یہ خود بھی اپنے معیار انسانیت کو سمجھتا ہے؟ میرے نزدیک تو ایک معیار ہے کہ یہ معیار ہوگا تو نبی مانوں گا لیکن ایک نبی بھی چاہتا ہے کہ اس میں میرے امتی ہونے کا معیار ہے؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ میرے امام میں معیار ہونا چاہئے تا کہ میں امام مانوں۔ لیکن علیؑ بھی دیکھتا ہے کہ اس میں میرے شیعہ ہونے کا معیار ہے؟ ایک موالی میں موالی ہونے کا معیار ہے؟

خالق فرماتا ہے!

کہ میں تو خدا ہوں تم بھی بندہ بننے کی کوشش کرو۔ محمد مصطفیٰؐ تو نبی ہے تم امتی ہونے کا ثبوت مہیا کرو۔ علیؑ تو حق ہے تم اپنے اندر اس کا غلام بننے کی کوشش

کرو کہ وہ اوصاف پیدا ہو جائیں جو غلامانِ علیؑ کے ہوتے ہیں............ اگر تم محبوب کا معیار دیکھتے ہو تو اپنا معیار بھی دیکھو۔ کتنا نالائق ہے وہ شخص جو محبوب کا معیار تو دیکھے مگر اپنے اندر معیار پیدا نہ کرے۔ اگر علیؑ محبوب ہیں تو ان کا بھی ایک معیار محبت ہے۔ اگر محمد مصطفیٰؐ محبوب ہیں تو ان کا بھی معیار محبت ہے۔ وہ بھی ہر شخص سے محبت نہیں کرتے‘ اللہ بھی ہر شخص سے محبت نہیں کرتا۔ اس کا بھی معیار محبت ہے۔ جو شخص اپنا معیار محبت دیکھے اور ان کا معیار محبت اپنے اندر پیدا نہ کرے اس کی بندگی میں شک ہے۔ وہ تو صحیح بندہ ہی نہیں جو اپنا معیار نہیں سمجھ سکتا۔

حضراتِ محترم!

ہمارے نزدیک خدا کا کیا معیار ہے؟ صفاتِ ثبوتیہ رکھتا ہو‘ صفاتِ سلبیہ ہوں۔ ہمارے نزدیک توحید کا معیار کتابوں میں بند ہے‘ جس میں ان صفات میں سے ایک صفت بھی کم ہو ہم اسے خدا نہیں مانتے۔ نبیؐ کا بھی معیار ہے‘ شیعوں کے نزدیک.......... اس لئے کہ ہم شیعہ مذہب کے ماننے والے بغیر معیار کے کسی کو مانتے ہی نہیں۔ نہ کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ ہماری نفرت کا بھی ایک معیار ہے۔ ہم نبی اسے مانتے ہیں جس میں معیار نبوت ہو۔ معیار نبوت کیا ہے؟

ہمارے نزدیک معیار نبوت معصوم ہونا ہے سب سے پہلا معیار عصمت ہے۔ جو کسی زمانے میں بھی گنہگار ہے وہ کبھی نبی نہیں بن سکتا.......... ہے نا‘ ہمارے نزدیک نبی کا معیار یہ ہے کہ ہندو کدے کا نہ ہو‘ مشرک کدے کا نہ ہو‘ کافر کدے کا نہ ہو‘ نہ اس کی ماں کافرہ ہو نہ اس کا باپ کافر ہو۔ کسی کافر کا بیٹا کلمہ پڑھ کر مسلمان تو بن سکتا ہے مگر باوجود ہزار نیک اعمال کے نبی ہرگز نہیں بن سکتا۔

سامعین!

ہمارے نزدیک معیار ہے۔ کافر کے بیٹے کو ہم نبیؐ کیوں نہیں مانتے.......... !‘ ایک ایسی دلیل کہ جسے ہر شخص سمجھے اور دوسروں کو سمجھا سکے کہ نبی کے ماں باپ کا مسلمان ہونا کیونکہ ضروری ہے۔ آدمؑ سے لے کر خاتم تک ہر نبی کی شریعت میں والدین کی اطاعت واجب ہے۔ کسی نبی کی شریعت میں بھی والدین کی اطاعت کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ چونکہ والدین کی اطاعت ہر شریعت میں واجب ہے اور ہر نبی اپنی امت کو حکم دینے سے پہلے خود اپنی شریعت پر عامل ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی شریعت پر خود عمل نہ کرے تو دوسروں کو کیسے حکم دے سکتا ہے۔ اگر نبی کے ماں باپ خدانخواستہ کافر ہوں تو ان کی اطاعت کرے گا یا نہ کرے گا۔ اگر اطاعت کرتا ہے تو نبوت نہیں چلتی اور اگر اطاعت نہیں کرتا تو امت کو والدین کی اطاعت کا حکم نہیں دے سکتا اس لئے اللہ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا جو ان کاموں میں والدین کا ممنون ہو۔

بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک روپے کا دودھ بازار سے لینا ہو تو کسی ایسے نوکر کو آپ بھیجیں جسے نہ وضو کا معنیٰ آتا ہے نہ غسل کا معنیٰ آتا ہے‘ نہ طہارت جانتا ہے نہ نجاست۔ کہہ دیں کہ ایک روپے کا دودھ بازار سے لے آؤ۔ وہ اگرچہ طہارت نجاست کا معنیٰ نہیں سمجھتا لیکن یہ سمجھتا ہے کہ دودھ اللہ کی رحمت ہے۔ لہٰذا کسی ایسے برتن میں دودھ نہیں لاتا جو نجس ہو۔ خواہ وہ دودھ ایک روپے ہی کا کیوں نہ ہو.......... پلید برتن میں دودھ ڈلوانا ایک نوکر بھی گوارا نہیں کرتا۔ دس سال کا کم سن بچہ بھی پسند نہیں کرتا کہ دودھ کے لئے برتن ناپاک ہو۔ جب ایک روپے کی اللہ کی رحمت (دودھ اللہ کی رحمت ہے) ہمارا جاہل شخص بھی نجس برتن میں ڈلوانا پسند نہیں کرتا تو عالمین کی رحمت کو اللہ نے نجس برتن میں کیسے رکھا؟

ہے نا سمجھنے والی بات۔ ایک روپے کی نعمت ہے۔ اللہ کی' ایک روپیہ قیمت ہے اس کی۔ تو اسے بھی ہمارا جاہل سے جاہل بندہ نجس برتن میں ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا اور اگر نجس برتن میں ڈالا جائے تو وہ بندے کے کام کی نہیں۔ جب ایک روپے کی اللہ کی رحمت نجس برتن میں نہیں آ سکتی تو عالمین کی رحمت پروردگار نجس برتن میں کیونکر رکھ سکتا ہے؟ لہٰذا ہمارے نزدیک نبیؐ کا معیار یہ ہے کہ کافر ماں باپ کا بیٹا نبی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ کافر ہے ناپاک اور نبوت ہے پاک۔ اس لئے نبوت کا ظرف ناپاک نہیں ہوسکتا۔

جس طرح ہمارے نزدیک نبوت کا معیار ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے نزدیک امامت کا بھی معیار ہے۔ امام بھی اسی کو مانتے ہیں جو معصوم ہو۔ اور جس طرح کسی کافر کا بیٹا نبی نہیں بن سکتا۔ ہمارے نزدیک کسی کافر کا بیٹا نبی کا مسند نشین بھی نہیں ہوسکتا۔ (نعرۂ حیدری)

ہمارے نزدیک تو ایک محلے کی مسجد میں رہنے والے ایک پیش نماز کا بھی معیار ہے۔ ہم ہر شخص کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ پیش نماز وہ ہونا چاہئے جس میں معیار پیش نمازی ہو۔ اگر سارے داڑھیوں والے استرا پھروا کر نماز پڑھیں تو پیش نماز بھی جرأت کرے کہ اگر میرے مقتدی ایسے ہیں تو میں بھی استرا پھروالوں۔ وہی استرا پھروانے والے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے۔ اگرچہ خود داڑھی نہیں رکھی۔ لیکن داڑھی منڈوانے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے۔ کیونکہ؟ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو گنہگار ہیں لیکن کم از کم مصلۂ امامت پر تو ایسا ہو کہ جس میں نبوت یا امامت کے کردار کی جھلک موجود ہو.......... ہم تو گنہگار ہیں کم از کم مصلے والا..............!' حالانکہ ہے چھوٹی سی مسجد' دس بیس گھروں کی مسجد ہے۔ بیس

گھروں کی مسجد میں بھی پیش نماز اگر معیار سے عاری ہے تو ہم اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

سامعین محترم!

نماز باجماعت کا ثواب یہ ہے کہ اگر نمازی دس آدمیوں سے زیادہ ہو جائیں (نماز باجماعت میں) تو ایک ایک رکعت کا ثواب تمام ملائکہ قیامت تک شمار نہیں کر سکتے۔

اندازہ کیجیے!

جب ایک رکعت کا ثواب فرشتے رقم نہیں کر سکتے۔ خواہ ساری دنیا کے درخت قلمیں ہوں' ساری دنیا کے سمندر سیاہی بن جائیں' سارے فرشتے لکھنے والے ہو جائیں تو ایک رکعت کا ثواب تک نہیں لکھ سکتے جو باجماعت ادا کی جائے.......... گویا ہم اتنے ثواب کو چھوڑ دیتے ہیں اور نا اہل کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے' کیوں؟.............. اگر پیش نماز صاحب معیار ہو تو ایک رکعت کا ثواب شمار ہی نہیں ہوتا اور اگر پیش نماز نا اہل ہو تو وہ نماز کی ایک رکعت بھی نہیں رہتی۔ ہم کہتے ہیں چلو ایک تو ہو۔ بے معیار کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اندازہ فرمایئے۔ جو قوم دس بارہ گھروں کی مسجد میں نماز پڑھانے والے پیش نماز کو معیار پر پرکھتی ہے اور وہ اگر معیار نہ رکھتا ہو تو مصلے پر نہیں ٹھہرنے دیتی' وہ قوم بھلا محمدؐ کے مصلے پر بغیر معیار کے کسی کو کسی طرح برداشت کر سکتی ہے۔ (نعرۂ تکبیر' نعرۂ رسالت' نعرۂ حیدری)

ہمارے نزدیک معیار ہے۔ ہمارا مذہب بغیر معیار کے نہیں۔ ہم سب کو برابر کیوں نہیں سمجھتے؟ اس لئے کہ فضیلت کا دارومدار معیار پر ہے۔ اگر سب کا معیار ایک ہو تو سب برابر ہوں۔ اگر معیار الگ الگ ہے تو ان کا مقام یقیناً الگ الگ

ہے۔ سب برابر کیوں نہیں۔ اس لئے کہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد چپڑاسی سے لے کر صدرِ مملکت تک سب نے علیؑ سے علم کی بھیک مانگی۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک نے کرسیٔ افتاء کے مالک علیؑ سے مسائل کی بھیک مانگی۔ اور علیؑ وہ دانا ہے جو کسی سے بخل نہیں کرتا۔ ہر ایک کا مشکل کشا ہے۔ اپنوں کا بھی مشکل کشا، غیروں کا بھی مشکل کشا۔ حتیٰ کہ اتنا مشکل کشا کہ صدرِ مملکت نے اگرچہ مانا نہیں لیکن اتنا ضرور کہہ دیا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ (نعرۂ حیدری)

سب نے علیؑ سے پوچھا اور علیؑ نے ہر ایک کی مشکل کشائی کی۔ اگر سارے برابر تھے، کلاس فیلو تھے تو جس طرح وہ علیؑ سے پوچھتے رہے کوئی کتاب، کوئی رسالہ، کوئی راوی یہ ثابت نہیں کر سکتا، کہ کبھی علیؑ نے کوئی مسئلہ کسی سے پوچھا ہو۔ ان سب کا علیؑ سے پوچھنا اور علیؑ کا ان سے نہ پوچھنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد "قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ۔"

(نعرۂ حیدری)

سامعین محترم!

علیؑ تو اپنے گھر میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ چار بھائی ہیں۔ سب سے چھوٹا علیؑ۔ ایک ماں، ایک باپ، چار بیٹے، چوتھا علیؑ وہ بزرگ ہیں، یہ عزیز ہے۔ لیکن بزرگ ہونے کے باوجود اپنے اس عزیز کے برابر نہیں۔ اپنے ماں جائے ہیں، باپ کے بیٹے ہیں، لیکن علیؑ کے برابر نہیں۔ وہ غلام ہیں، علیؑ سلطان ہیں۔ اب دعوتِ فکر ہے کہ علیؑ اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہیں یہ علیؑ کی اپنی قسمت کہ گھر میں نمبر چوتھا ہے.............. چوتھے نمبر پر علیؑ ہے۔ لیکن بزرگ اس کے برابر نہیں اس لئے کہ علیؑ سلطان ہے۔ غور کی بات یہ ہے، فکر کی بات یہ ہے اور سوچنے کی بات یہ ہے

کہ یہ علیؑ کی ماں کے بیٹے ہیں، جب علیؑ کی اپنی ماں کے بیٹے علیؑ کے برابر نہیں تو کسی اور ماں کے بیٹے علیؑ کے برابر کیسے؟ (نعرۂ حیدری)

علیؑ اپنے بھائیوں کا امام۔

صرف بھائیوں کا ہی نہیں۔

علیؑ اپنے ابا کا امام۔

علیؑ اپنی اماں کا امام۔

صرف ایک اماں کا امام ہی نہیں علیؑ ہر اماں کا امام۔

ایک ابا کا امام نہیں ہر ابّے کا امام۔

ابو طالبؑ سے لے کر آدم تک علی ہر ابّے کا امام ہے۔

اور جناب فاطمہ بنت اسد سے لے کر جناب حوا تک ہر اماں کا امام ہے۔

ایک طرف ہر بزرگ کا امام۔

ایک طرف ہر امیر کا امام۔

ابو طالبؑ سے لے کر آدم تک ہر باپ کا امامؑ۔

حسنؑ سے لے کر مہدی تک ہر بیٹے کا امام۔

ہر امیر کا امام۔

یا یوں کہہ دوں اپنی ساری اصل کا امام پوری نسل کا امام۔ (نعرۂ حیدری)

یہ علیؑ کا مقام ہے اور یہ مقام صرف علیؑ کا ہے بزرگوں کا بھی امام۔ عزیزوں کا بھی امام۔ باقی اماموں کو یہ مقام حاصل نہیں۔ حسنؑ، حسینؑ سے لے کر مہدیؑ تک ہر امام کا امام ہے، لیکن اپنے اَبا کا امام نہیں۔ حسینؑ، سجادؑ سے لے کر مہدیؑ تک ہر عزیز کا امام ہے، اپنے اَبا کا امام نہیں، باقی کسی امامؑ کو دیکھو "عزیز" کے

امام ہیں "اب" کے امام نہیں۔ یہ شرف صرف علیؑ کو حاصل ہے کہ ہر بزرگ کا بھی امام ہے اور ہر عزیز کا بھی امام ہے۔ (نعرۂ حیدری)

اپنی اماں کا امام............ یہ جذباتی فقرہ ہے۔ اصول کافی شریف کی حدیث ہے کہ حضرت سلطان الانبیاء اپنی مسند نبوت پر تشریف فرما تھے۔ حضرت امیر المومنین بارگاہ رسالت میں حاضری کے لئے پیش ہوئے۔ نبوت نے امامت کا استقبال کیا' گلے لگایا' دریافت کیا۔ یا علیؑ جس شکل میں آپ آئیں چہرہ مرجھایا ہوا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ عرض کرتے ہیں' یارسول اللہؐ! آج میری امی جان کا دنیا سے انتقال ہوگیا ہے۔ رسول خداؐ اتنے روئے کہ ریشِ مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔

فرمانے لگے:

یا علیؑ! وہ تیری اکیلے کی ماں نہیں' میری بھی ماں ہے۔

اب میں کہہ سکتا ہوں کہ جب محمد مصطفیٰؐ کہیں کہ میری بھی اماں ہیں تو پوری کائنات کو کہنا پڑتا ہے کہ میری بھی اماں ہیں۔ جب محمدؐ کی اماں ہے تو محمدؐ کی بیٹی کی بھی اماں ہیں' علیؑ سے لے کر مہدیؑ تک بارہ اماموں کی اماں۔ پیغمبر فرماتے ہیں۔ میری اماں تو پھر زہراؑ کی اماں' گویا کائنات میں واحد خاتون ہے جس کو چودہ معصومؑ اماں کہتے ہیں..............!

حضرت پیغمبر تشریف لائے مدینے کی پاکباز عورتوں کو حکم دیا۔ غسل وکفن ہوا۔ غسالہ نے رپورٹ پیش کی' سلطان الانبیاءؐ نے اپنی قمیض اپنے تن سے الگ کی۔ غسالہ کے حوالے کی۔

فرمایا:

دنیا کی عورتیں بازاری کفن پہن کر جائیں لیکن یہ کوئی عام مستور نہیں' یہ وہ

ہے جسے میں اماں کہتا ہوں۔ لہٰذا میری یہ قمیص میری اماں کا کفن بن جائے۔ محمدؐ کی قمیص مخدومہ فاطمہؑ علیؑ کی اماں کا کفن بن گئی۔ قبر کھودی گئی۔ سرکار سلطان الانبیاء فرماتے ہیں:

میں اماں کو قبر میں بعد میں لٹاؤں گا پہلے اماں کی قبر میں خود لیٹوں گا۔ پہلے خود لیٹے پھر علیؑ کی اماں کو قبر کے حوالے کیا اور آپ یقین رکھیں کہ پوری کائنات میں واحد خاتون ہے فاطمہ بنت اسد جن کو قبر کے حوالے کرنے کے لئے دو سلطان بیٹے موجود ہیں۔ معمولی سلطان نہیں ایک مملکت نبوت کا سلطان ہے اور دوسرا مملکت امامت وولایت کا سلطان ہے۔ سلطان الانبیاء اور سلطان الاولیاء جس مستور کو قبر کے حوالے کرنے آئے ہیں وہ واحد مستور ہے جس کا نام ہے فاطمہ بنت اسد........... کتنی طاہرہ اور پاک ہے یہ بی بی خود پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھوں سے مٹی گرائی۔ تعویذِ قبر بند کیا۔ پھر قبر پر بیٹھ کر پنجۂ پرنور قبر کی پاکیزہ زمین پر ٹیک کر فرمایا:

اِبْنِکِ' ابْنِکِ' ابنکِ

اب یہاں اس مقام پر اپنے بیٹے کا نام لو' اپنے بیٹے کا نام لو' سرکار انبیاءؐ بیٹھے ہیں قبر کے کنارے فاطمہ بنت اسد سو رہی ہے۔ اس کو فرما رہے ہیں بیٹے کا نام لو' بیٹے کا نام لو' وہ سن رہی ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں۔.......... پوری اس دنیا میں' پورے اسلام میں' پہلی تلقین علیؑ کی اماں کی پڑھی گئی' جو پیغمبر نے پڑھی۔ اپنے بیٹے کا نام لو۔ اپنے بیٹے کا نام لو۔

لوگوں نے کہا:

حضور یہ کیا؟ تین کام آپ نے نئے کئے' اپنی قمیض کا کفن' قبر میں خود لیٹے اور تلقین پڑھی۔

حضرات گرامی قدر!

ماں کے لئے بیٹے کا کوئی لقب نہیں۔ ماں کے لئے بیٹے کو بیٹا کہنا ہی سب سے بڑا لقب ہے۔ غیر کہتے ہیں:

صدر ہے' یا وزیراعظم ہے۔ لیکن جب ماں کے سامنے آتا ہے تو وہ صدر نہیں کہتی۔ وزیراعظم نہیں کہتی۔

وہ کہتی ہے:

آؤ۔

میرے بیٹے! ماں کا بیٹے کو بیٹا کہنا ہی بہت بڑا لقب ہے۔

یہی رسولؐ فرماتے ہیں:

اماں لقب نہ سوچو' اپنے بیٹے کا نام لو۔ میرا امام علیؑ ہے۔ میرا امام علیؑ ہے۔ بیٹے کا نام لو بیٹے کا نام لو۔ اب یہاں سے باتیں سمجھ میں آگئیں کہ علیؑ کی اپنی اماں ہے اور محمدؐ گواہ علی کی اپنی اماں ہے۔ محمد مصطفےؐ گواہ ہیں۔

یاد رکھو! مسلمانو!

جب علیؑ کی اماں کا قبر میں بغیر علی کے گزارا نہیں ہوتا تو تیری میری اماں کا کیسے گزارا ہوگا؟ (نعرۂ حیدری)

سامعین محترم!

ایک بات اور یاد رکھیں! کہ پیغمبر اکرمؐ قبر کے پاس بیٹھے ہیں اور بی بی قبر کے اندر ہے۔ اماں جواب دے رہی ہے اور یہ سن رہے ہیں۔ اندر جو کچھ ہو رہا ہے' ہمیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہم نہیں سن سکتے۔ وہاں صحابہ بیٹھے ہیں۔ لیکن صرف ایک پیغمبر سن رہے ہیں۔ صحابہ خاموش بیٹھے ہیں' یہ سن رہے ہیں' یہ دیکھ رہے ہیں۔ کیوں

نہ سنتے اور دیکھتے اللہ نے بتانا چاہا:

اے مسلمان!

سوچ' تو اور نبی ایک جیسے نہیں۔

ایک چھوٹے نبی نے اس طرح کی بات کی' محمدؐ کے مقابلے میں چھوٹے تھے۔ ہمارے مقابلے میں تو بہت بڑے تھے۔ جا رہے تھے کہیں' اور ایک چیونٹی بات کر رہی تھی۔ سورۂ نمل میں ہے کہ چیونٹی تقریر کر رہی ہے:

يَاأَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ:

ترجمہ: ''اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ۔ کہیں سلیمانؑ اور اس کی فوجیں تمہیں روند نہ ڈالیں۔ چیونٹی کی یہ تقریر حضرت سلیمانؑ نے سن لی۔''

جبکہ وہ تین میل دور فضا میں تھے۔ بس فوراً اس تقریر کرنے والی چیونٹی کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جس نے حکومت کے خلاف زبان کشائی کی تھی یہاں یہ بات بھی ذہن نشین فرما لیجئے کہ ہمارے کان پاس بیٹھی ہوئی چیونٹی کی آواز نہیں سن سکتے۔ لیکن ایک نبی تین میل دور ایک چیونٹی کی پوری تقریر سن رہے تھے۔ جس کو قرآن مجید نے اپنے انداز میں نقل کیا ہے حالانکہ ہم لوگ تین میل دور تو بجائے ایک فرلانگ دور اپنے جیسے آدمی کی آواز سن اور سمجھ نہیں سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی قوتِ سماعت کا معیار اور ہے اور ہماری قوتِ سماعت کا معیار اور ہے۔ بس یہ کہنا کہ اپنے اعضاء و جوارح کی طاقت میں وہ ہم جیسے ہیں۔ یا ہم ان جیسے ہیں یہ احمقانہ بات ہے۔

معزز سامعین!

پس نبی سلیمانؑ نے گرفتاری کے لئے جس نمائندہ کو بھیجا تھا۔ وہ یقیناً نبی نہیں تھا اور اس تقریری کرنے والی چیونٹی کا لباس' یا ہیئت' وردی' دوسری چیونٹیوں سے مختلف نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ نبی تو بجائے خود نبی کا نائب بھی عام بندوں جیسا نہیں ہوا کرتا۔ پس اس نے نہ دوسری چیونٹوں سے پوچھا کہ یہ تقریر کس نے کی تھی اور اس نے بھی نہ کہا کہ میں نہیں کوئی اور تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کے نائب کا علم بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

فرماؤ! آج بھی کوئی ایسا آدمی ہے جو چیونٹی کی بات تین میل دور سے سن لے میں کہتا ہوں اس ترقی یافتہ دور میں چیونٹی ہاتھ پر رکھ کر کئی سپیکر لگا کر دیکھ لو' مگر چیونٹی کے چلنے کی آواز سنائی نہ دے گی۔ اگر کسی طریقے سے آواز سن بھی لیں۔ (جبکہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے) سمجھ نہیں سکیں گے کہ چیونٹی نے کیا کہا ہے۔تو ثابت ہو گیا کہ ہماری قوت سماعت کا معیار اور ہے اور نبی کی قوت سماعت کا معیار اور ہے۔

حضرات گرامی القدر!

جب یہ چیونٹی حضرت سلیمانؑ کے سامنے آئی تو آپؑ نے اسے اپنے ہاتھ پر اٹھا لیا اور دریافت کیا۔ اے چیونٹیو! تم بھی ایک قوم کی سردار ہے اور میں بھی سردار ہوں بتا تیری شان بلند ہے کہ میری چیونٹی نے عرض کی کہ حضورؑ اگر میں کہوں کہ آپؑ کی شان بلند ہے تو آپ کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی' لوگ یہی کہیں گے کہ حضرت سلیمانؑ نبی کی شان ایک چیونٹی سے بلند تھی۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا:

تو پھر کیا خیال ہے۔ چیونٹی نے کہا آج تو حضور میری شان بلند ہے۔

فرمایا: کیسے؟

کہانی کے قدم تخت پر اور تخت ہے ہوا میں جو زمین سے کئی درجہ بلند ہے اور اپنے وقت کا بادشاہ نبی اور اس نبی کے ہاتھ پر میرے پاؤں ہیں۔

فرمایا: یہ تو درست ہے۔

مگر میں کہتا ہوں اگر اس بات پر کوئی ناز کر سکتا ہے کہ اس کے قدم نبی کے ہاتھوں پر تو مجھے بھی ناز کرنے دو' میرے مولا حیدر کرار کے قدم عین کعبہ میں سردار انبیاء کے دوشِ مبارک پر نظر آتے ہیں۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت سلیمانؑ نے چیونٹی سے فرمایا۔ کہ تو نے یہ بیان جاری کیا تھا؟

کہنے لگی جی ہاں۔

آپؑ نے فرمایا:

میرا تخت ہوا میں تھا آپ لوگ زمین پر تھے روندے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر میں ایک نبی ہوں اور نبی ظالم نہیں ہوتا۔ بتاؤ تم نے غلط بیانی کر کے اپنی کمزور قوم کو میرے ظلم سے خوفزدہ کیوں کیا؟ اپنی قوم میں تیری یہ تقریر حکومتِ وقت کے خلاف کیا کھلی ہوئی بغاوت نہیں؟

چیونٹی نے عرض کی حضورؑ!

میری قوم بے عقل ہے۔ وہ صرف جینے اور مرنے کو ہی سمجھتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ منطقی دلائل کو نہیں سمجھ سکتی۔ یہ سب عبادتِ پروردگار میں مصروف تھیں میں نے ان کو آپ کے قافلے کی آمد سے خوفزدہ کیا ہے' تا کہ تجھے دیکھ کر کہیں تجھے خدا یا خدا کا شریک نہ سمجھ لیں۔ پس میں نے اس طریقہ کار اور طرزِ بیان سے ان کے دین کی حفاظت کی ہے' کیونکہ حضورؑ! آپ نے اور آپ کے نائب نے تو میری

بات سن لی مگر آپ کے قافلے میں باقی سب معصوم نہیں ہیں! یہ معیار نبوت ہے کیونکہ چیونٹی اور حضرت سلیمانؑ نبی کی گفتگو کو پاس بیٹھے صحابی نہیں سمجھ سکے چیونٹی کی بات کو سمجھا ہے نبی یا اس کے نائب! اور یہ نبی بھی حضرت محمد مصطفیؐ کا امتی نبی ہے اب سوچئے کہ خاتم المرتبت نبی کی نبوت کا معیار کیا ہوگا؟

اور محمد مصطفیؐ کے نائب کا معیار کتنا بلند ہوگا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ:

ہم ایک ایسی وادی سے گزرے کہ وہاں چیونٹیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا میں انہیں دیکھ کر حیران ہوگیا۔ اور کہا:

سُبْحَانَ مَنْ یُّعْلَمُ عَدَدَ هٰذَا النَّمَلَ○

"پاک ہے وہ ذات جو ان چیونٹیوں کی تعداد کو جانتی ہے۔"

جناب امیرؑ نے فرمایا:

اے ابوذرؓ! تم یوں کہو:

سُبْحَانَ مَنْ خَلَقَ هٰذَا النَّمَلَ○

"کہ پاک ہے وہ خدا جس نے ان چیونٹیوں کو پیدا کیا ہے۔"

تو ابوذرؓ نے عرض کی کہ مولا! آپؑ ان کی تعداد و شمار کو جانتے ہیں۔

فرمایا: بلکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں نر کتنے ہیں اور مادہ کتنے ہیں ان میں کسی کی کتنی عمر ہے۔ اے ابوذرؓ! خدا کا حکم ہے:

وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنَاهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ○

"اور ہم نے ہر شئے کا احصاء امام مبین میں کر دیا ہے اور وہ امام مبین میں ہوں۔"

سامعین محترم!

یہی وہ معیار ہے کہ جس جس نے اللہ کے محبوب محمد مصطفیؐ کی اتباع کی وہ اللہ کا محبوب ہوگیا۔ اور جو اللہ کا محبوب ہوگیا اس کا قول و فعل اللہ کی رضا بن جاتی ہے۔ حدیث قدسی میں اللہ فرماتا ہے:

عَبْدِیْ كُنْ لِیْ اَكُنْ لَكَ.

"اے میرے بندے تو میرا ہو جا' میں تیرا ہو جاؤں گا۔"

عَبْدِیْ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْكَ مِثْلِیْ

"اے میرے بندے! تو میری اطاعت کر میں تجھ کو اپنے جیسا بنا دوں گا۔"

اس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں چیز ہو جایا کرتی ہے اے میرے بندے! اگر تو میری اطاعت کرے گا تو تجھے یہ طاقت دوں گا کہ تو بھی کسی شئے کا مطلق ارادہ کرے گا تو وہ شئے بھی ہو جائے گی۔ گویا تیرے قول و فعل کو تقدیر بنا دوں گا۔

تقاضائے محبت' کیونکہ ہر رشتہ و قرب داعی محبت ہوتا ہے' غلامی اور آقائی کا رشتہ سب رشتوں سے قریب تر ہے' لہٰذا یہ رشتہ مضبوط ترین سبب محبت ہے کیونکہ بیٹا وہی محبوب ہوگا جو باپ کی اتباع کرے گا' بھائی وہی پیارا ہوگا جو اپنے بھائی کا وفادار ہوگا۔ پس قریبی رشتہ دار نافرمانی سے بیگانہ ہو سکتا ہے۔ اور بیگانہ غلامی کے دائرہ میں آکر اپنا ہو جایا کرتا ہے۔ دیکھئے نوحؑ کا بیٹا نافرمانی کی وجہ سے آل سے کٹ گیا۔ اور سلیمانؓ آل میں شامل کر لیا گیا۔

اَلسَّلْیمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ.

ماں باپ اولاد کے لئے ترستے ہیں۔ منتوں۔ دعاؤں کے بعد ان کی گود

آباد ہوتی ہے۔ خوش ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تمنائیں بڑھتی جاتی ہیں اور ہر تمنا کی تکمیل ایک نئی تمنا کو جنم دیتی جاتی ہے اور ترستے ہیں کہ کیا اپنی پیاری اور میٹھی زبان سے ہمیں بابا اور اماں کے لفظ سے یاد کرے گا اور جب لفظ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور آخر اس کے پیارے منہ سے لفظ اماں نکلتا ہے تو ماں جی جی کہہ کے تھکتی نہیں اور اس کی خوشی کا انداز سوائے پروردگار کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ خدا جس کی محبت ماں باپ کی محبت سے کامل تر ہے وہ بھی چاہتا ہے کہ میرا بندہ مجھے اپنی پیاری زبان سے کہے یااللہ!

اور میں اس کا جواب دوں:

لَبَّیْک یَا عَبْدِیْ

اور یہ کلمہ اس کی ذات کو اس قدر محبوب ہے کہ ملائکہ پر بھی مباحات فرماتا ہے ۔رسول خداؐ کی محبت ہی محبت خدا ہے اور امام حسینؑ کو اپنے نانا سے اتنی محبت تھی کہ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ظاہری زیارت سے محروم ہوئے تو دن رات نانا کی جدائی کی وجہ سے اداسی چھائی رہتی تھی' ایک روز خواب میں رسول خدا نے اس پریشانی کی وجہ دریافت کی۔

تو عرض کی کہ نانا! آپؐ کی زیارت سے محروم ہو گیا ہوں۔ فرمایا بیٹا حسینؑ! میں اپنے خدا سے دعا کروں گا کہ تجھے میری شکل کا بیٹا عطا کرے گا۔ اس کی زیارت میری زیارت ہو گی۔ جب امام حسینؑ اپنے نانا کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو بیٹے علی اکبرؑ کو دیکھتے۔ جب ماں زہرا سلام اللہ علیہا کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو فاطمہ صغریٰؑ کو دیکھتے۔ جب بابا کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو بھائی عباسؑ کو دیکھتے اور بھائی حسنؑ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو جناب قاسمؑ کو دیکھتے' جب

علی اکبرؑ مدینہ کی گلیوں سے گزرتے تو لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر آپ کی زیارت کر کے فخر کرتے تھے کہ ہم نے رسولؐ کی زیارت کر لی ہم نے محمد مصطفیٰؐ کی زیارت کر لی۔

عزادارو!

یہ وہ شہزادہ ہے کہ جب امام حسینؑ نے میدانِ کربلا کی طرف روانہ کیا تو اپنے نانا محمد مصطفیٰؐ کا لباس پہنایا! جب شہزادہ پوری شبیہ مصطفےٰ بن کر آیا تو اشقیاء دیکھ کر کہنے لگے۔ یہ محمد مصطفیٰؐ آ گئے روایت میں ہے کہ جب علی اکبرؑ چلے تو امام حسینؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور باآواز بلند رونا شروع کیا۔ اس سے پہلے امام بلند آواز سے نہیں روئے تھے' بس علی اکبرؑ میدان میں آئے شجاعتِ حیدری کا مظاہرہ کیا' ہر طرف سے الامان الامان کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ علی اکبر نے پے در پے بارہ حملے کئے۔

عزادارو!

مرہ بن منقذ عبدی ملعون نے کمین گاہ سے نکل کر پشت کی طرف سے شہزادے پر تلوار کا وار کیا جس سے علی اکبر کا سر شگافتہ ہو گیا۔ آپ نے گھوڑے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور آواز دی:

یَا اَبَتَاہُ عَلَیْکَ مِنِّیَ السَّلَامُ۔ بابا میرا آخری سلام قبول ہو۔

اس آواز کو سن کر امام نے فرمایا:

بیٹا تیرے بعد زندگانی دنیا پر بھی خاک۔ لہوف صفحہ ۳۷ پر ہے امام سے پہلے جناب زینبؑ علی اکبرؑ کی لاش پر پہنچ گئیں' جب مظلوم امام جوان بیٹے کی لاش پر پہنچے تو ایک مستور کو دیکھا۔ مولا نے پوچھا بی بی تو کون ہے۔

فرمایا: حسینؑ میں تیری دکھیا بہن زینبؑ ہوں۔

عزادارو!

حسینؑ کو بیٹے کی موت بھول گئی اور جناب زینبؑ سے کہا:

مائے جائے میری زندگی میں کیوں باہر آ گئی۔ علماء نے لکھا ہے کہ:

جناب زینبؑ جانتی تھی کہ اگر حسینؑ نے جوان بیٹے کی لاش کو اس حال میں دیکھا تو حسینؑ کی روح پرواز کر جائے گی۔ اس لئے بی بی زینب نے درمیان میں اپنا پردہ حائل کر دیا تا کہ حسینؑ کی توجہ میرے پردے کی طرف ہو جائے اور میرے بھائی کی جان بچ جائے۔ میں کہتا ہوں بی بی تو نے ہر ممکن کوشش کی مگر تیرا حسین نہ بچ سکا۔ اور دشمنوں نے پیاسا شہید کر دیا۔ مظلوم امام جناب زینبؑ کو خیمہ میں پہنچا کر بیٹے کی لاش پر آئے۔ بیٹے کی لاش کو گود میں لیا۔ آنسو جو چہرہ علی اکبرؑ پر گرے تو علی اکبرؑ نے آنکھیں کھول دیں۔ اور باپ کی آخری زیارت کی اور کہا: بابا دیکھو! میرے جد احمد مصطفیٰؐ اور حیدر کرار اور میری جدہ جناب زہراؑ تشریف فرماہیں اور مجھے سیراب کر رہے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں جلدی تشریف لائیں۔

عزادارو!

اکبرؑ کی لاش کو امام حسینؑ اٹھاتے تھے اور پھر رکھ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ فرات کی طرف منہ کر کے فرمایا:

عباسؑ میں بوڑھا ہوں۔ علی اکبرؑ جوان ہے آ مجھے لاش اٹھانے میں مدد دے عزادارو! خیمہ سے فضہ نکلی اور امام کی۔ مدد کی حقیقت یہ ہے کہ علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد کربلا کی جنگ ختم ہو گی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ.

دوسری مجلس

حضراتِ محترم!

میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کی ایک آیت کا تھوڑا سا حصہ پیش کیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. صلواة

اللہ رب العزت اپنے حبیب کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

" ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر عالمین کی (کے لئے) رحمت قرار دے کر..........."

یہ ہے حضرتِ سلطان الانبیاءؑ کے بارے میں حضرتِ پروردگار کا فرمان کہ آپ عالمین کے لئے رحمت ہیں۔

اب عالمین کیا ہیں؟

عالمین کی حدود کیا ہیں؟

اس کی تفسیر کی ضرورت نہیں اللہ ہے رب العالمین اور محمدؐ ہیں رحمتہ اللعالمین۔

گویا جن جن کا اللہ رب ہے' ان ان کے لئے محمدؐ رحمت ہیں۔ اب اللہ کی ربوبیت کی کوئی حد نہیں۔ تو محمد مصطفیٰؐ کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں' جس طرح اللہ کی ربوبیت کے اندر زمین و آسمان کی سب مخلوق ہے' اسی طرح محمد مصطفیٰؐ کی رحمت کے اندر بھی زمین و آسمان کی سب مخلوق ہے۔ جن جن کا اللہ رب ہے ان سب کا محمد نبی ہے۔ محمدؐ کی نبوت صرف ہم لوگوں تک محدود نہیں' وہ امتیوں کا بھی نبیؐ ہے' نبیوں کا بھی نبیؐ ہے' وہ مریدوں کا بھی نبی ہے' پیروں کا بھی نبیؐ ہے' وہ خاکیوں کا بھی نبی ہے نوریوں کا بھی نبی ہے۔ صرف انسانوں ہی کا نہیں' فرشتوں کا بھی نبی ہے' جنوں کا ہی نہیں آسمان کی نوری مخلوقات کا بھی نبی ہے۔ کروبیین' حاملین عرش' سب کا محمد مصطفیٰؐ نبی ہے اور سب کے لئے رحمت ہے۔ یہ تو ہے آیت کا ترجمہ۔

حضراتِ گرامی!

اب جیسا کہ آپ میرے اسلوب بیاں سے واقف ہیں۔ میں کسی مضمون کو کہانی کے طور پر نہیں پڑھا کرتا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ جو بھی میرے درس میں حاضر ہوں وہ ایک سبق لے کر اٹھیں۔ تاکہ خود بھی سمجھ سکیں اور ان سے کوئی سمجھنا چاہے تو اسے بھی سمجھا سکیں۔ میں صرف کتابی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ جو بات کرتا ہوں اسے عقلی طور پر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔

محمد مصطفیٰؐ ہیں عالمین کے رب........ اللہ کی نعمات میں سے نعمت وجود سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ نعمت وجود کے بعد علم سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ قرآن مجید نے علم کو تمام نعمتوں سے ممتاز فرمایا ہے' اور اگر حضرتِ امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالب نے اللہ رب العزت کی عطا کردہ کسی نعمت پر فخر کیا ہے تو وہ صرف نعمت علم ہے۔ فرمایا:

رَضِينَا قِسْمَةَ الجَبَّارِ فِينَا لَنَا عِلْمٌ وَلِلْجُهَّالِ مَالٌ

فَإِنَّ المَالَ يَفْنَى عَنْ قَرِيبٍ فَإِنَّ العِلْمَ بَاقٍ لَا يَزَالُ

ہم اس جبار (اللہ) کی تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں اہل بیت علم فرمایا: اور جہال کے لئے مال رکھا پس مال فناء ہو جانے والا ہے عنقریب اور علم باقی رہتا ہے زائل نہیں ہوتا۔

اب اللہ کی تمام نعمتوں سے نعمت علم افضل ترین ہے۔ (سوائے نعمت وجود کے) اور محمد مصطفیٰؐ کی عالمین میں کیا حیثیت ہے؟ عالمین میں نعمت علم کو تقسیم کرنے والے کس طرح ہیں؟ عالمین میں نعمتِ علم کو تقسیم کرنے والے ہیں حضرت محمد مصطفیٰ........ اب میں اس کو واضح کرتا ہوں کہ حضورؐ نعمت علم کو تقسیم کرنے والے کس طرح ہیں؟ اور جتنے نبی ہیں وہ اپنی امت میں نعمتِ علم تقسیم کرتے ہیں۔ گویا ہر نبیؐ معلم ہے اور اس کی امت اس کی شاگرد ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کے لئے نعمت ہیں کیونکہ وہ اپنے شاگردوں میں ایک نعمت تقسیم کرتا ہے۔ اب استاد جس قسم کا اور جتنا زیادہ علم تقسیم کرے گا' اس کا اپنے شاگردوں پر اتنا ہی زیادہ احسان ہوگا۔ علم بڑی نعمت ہے لہٰذا استاد بہت بڑی رحمت ہے' اس لئے کہ استاد کے وسیلے سے بچے تک علم پہنچتا ہے۔ علم کو پہنچانے کا جو وسیلہ ہے وہ اللہ کی رحمت ہے۔ محمد مصطفیٰؐ چونکہ کائنات کے لئے رحمت ہیں۔ گویا کائنات کا علم ان کے ذریعے تقسیم ہوا ہے۔ اب میں اس کو دلیل کے ساتھ عرض کروں کہ نبی اپنی امت کے لئے رحمت اپنی امت کا معلم ہونے کی وجہ سے ہے۔ انبیاء آدم سے لے کر خاتم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار متواتر مشہور ہیں........ ہمارے اسکول محدود حیثیت رکھتے ہیں۔ پرائمری' مڈل' ہائی پھر کالج اور یونیورسٹی۔ یہ ہیں ہماری حدیں۔ کسی اسکول میں پانچ سال تعلم' کسی

میں دس سال' کسی میں چودہ سال' کسی میں سولہ سال.............. یہ ہیں ہمارے نزدیک تعلیمی معیار۔

اب ہر درجے کا استاد اپنے درجے کے شاگردوں کے لئے نعمت' یعنی نعمتِ علم تقسیم کرنے کا موجب ہے اور ہر درجے کا شاگرد اس نعمت پر احسان مند ہے۔ لیکن سبھی کا نام تقریباً وہی ہیں۔ جو لڑکا سولہویں سال میں پڑھتا ہے وہ بھی سٹوڈنٹ (Student) ہے' جو پہلی کا طالب علم ہے وہ بھی سٹوڈنٹ Student ہے۔ استاد کا نام بھی نہیں بدلتا جو پہلے سال کو پڑھاتا ہے۔ اسکا نام بھی استاد (Teacher) ہے جو آخری سال کو پڑھاتا ہے اسکا نام بھی اِستاد (Teacher) ہے۔ کے نام میں کچھ فرق' نہ طالب علم کے نام میں کچھ فرق۔ یہ اول سے آخر تک طالب علم کہلائے گا' وہ اول سے آخر تک استاد کہلائے گا۔ لیکن اس استاد اور اس استاد میں فرق کتنا..........؟

ایک لڑکا جب پہلی کلاس میں داخل ہوتا ہے۔ اب پڑھتا ہے وہی سولہویں سال میں جب داخل ہو جائے اور اپنی سابق تاریخ پر نظر دھرائے تو اسے خود معلوم ہو گا کہ اس وقت میں کیا تھا جب پڑھتا تھا اور اب میں کیا ہوں جب سولہویں سال میں ہوں۔ گویا اپنی اسی زندگی اور اس زندگی میں زمین و آسمان کا فرق محسوس کرے گا۔ حالانکہ فرق ہے سولہ سال کا۔ فرق سولہ سال کا' جس طرح پہلی جماعت اور آخری جماعت کا طالب علم میں زمین و آسمان کا فرق بتایا جاتا ہے اسی طرح پہلے سال کے استاد اور سولہویں سال کے استاد کی لیاقت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے.......... کورس میں بھی زمین و آسمان کا فرق' طالب علم میں بھی زمین و آسمان کا فرق' استاد میں بھی زمین و آسمان کا فرق۔ حالانکہ اس کا نام کورس ہے' اس کا نام

طالب علم ہے' اس کا نام استاد ہے۔ کسی کلاس میں نام نہیں بدلے۔ جب سولہ سال کا فرق ہو جائے تو کہتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن جہاں پہلے سال سے آخری سال تک ایک لاکھ چوبیس ہزار کلاس بدل جائیں۔ اب سمجھیں آپ پہلی کلاس اور آخری کلاس کے استاد میں کتنا فرق ہو گا۔ اللہ نے اس عالمی علمی یونیورسٹی میں پہلا استاد رکھا ہے۔ آدمؑ کو اور آخری استاد ہے اس کا حضرت خاتمؐ۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کلاسیں بدل گئیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار درجے بدل گئے۔ استاد ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ہر استاد کی امت اس کے طالب علم وہ بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار (امتیں)' جب سولہ سال بدل جائیں' سولہ نصاب اور سولہ درجے بدل جائیں تو پہلے اور آخری درجے میں زمین و آسمان کا فرق ہے تو جب ایک لاکھ چوبیس ہزار درجے بدل جائیں تو پہلے درجے اور آخری درجے میں فرق کتنا ہو گا۔ لیکن نام نہیں بدلتا' پہلے نبی کی کلاس میں بھی امت' دوسرے نبی کی کلاس میں بھی امت' آخری نبی کی کلاس کا نام بھی امت' پہلے معظم استاد کا نام نبی' دوسرے معلم کا نام بھی نبی' آخری معلم کا نام بھی نبی' نہ استاد کا نام بدلا نہ کلاس کا نام بدلا۔ نام وہی لیکن لیاقت میں فرق' کتنا

ایک لاکھ چوبیس ہزار درجے کا فرق۔ جتنی پہلی امت اور اس امت میں فرق' جتنا پہلے نبی اور اس نبی میں فرق۔ اتنا آدم کی کتاب اور قرآن میں فرق۔ آدمؑ کی کلاس تھی انسانیت کا پہلا درجہ' جب داخل جماعت تھے تو انسانیت کی الف ب پڑھنے والے تھے اس وقت استاد تھا آدمؑ' اب جب انسانیت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی اس وقت استاد ہے محمد مصطفیٰؐ۔ پہلی جماعت کے لئے جو کورس تھا اس کا نام ہے صحیفہ آدم اور اس کتاب کا جو نام ہے وہ ہے قرآن مجید۔ جتنا محمدؐ کی نبوت اور

یہ ہیں نبوتوں کے مدارج۔ آپ اس مقام پر پہنچنے کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار نبوت کے مراتب طے کرنے کے بعد جب آپ ظاہری طور پر انسانی ترقی کا آغاز اور انجام دیکھیں گے کہ آج سے سو سال پہلے انسان کہاں تھا؟ آج سے ہزار سال پہلے انسان کہاں تھا؟ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے انسان کی حیثیت کیا تھی؟ آج سے سو سال پہلے کا انسان اگر اس زمین پر قدم رکھے تو یہ زمین اس کو عجیب و غریب محسوس ہوگی۔ ایک سو سال پہلے کا انسان اگر آ جائے' اگر ایک ہزار سال پہلے کا انسان آ جائے تو اس کو زمین نرالی محسوس ہوگی۔ وہ سمجھے گا کہ وہ کیا زمین تھی جس پر میں آباد تھا اور یہ کیا زمین ہے جس پر یہ لوگ آباد ہیں۔ حالانکہ وہ تھے ہمارے باپ دادا' ہم انہیں کی نسل میں سے ہیں۔ ہزار سال کے بعد انسان کہاں پہنچا' دیکھئے۔

انسان کی حیثیت اور حیوان کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ انسان ہر دن علم کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ حیوان علم سے نا آشنا ہے۔ پانچ ہزار سال پہلے' دس ہزار سال پہلے اس حیوان کا بزرگ کہاں رہتا تھا؟ ہزاروں سال گزرنے کے بعد ان کی اولاد نے مسکن نہیں بدلا۔ اگر ہزاروں سال پہلے وہ درختوں پر گزارا کرتے تھے۔ تو آج بھی ان کی نسل پہاڑوں پر ہے۔ اگر وہ دریاؤں میں تھے تو ہزاروں سال بعد بھی نسل دریاؤں میں ہے۔ حیوان نے کبھی اپنے دادا کی تقلید نہیں چھوڑی' زندگی کے کسی بھی شعبے میں .... اگر وہ گھاس کھاتے تھے تو یہ گھاس کھاتے ہیں۔ اگر وہ دانہ کھاتے تھے تو یہ بھی کھانا دانہ کھاتے ہیں وہ گوشت کھاتے تھے تو یہ بھی گوشت کھاتے ہیں۔ رہائش تبدیلی کی اولاد نے' نہ غذا تبدیل کی اولاد نے نہ کوئی زندگی کا دوسرا طریقہ تبدیل کیا۔ انسان صرف ایسی ذات ہے اس کائنات میں جو ہر دن

دوسرا طریقہ تبدیل کیا۔ انسان صرف ایسی ذات ہے اس کائنات میں جو ہر دن
زندگی کے نئے راستے تلاش کرتی ہے۔ اس کا بابا کوئی لباس پہنتا تھا بیٹا کوئی لباس پہن رہا ہے؟ باپ کس طرح کے گھر میں رہتا تھا' بیٹے کے پاس کونسی سواری ہے؟ باپ کس طرح کے گھر میں رہتا تھا بیٹے کے پاس کیسا گھر ہے۔ نہ باپ کی غذا کو رہنے دیا' نہ باپ کے مکان کو رہنے دیا' نہ باپ کے لباس کو رہنے دیا' نہ باپ کو رہنے دیا' ہر روز بیٹا (آنے والا بیٹا) باپ کی کمزوریوں کو دیکھ کر اپنی کمزوریاں دفع کرتا ہے اور ہر روز نئی راہیں تجویز کرتا ہے۔ ہر بیٹے کا دستور ہے۔

باپ کہاں تھا؟ باپ کا باپ کہاں تھا؟ باپ کا باپ کا باپ کہاں تھا؟ ہر بیٹے نے اپنے باپ کی کمزوری دور کرنے کی کوشش کی ۔ گویا انسانی دماغ ایسا دماغ ہے جو اصولِ زندگی میں تقلید پسند نہیں کرتا۔ جو جو باپ کی کمزوریاں تھیں ترک کر دی گئیں۔ ہم کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ جو باپ کا جوڑا تھا ہمیں وہی جوڑا پہننا ہے۔ باپ گدھے پر بیٹھتا تھا یہ کار پر بیٹھنے کی بدعت کا مرتکب ہے' لٰہذا چھوڑ دے اس کو۔ اس لئے کہ باپ کے طریقے کو بدلنا لائق اولاد کا کام نہیں ہے۔ لیکن انسانی زندگی یہ بتاتی ہے کہ جو فطرت انسانی ہے اس کے مطابق باپ میں کوئی کمزوری تھی تو بیٹے کو اس کو دور کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر باپ کچے مکان یا جھونپڑے میں رہتا تھا تو بیٹے نے پکے مکان تعمیر کر لئے۔ کوئی صاحب عقل انسان اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد غاروں میں رہتے تھے۔ پتھر کا زمانہ تھا۔ دھات کا زمانہ تھا۔ اولاد کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ زندگی کے کسی شعبے میں اولاد نے باپ کی تقلید نہیں کی۔ گویا ہر شئے میں باپ کی تقلید پسند نہیں لیکن مذہب کا معاملہ الٹ کیوں؟ ہو سکتا ہے تمہارے باپ نے علیؑ کو نہ پہچانا ہو تو پہچان لے!

لیکن جاہل بضد ہیں کہ باپ کا مذہب نہیں چھوڑنا۔

بھئی!

تم نے باپ کا لباس چھوڑ دیا۔

باپ کا مکان چھوڑ دیا۔

باپ کی غذا چھوڑ دی۔

باپ کی سواری چھوڑ دی۔

زندگی کے ہر شعبے میں باپ کی کمزوریاں ترک کر دیں۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ عقائد کے معاملے میں اگر بابا غلط رستے پر تھا تو چلو میں ہی صحیح رستے پر آجاؤں۔ (نعرۂ حیدری)

عزیزان!

ہر دن انسان کی زندگی بدلتی رہتی ہے۔ آدمؑ کے زمانے کی زندگی کیا تھی؟ اور حضرت محمدؐ کے زمانے تک زندگی کیسی بن گئی۔ اس زمانے کی ضروریات کیا تھیں! اس زمانے کی ضروریات کیا تھیں؟.......... آدم اس وقت کا استاد تھا جب انسان ضرورتِ زندگی کی پہلی منزل طے کر رہا تھا۔ اور محمدؐ اس زمانے کے استاد ہیں جب انسان ترقی کی آخری منازل تک پہنچ گیا۔ اب آدم اور محمدؐ کی نبوت میں جتنا فرق ہے۔ اتنا آدم کے صحیفے اور قرآن محمدؐ میں فرق ہے۔ اب اس مقام پر پہنچ کر میں واضح کرتا چلوں کہ اگر حکومت ایک معیار مقرر کر دے کہ جو بی۔اے پاس ہو اسکول کا پروفیسر لگے گا۔ اگر معیار ایسا ہو کہ حکومت طے کر دے کہ بی۔اے پاس پروفیسر لگ سکتا ہے یا ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اسے بی۔اے پاس ہونا چاہئے او پھر پروفیسری یا ہائی اسکول کی ماسٹری کی

درخواست دینی چاہئے۔ یعنی ڈگری پہلے ہونی چاہئے۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ پہلے اسے عہدہ دے دیا جائے اور آہستہ آہستہ تعلیم حاصل کر کے وہ ڈگری حاصل کر لے اور جب ڈگری حاصل کر لے تو عہدے سے ریٹائرڈ ہو جائے بلکہ شرط یہ ہے کہ بی۔اے پاس پہلے ہو تب یہ عہدہ ملے گا۔

اب جو کہتے ہیں' جبریلؑ' محمدؐ کے استاد ہیں ان کے لئے لمحہ فکر یہ ہے۔ آپ سب دانش ور حضرات تشریف فرما ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ جب محمدؐ نے قرآن پڑھا تک نہیں اس وقت تو ہیں سید الانبیاء اور جب ان لوگوں کے مطابق جبرائیل سے قرآن پڑھ لیا تو ریٹائرڈ ہو گئے۔ واپس بلا لئے گئے۔ آپ ہی بتائیے کہ یہ کس حکومت کا دستور ہے؟ کیا عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب حضرت پیغمبر نے قرآن نہیں پڑھا تھا تو سید الانبیاء تھے اور جب قرآن پڑھ لیا تو عہدے سے فارغ ہو گئے۔ تیس سال کی مدت میں جبرائیلؑ سے قرآن ختم کرنے کے بعد اٹھالیئے گئے۔.......... عقل و دانش کے مطابق چاہئے تو یہ تھا کہ قرآن ختم کرنے کے بعد نبوت کے عہدے پر فائز ہوتے اور ایک وقت تک کام کرتے۔ یہ سراسر خلاف عقل ہے کہ جب کچھ نہ پڑھے تھے اُمی تھے تو نبیؐ بن گئے اور جب پڑھ گئے تو فارغ ہو گئے۔ چنانچہ ماننا پڑے گا کہ حضرت پیغمبر اس وقت بھی نبی تھے جب ان کا نور عالم انوار میں تھا۔ جبرائیلؑ ان کا استاد نہیں مرہون منت ہے۔

حضرات گرامی!

اب اسی جواز سے میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جس طرح پہلی جماعت اور سولھویں جماعت کے استاد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح جو جبرائیل پہلے استاد سے علم میں ما رکھا جائے بھلا وہ ہیڈ ماسٹر کا مقابلہ کیسے کر سکتا

ہے..........؟! جو پرائمری کے استاد سے مار کھا جائے وہ یونیورسٹی کے چانسلر کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ عقل کا بین فیصلہ ہے کہ وہ ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب عالمی اسلامی خدائی یونیورسٹی کے اساتذہ ہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار' آدمؑ سے ابتداء محمدؐ پہ انتہاء۔ پہلی جماعت میں آدمیت اور آخری جماعت میں محمدیتؐ۔ آدمؑ ہیں انسانیت کے الف' ب کے استاد' اللہ نے کہا میں اسے خلیفہ بناتا ہوں۔ فرشتوں نے کہا ایسے کو خلیفہ بناتا ہے جو فسادی ہوگا۔ ہم پرہیزگار ہیں' تسبیح گزار ہیں' لائق ہیں' نیک ہیں۔ اللہ نے فرمایا خلافت کا معیار تقدس نہیں خلافت کا معیار علم ہے۔ اگر تم خلافت کے میدان میں قدم رکھتے ہو تو آدمؑ کے ساتھ بیٹھ کر پرچہ حل کر دو۔ جو پاس (Pass) ہو جائے گا اسے خلافت ملے گی۔ جب ایک ہی پرچے میں آدم اور فرشتوں کا امتحان ہوا تو فرشتوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا پروردگار! ہم یہ جواب نہیں دے سکتے۔ نہ ہم پڑھے ہوئے ہیں نہ یہ امتحان دے سکتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا اگر تم پڑھے ہوئے نہیں تو علمی ڈیوٹی کا دعویدار کیوں بنتے ہو' فوراً آدمؑ کے سامنے سجدہ کرو۔ زمین سے لے کر آسمان تک موجود سبھی فرشتے آدم کو سجدہ کرو' جن میں جبرائیلؑ بھی ہے میکائیلؑ بھی ہے..........اب جو جبرائیلؑ اس پرائمری کے استاد آدمیت کے استاد' (دین کی) الف ب کے استاد' آدمؑ کے ساتھ بیٹھ کر پرچہ نہ دے سکے وہ محمدؐ کا استاد کیسے بن سکتا ہے؟ یونیورسٹی کے آخری معلم کا استاد کیسے بن سکتا ہے؟ یونیورسٹی کے آخری معلم کا استاد کیسے بن سکتا ہے؟

سامعین محترم! حضرت امیر المومنینؑ علیؑ ابن ابی طالبؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہوئے' جبریل تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ حضرت پیغمبر فرماتے ہیں:

لما لقوم لِهٰذِهِ الْفَتٰی۔

جبریل اس جوان کی تعظیم کے لئے کیوں اٹھتے ہو' عرض کرتا ہے یہ میرا استاد ہے۔ جبریل نے عرض کیا جب عالم انوار میں ذات توحید نے مجھے زیور تخلیق سے آراستہ فرمایا:

تو مجھ سے پوچھا تو کون ہے؟ میں کون ہوں؟

میں نے جواب دیا:

تو تو ہے میں میں ہوں۔

پھر پوچھا تو کون ہے میں کون ہوں؟؟

میں نے جواب دیا:

تو تو ہے میں میں۔ پھر یہی سوال کیا گیا' صحیح بتاؤ تم کون ہو میں کون ہوں؟؟

جبریل کہتا ہے:

میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ اچانک دیکھا کہ جانب عرش ایک نور نے طلوع کیا اور مجھ سے کہا جبریلؑ غلط جواب دے رہے ہو۔ یہ مت کہو:

تو تو ہے میں میں ہوں بلکہ کہو:

"تو رب جلیل ہے' میں عبد ذلیل ہوں"۔

میرا نام جبریلؑ ہے' تیرا نام جلیل ہے۔

جب میں نے جواب دیا: نور اللہ نے مجھے سید الملائکہ قرار دے دیا۔ تو جس کے تعلیم کی وجہ سے میں عالم ملکوت کا استاد ہوں۔ اس استاد کی تعظیم بھلا کیسے نہ کروں؟ جب یہ مسجد میں داخل ہوئے تو میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی ہیں جس نے مجھے عالم انوار میں سبق پڑھایا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا:

کب کی بات ہے؟

عرض کرتا ہے:

اس کب کا اندازہ مجھے نہیں! البتہ جانب عرش سے ایک ستارہ طلوع ہوتا تھا ستر ہزار سال بعد! اور میں اپنی زندگی میں ستر ہزار دفعہ اسے دیکھ چکا ہوں.........

یہ تھا علیؑ کا جبریل کو پڑھانا اور جب علیؑ سے پوچھا گیا:

هَلْ اَنْتَ مُحَمَّد .

کیا تم محمدؐ ہو؟

علیؑ نے کہا:

نہیں اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِيْدِ مُحَمَّد میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔ جب محمدؐ کا غلام جبریل کا استاد ہے تو جبریل سلطان کا استاد کیسے ہو سکتا ہے؟

(نعرۂ حیدری)

حاضرین گرامی!

ایک بات زیر غور ہے کہ یہ جو اساتذہ کی لسٹ ہے پہلے استاد سے آخری استاد تک تو یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ آخری استاد پہلے ہر استاد کی کرسی سنبھال سکتا ہے' اس کی کلاس کو سمجھا سکتا ہے' پڑھا سکتا ہے لیکن پہلی کا استاد آخری کلاس کے استاد کی کرسی ہرگز ہرگز نہیں سنبھال سکتا۔ جو استاد آخری کورس پڑھا سکتا ہے وہ ہر ایک کلاس کو پڑھا سکتا ہے' لیکن پہلے کورس کو پڑھانے والا آخری کورس کو نہیں پڑھا سکتا۔

اب چپڑاسی کو بھی مسئلہ درپیش آیا تو علیؑ سے پوچھا اور صدر مملکت کو مسئلہ درپیش آیا تو اس نے بھی علیؑ سے پوچھا کسی صحابی نے علیؑ سے پوچھنا توہین نہیں سمجھا اور علیؑ وہ داتا ہے کہ جس نے علم کی تقسیم میں کبھی بخل نہیں کیا۔ دوست نے پوچھا تو

بھی بتا دیا' دشمن نے پوچھا تو بھی بتا دیا۔ ورنہ ہم جیسا جذباتی بندہ ہوتا تو شاید بخل سے کام لیتا کہ یہ دشمن ہے اس کو کوئی مسئلہ کیونکر سمجھاؤں.............. چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے اللہ سے عرض کیا:

اے پروردگار!

فرعون سے میں کیسے توقع رکھوں کہ تجھے خدا مان لے۔ تجھے کیوں خدا مانے نہ اس کے رزق میں کمی نہ اس کے اقتدار میں کمی' نہ اس کی زندگی کی راحت میں کمی۔ سب کچھ اس کے پاس موجود ہے۔ اگر اس سے اسلام منوانا ہے تو چند دن اس سے اپنی نعمات چھین لے۔ اس کے رزق میں کمی کر دے۔ جب رزق کی تنگی محسوس کرے گا تو گھبرا کر تجھے خدا مان لے گا۔ اللہ نے بذریعہ وحی ارشاد فرمایا:

موسیٰؑ جو تم سوچتے ہو تمہاری سوچ۔

جو میں فیصلہ کرتا ہوں وہ توحید کی سوچ ہے۔

اس (فرعون نے) فریضہ معبودیت چھوڑ دیا۔

تو کیا میں فریضہ عبودیت چھوڑ دوں؟

اس نے بندگی چھوڑ دی۔

تو کیا میں خدائی چھوڑ دوں؟

وہ بندگی چھوڑے تو چھوڑے لیکن میں خدائی نہیں چھوڑ سکتا۔

(نعرۂ حیدری)

عزیزانِ گرامی!

شاید مجھ جیسا بندہ اگر علیؑ سے کہتا کہ یا علیؑ ان لوگوں کو مسائل نہ بتایا کرو لاج ان کی رہ جاتی ہے کہ ہم نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے اور لوگوں کے سامنے سر بلند

ہو جاتے ہیں............ اگر کسی مسئلے میں آپ نہ بتائیں گے تو وہ شرمندہ ہوں گے ہو سکتا ہے کہ کرسی سے الگ ہو جائیں؟ تو سرکار بھی یہی جواب دے دیں۔ انہوں نے شرافت چھوڑ دی ہے تو کیا میں امامت چھوڑ دوں؟

بہرحال عامی سے لے کر صحابی تک' آدنی سے لے کر اعلیٰ تک کسی شخص نے علیؑ سے سوال کرنے میں بخل نہیں کیا اور علیؑ نے علم کا داتا ہونے کے سبب ان کی مشکل کشائی میں بخل نہیں کیا۔ ہر شخص نے پوچھا اور علیؑ نے اس کی مشکل کشائی کی۔ لیکن سنی کی کتاب میں نہ شیعہ کی کتاب میں' بخاری میں' نہ کافی میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ کبھی علیؑ نے بھی کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا ہے............

دوسروں نے ہی کہا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ ان سب کا علیؑ سے پوچھنا اور علیؑ کا کسی سے نہ پوچھنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ محمد مصطفےٰ کے بعد قرآن کا حقیقی عالم علی مشکل کشا ہے۔ (نعرۂ حیدری)

سامعین گرامی!

جب قرآن کا عالم علیؑ ہے اور جو آخری کورس تک پڑھا سکتا ہے وہ پہلے سارے کورس بھی آسانی سے پڑھا سکتا ہے۔ جبکہ پہلے کورسوں کو پڑھانے والا آخری کورس کو ہرگز نہیں پڑھا سکتا'

ہم ماننے والے ہیں ہم ضدی نہیں۔ محمد عربی کو اللہ نے واپس بلا لیا۔ یہ ہیں عالمی اسلامی یونیورسٹی کے معلم اعظم.......

يُعَلِّمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

یہ معلم کتاب ہیں' معلم حکمت ہیں۔

اب اگر اللہ رب العزت انہیں واپس بلانا چاہتا ہے تو دو صورتیں

ہیں............ کیونکہ معمولی سے معمولی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کو اگر حکومت واپس بلانا چاہتی ہے تو دو ہی صورتیں ہیں کہ حکومت یا اس ہائی سکول کو بند کر کے اس کو مڈل یا پرائمری تک کا درجہ دے دے یا پھر اس ہیڈ ماسٹر کا متبادل ہیڈ ماسٹر دے دے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ماسٹر ہو نہ اسکول بند ہو بلکہ حکومت کہہ دے کہ لڑکے خود بخود پڑھ لیں۔ جب لڑکے ہوں گے تو استاد بھی ہو گا۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ عالمی اسلامی یونیورسٹی کے چانسلر اور آدمؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک تمام نبیوں کے سلطان محمدؐ کو اللہ جب واپس بلا رہا ہے تو یا یہ سلسلہ ہی ختم کر دے یا پھر ان کا متبادل مدرس قرآن دے اور اگر متبادل مدرس نہیں دیتا تو یونیورسٹی کھلی کیونکر رہ سکتی ہے' داخلہ کیونکر جاری رہ سکتا ہے۔؟ جب تک کتاب باقی ہے فرمانِ خدا کے مطابق کتاب والا بھی آتا رہے گا کتاب کیوں موجود ہے؟ اور وہ مدرس کتاب ہو گا کون؟ یقیناً وہ اس کا نامزد کردہ ہو گا جس نے کتاب بھیجی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کورس بنائے خدا اور معلم تجویز کریں ہم جو ہم تجویز کریں گے وہ ہم جیسا ہو گا۔ محمدؐ جیسا نہیں ہو گا۔ اللہ اس کو بھیجے گا جو محمدؐ جیسا ہو گا ہم جیسا نہیں ہو گا۔

حضرات گرامی!

اس لئے کہ اس سارے عالم کا دارومدار قرآن پر موقوف ہے اور قرآن کا جو بھی معلم ہو گا آدمؑ سے عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کو پڑھانے کے قابل ہو گا۔ امتیوں کو پڑھانا تو کجا انبیاءؑ کو پڑھا سکے۔ اسی لئے پیغمبرؐ نے فرمایا:

''یا علیؑ! قیامت کے دن تمام انبیاء میرے پرچم کا سایہ تلاش کریں گے اور اللہ نے تمہیں یہ شرف بخشا ہے کہ میرے اس پرچم کو اٹھانے

والے تم ہو گے۔"

جس کے اٹھائے ہوئے پرچم کے نیچے تمام انبیاءؑ چین پائیں گے اگر وہ تمام انبیاء سے افضل نہیں ہے تو پھر پرچم اس کے ہاتھ میں کیونکر ہے؟

اور یہ بھی یاد رہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تمام امت، تمام صحابہ تمام شاگردوں میں سے صرف اور صرف علیؑ وہ ہستی ہے کہ جس نے قرآن ہی کے عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ فرماتے ہیں:

اگر مسند علم بچھا دی جائے اور مجھے اس پر بیٹھنے کا موقع دستیاب ہو جائے تو میں علیؑ ببانگ دھل یہ اعلان کرتا ہوں کہ بے شک تورایت والے توریت اٹھا کر آئیں انجیل والے انجیل اٹھا کر لے آئیں، زبور والے زبور لے کر آئیں، اور قرآن والے قرآن لے کر آئیں تو میں ہر اہل کتاب کو ویسے جواب دوں گا جو اس کی کتاب کہہ رہی ہو گی۔ اگر تورایت کو پڑھوں گا تو تورایت کے گو پارہ پارہ سے، تورایت کے رکوع رکوع سے، تورایت کی سطر سطر سے، تورایت کے لفظ لفظ سے، تورایت کے حرف حرف سے آواز آئے گی کہ موسیٰ" اس طرح نہیں پڑھ سکتا تھا جس طرح علیؑ پڑھ رہا ہے۔ اگر انجیل پڑھوں گا تو چرخ چہارم پر عیسیٰؑ داد دیں گے۔ اگر زبور پڑھوں گا تو لحن داؤدی نثار ہو گا۔ اگر قرآن پڑھوں گا تو جناب محمدؐ کی فخریہ آواز آئے گی قرآن میں جانتا ہوں یا میرا بھائی علیؑ جانتا ہے۔

عَلِیٌّ مَعَ الْقُرانِ وَقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ

علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔

سامعین محترم!

لہٰذا محمد مصطفیٰؐ کے بعد یا تو ان کی کرسی خالی رہنی چاہئے اور اگر خالی نہیں تو

اس کرسی پر وہ بیٹھے جو قرآن کا کامل معلم ہو۔ اور صرف یہ امت ہی نہیں انبیاء بھی اگر کچھ سیکھنے کے لئے آئیں تو اس معلم کی تعلیم پر فخر محسوس کریں۔

اسی لئے، ہم نبوت کے لئے الیکشن کے قائل ہیں نہ امامت کے لئے ....جس طرح نبوت الیکشن سے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح نبوت کی قائم مقامی اور نیابت بھی الیکشن پر منحصر نہیں ہو سکتی............ پاکستان کو قائم ہوئے چالیس سال گزر گئے ہم تو آج تک الیکشن کرتے کرتے محمد علی جناح کا قائم مقام پیدا نہیں کر سکے............الیکشن بھی ہر پانچویں ساتویں سال ہوتے رہتے ہیں لیکن ابھی تک جناح کا قائم مقام ہم سے نہ چنا جا سکا۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق یحییٰ نے کتنے منصفانہ الیکشن کرائے تھے، اور تیرہ کروڑ عوام یعنی چھ کروڑ مغربی، پاکستان اور سات کروڑ مشرقی پاکستان میں اس الیکشن میں حصہ لینے والے تھے اور سبھی جاہل ہی نہیں ان میں بیرسٹر بھی تھے، وکلاء بھی تھے، علماء بھی تھے اور اعلیٰ تعلم کے حامل نئی روشنی کے تعلیم یافتہ تیرہ کروڑ عوام سر جوڑ کر بیٹھے تاکہ جناح کا قائم مقام چن لیں۔ کہتے ہیں ووٹوں کے لحاظ سے مجیب الرحمٰن نے سب سے زیادہ ووٹ لئے اور کامیاب ہوا، نام بھی اچھا ہے مجیب الرحمٰن، لیکن کہتے ہیں ہم نے قائم مقام چنا تھا جناح کا لیکن وہ ثابت ہوا اندرا کا............ جب تیرہ کروڑ، تعلیم یافتہ، نئی روشنی کے حامل لوگ جناح کا قائم مقام نہیں چن سکتے تو صرف اور صرف ۱۳ (تیرہ) افراد محمد مصطفیٰؐ کا قائم مقام کیسے چن سکتے ہیں۔ (نعرۂ حیدری)

سامعین!

شیعہ کا مذہب ضد نہیں انصاف ہے۔ اگر الیکشن ہو بھی تو محمد مصطفیٰؐ کی حیثیت دیکھ لیں کہ کیا حیثیت ہے، جتنے علاقے کا ممبر چنا جاتا ہے وہ سارا علاقہ

الیکشن میں حصہ دار ہونا چاہئے۔ اگر ایک شہر کا ہے تو شہر والے شریک ہوں۔ ایک ضلع کا ہے تو ضلع والے شریک ہوں' صوبے کا ہے تو صوبے والے شریک ہوں' ملک کا ہے تو ملک والے شریک ہوں.......... اب دیکھ لیں محمد مصطفیٰؐ کی کیا حیثیت ہے؟ صرف مدینے کے نبیؐ ہی تو مدینے والے چن لیں' صرف مکے کے نبی ہیں تو مکے والے چن لیں' صرف عرب کے نبیؐ ہیں تو عرب والے چن لیں' صرف زمین کے نبی ہیں تو زمین والے چن لیں۔ لیکن اگر فرمان خدا کے مطابق محمدؐ عالمین کے لئے رحمت ہیں تو عالمین کی رحمت کا قائم مقام صرف مدینے کے چننے سے نہیں بنے گا۔ پورے عالمین چنیں تو عالمین کی رحمت کا قائم مقام میسر آئے گا۔ لیکن یہ عالمین کی رحمت ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ۔

اور جب عالمین کی رحمت کے قائم مقام کا الیکشن ہو اور چنیں صرف ایک شہر کے نمائندے تو وہ عالمین کی رحمت کا قائم مقام نہیں ہوگا' عالمینؐ کا قائم مقام صرف وہی ہوگا جسے عالمین کے نمائندے چنیں.......... اور پھر عالمین کا قائم مقام تو وہ ہو کہ جس کے سامنے زمین جھکے' جس کے سامنے آسمان جھکیں' جس کے سامنے درند' پرند' چرند' جھکیں۔ جس کے سامنے ستارے جھکیں جس کے سامنے سورج جھکے' جس کے سامنے چاند جھکے' جس کے سامنے جبریلؑ جھکے۔ گویا آدمؑ سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سبھی انبیاء جس کو اپنا پیشوا تسلیم کرلیں تو سمجھ لو کہ وہ محمدؐ کا جانشین ہے۔ اور پروردگار نے فرمایا کہ ہم نے کعبہ کو عالمین کے لئے مرکز ہدایت قرار دیا۔ اب کعبہ کا کمرہ تو مرکز ہدایت نہیں' بلکہ اس کمرے میں تشریف لانے والا اللہ کا مقرر کردہ عالمین کا ھادی ہے.......... ہمارا مذہب ضد کا مذہب نہیں۔ ہم تو

ہمیشہ اس بات کی دعوت عام دیتے ہیں' کہ محمدؐ کے بعد علیؑ سے بہتر کوئی شخص ہے تو لاؤ..........؟!؟

علم میں بہتر ہو'

عمل میں بہتر ہو'

شجاعت میں بہتر ہو'

سخاوت میں بہتر ہو'

جس میں پیغمبر کی تمام صفات نظر آئیں اور پیغمبر خود بھی تسلیم کریں یہ نہیں کہ وہ کہے کہ میں ہوں اور پیغمبر تصدیق نہ کریں۔

حضرات محترم!

نواب آف کالا باغ (جو ایک زمانے میں ہمارا گورنر تھا) کا قریبی عزیز' ملک شیر محمد (نواب کالا باغ کے بچوں کا ماموں) جو شیعہ قوم سے بہت ناراض تھا اور مجھے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا تھا۔ جب میں نے مودودی کے جواب میں کتاب امامت وملوکیت لکھی تو اس نے مودودی کا مخالف ہونے کی وجہ سے نہ کہ مجھ سے محبت کی وجہ سے یہ کتاب پڑھ لی۔ دلچسپی سے کتاب پڑھنے کے فوراً بعد اس نے مجھے دعوت دی تو وہ مجلس سے ہٹ کر اکیلے میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ شیعہ مذہب کیا ہے؟ میں نے کہا شیعہ مذہب ایک معتدل مذہب اور عقل کے راستے پر چلنے والا مذہب ہے۔ شیعہ مذہب عقل سے الگ نہیں' جو عقلی فیصلہ ہے وہ شیعہ مذہب ہے۔ اور ہم اس فیصلے کو مانتے ہیں جو دو اور دو چار کی طرح عقلی فیصلہ ہو۔ ملک صاحب نے کہا: اس کی مزید وضاحت.......... میں نے عرض کیا فرق تو یہ ہے کہ آپ محمد مصطفیٰؐ کے بعد ایک اور آدمی کو سربراہ مملکت سمجھتے ہیں؟ اور شیعہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد علیؑ

کو سربراہ نبوت سمجھتے ہیں۔ یا سربراہ نبوت سمجھتے ہیں؟ آپ کہتے ہیں محمد مصطفیٰؐ کی دستار کا وارث وہ ہے اور ہم کہتے ہیں کہ:

وارثِ دستار یہ ہے۔

جھگڑا تو صرف یہی ہے ورنہ

قرآن ایک۔

نبی ایک۔

اللہ ایک۔

فرق صرف یہی ہے کہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد ان کا جانشین کون ہے؟

آپ یہی فیصلہ کریں کہ مذہب یقین کا نام ہے یا شک کا؟ اس نے کہا کہ مذہب یقین کا نام ہے۔........ میں نے کہا:

"جس کے سر پر آپ دستار رکھتے ہیں آپ کو یقین نہیں اور جس کی جانشینی کے ہم قائل ہیں ہمیں یقین ہے۔ یقین وہ ہوتا ہے کہ جس پر قسم کھائی جا سکے۔ آپ قسم نہیں کھا سکتے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا وارث وہی تھا جس کو آپ مانتے ہیں اور شیعہ کا بچہ بچہ' عورت ہو یا مرد' جوان ہو یا ضعیف عالم ہو یا جاہل' متقی پرہیز گار ہو یا گنہگار عجمی ہو یا عرب' کسی ملک کا رہنے والا ہو گھر میں بیٹھ کر' کربلا میں جا کر' مشہد میں کھڑے ہو کر' کعبے کی چھت پر پہنچ کر قرآن کو سر پر رکھ کر اللہ کو گواہ بنا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے اللہ تیری عظمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ محمدؐ کا وصی علیؑ ہے۔

(نعرۂ حیدری)

ہم کعبے کی چھت پر چڑھ کر کھڑے ہو کر قرآن سر پر رکھ کر یہ قسم کھا سکتے ہیں' اور آپ کعبہ کی چھت پر تو کجا عام زمین پر بیٹھ کر قرآن سامنے رکھ کر یہ قسم نہیں

کھا سکتے۔

ملک صاحب کہنے لگے کہ قسم تو ہم بھی کھا سکتے ہیں۔ (بڑے ذہین آدمی ہیں' وہ ابھی تک زندہ ہیں) میں نے کہا ملک صاحب سوچ کر بات کریں آپ قسم کیسے کھا سکتے ہیں؟ قسم یک طرفہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ فائدہ مند ہے۔ قسم دو طرفہ ہونی چاہئے یعنی جس کے متعلق میں قسم کھاؤں وہ بھی اپنے متعلق قسم کھا سکے۔ اگر سارا شہر تھانے میں ایک شخص کی ذمہ داری دے دے اور قرآن سر پر رکھ کر کہے کہ یہ چور نہیں لیکن وہ شخص تھانے والوں کے سامنے خود اقرار کر لے کہ میں چور ہوں تو سارے لوگوں کی قسمیں کہاں جائیں گی؟ لہٰذا قسم دو طرفہ ہی ہونی چاہئے کہ یہ قسم کھائیں کہ وہ چور نہیں اور وہ بھی قسم کھائے کہ میں چور نہیں۔ ہم شیعوں کی قسمیں دو طرفہ ہیں' ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے' اللہ کا کوئی شریک نہیں' نہ محمدؐ شریک' نہ علیؑ شریک' نہ آدمؑ سے لے کر موسیٰ علیہ السلام تک کوئی نبی شریک' نہ کوئی فرشتہ شریک۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم محمدؐ و آل محمد کو اللہ کا شریک مانتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اللہ لاشریک ہے۔ ہم کہتے ہیں اے اللہ نہ تیرا نبی تیرا شریک' نہ تیرا اول تیرا شریک' تیرا کوئی شریک نہیں قسم کھا کر کہتے ہیں تیرا کوئی شریک نہیں۔ اللہ بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ میرا کوئی شریک نہیں۔ تو ہماری قسم تو دو طرفہ ہو گئی۔ اسی طرح اگر آپ کو بھی یقین کامل ہے تو آپ قسم کھا کر کہیں کہ وہ وارث رسول تھا اور وہ بھی قسم کھا کر کہے کہ میں وارث رسولؐ ہوں۔ لیکن آپ ہزار کوشش کریں۔ آپ قسمیں کھاتے ہیں چودہ سو سال کے بعد لیکن وہ کبھی قسم نہیں کھائیں گے۔ بلکہ وہ تو تاریخ الخلفاء علامہ جلال الدین سیوطی کے مطابق آخری عمر تک عبدالرحمٰن بن عوف کو بلا کر کہتے تھے کہ عبدالرحمٰن میں یہ افسوس لے کر جا رہا ہوں کہ

کاش میں محمد عربی سے پوچھ لیتا کہ تمہاری دستار کا وارث کون ہے؟......... تاریخ الخلفاء شیعہ کتاب نہیں ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں تحریر فرمایا ہے کہ انہوں نے کہا کہ عبدالرحمٰن یہ افسوس ہے کہ میں رسول سے پوچھ نہ سکا کہ آپ کا وارث کون ہے؟ جو خود شک میں ہے وہ کیسے قسم کھا سکتا ہے اور جس شخص نے پہلے دن اس کے ہاتھ پر بیعت کی وہ کیسے قسم کھا سکتا ہے۔ تو آج تیرہ سو سال کے بعد آپ کیسے قسم کھا سکتے ہیں؟ شیعہ واحد مذہب ہے جس کے جوان کے سر پر قرآن رکھو' نادان کے سر پر قرآن رکھو' عالم جاہل کے سر پر قرآن رکھو' عورت مرد کے سر پر قرآن رکھو۔ ہر مقام پر' ہر میدان میں قسم کھانے کے لئے تیار ہیں' کہ اے محمد مصطفیٰؐ! ہم تیرے پروردگار اور اس کے فرشتوں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ علیؑ تیرے بعد تیرے دین کا صحیح وارث ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ علیؑ وارث اسی طرح علیؑ خود بھی جب پہلے دن (بعد رحلتِ رسول) مسجد میں تشریف لے گئے تو تین سیڑھیاں تھیں۔ علیؑ نے (پہلی سیڑھی پر قدم رکھا) لوگ حیرت میں آ گئے' دوسری سیڑھی پر قدم رکھا لوگ حیرت میں آ گئے۔ تیسری سیڑھی پر قدم رکھا لوگ حیرت میں آ گئے اور وہاں جا کر بیٹھ گئے جہاں رسول اللہ بیٹھا کرتے تھے۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اے لوگو! تعجب کیوں کر رہے ہو؟

لَقَدْ وَضعتُ قَدَمَ هَاتَيْنِ علی منقبی رسول الله فیما .

"میرے یہ قدم معمولی نہیں ہیں جو قدم محمدؐ کے دوش پر آ سکتے ہیں لکڑی کی کیا بات ہے؟" (نعرۂ حیدری)

اور اس سے پہلے خود میرے سرکار نے فرمایا:

اَلآن رَجَعَ الْحَقُّ عَلٰی مَحَلِه

"قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میں علی کی جان ہے آج حق اپنے مقام پر پلٹ کر آ گیا ہے۔" ہم بھی کہتے ہیں علیؑ حق ہے اور علیؑ خود بھی فرماتے ہیں میں حق ہوں' اور مرتے دم تک علیؑ اپنے اس نظریے سے کسی وقت بھی منحرف نہیں ہوئے۔ پہلے دن آئے تو فرمایا:

حق اپنے مقام پر پہنچ گیا۔ اور جب ابن ملجم کی تلوار سر پر لگی اور جانے لگے تو فرمایا:

فُزْتُ بِرَبِّ الكَعْبَه.

"کعبہ کے پروردگار کی قسم علیؑ اپنی زندگی کامیابی سے نبھا کر جا رہا ہے۔"

سامعین!

ہمارا مذہب ایک واضح مذہب ہے' ہم کسی کے دشمن نہیں ہیں۔ ہمارا کسی سے بے جا تعصب نہیں ہے۔ ہم صحابہ پیغمبر کے منکر نہیں ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ علیؑ کے برابر کوئی نہیں ہے۔ علیؑ مسند رسول کا واحد وارث ہے' رسول ہے عالمین کے لئے رحمت اس کی مسند پر وہ بیٹھے جو عالمین کے لئے رحمت کی قائم مقامی نبھا سکنے کا اہل ہو۔ اب ہر ایک کی اپنی مرضی ہم کو کسی سے جھگڑے کا کیا فائدہ ؟ اور ہم لوگ حسینؑ کو بھی اس لئے نہیں مانتے کہ ہماری ان سے کوئی ذاتی وابستگی ہے بلکہ اس لئے محبت کرتے ہیں کہ محمدؐ کو ان سے محبت تھی' اس لئے محبت کرتے ہیں کہ محمدؐ کی محبت تھی۔ ہمارا دین ہے دین محمدؐ......... ہمارا مذہب جذباتی مذہب نہیں ہے۔ ہم جذبات کو کچل سکتے ہیں محمد مصطفیٰؐ کے فرمان کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ علیؑ سے

محبت رکھتے ہیں اس لئے کہ محمدؐ کو علیؑ سے محبت تھی' زہراؑ کے عقیدت مند ہیں تو اس لئے کہ زہراؑ سے محمدؐ کو محبت تھی' حسینؑ کا ذکر کرتے ہیں تو اس لئے کہ حسینؑ کا ذکر محمدؐ خود کرتے تھے کیونکہ محمدؐ کو ان سے محبت تھی۔

عزیزو!

دین پہنچایا پیغمبرؐ نے لیکن جب یزیدیت کے چنگل میں آیا تو بچایا حسینؑ نے.......... دین پر ہونا آسان ہے دین کے لئے کچھ دینا مشکل ہے۔ کسی نے دین کو دیا؟ کچھ نہیں' حسینؑ نے دین سے بچایا کچھ نہیں۔ کسی شے کو پیارا نہیں کیا' یہ حسینؑ کا کام تھا' ہم حسینؑ کے عقیدت مند کسی اور رشتے کی بنا پر نہیں۔ محمدؐ کے رشتے کی بنیاد پر ہیں۔ حسینؑ نے وہ کام کیا جس سے محمد مصطفیٰؐ کی روح راضی ہے۔ اللہ راضی تمام انبیاء راضی۔ اور قیامت تک دین کی بقا ہے حسینؑ کی ممنون احسان۔ حسینؑ نے بچایا دین کو اور زینبؑ نے بچایا حسینؑ کو.......... میرے تصور سے باہر ہے کہ اس بی بی نے کس قدر خدمات انجام دیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ زینبؑ خاتون کے دین پر کتنے احسانات ہیں۔ کربلا میں حسینؑ' علی و ابو طالبؑ بن کر آئے تو زینبؑ' زہراؑ اور خدیجہؑ بن کر آئی۔ یاد رکھیں کہ خدیجہ نے سب کچھ دیا لیکن چادر نہیں دی تھی۔ زینبؑ نے زیور بھی دے دیئے اور چادر بھی دے دی۔ اپنے بھائی بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے مگر واپس نہ پلٹے۔ ادھر سے چند بدمعاش اٹھے۔

کسی کے ہاتھ میں نیزہ۔
کسی کے ہاتھ میں گرز۔
کسی کے ہاتھ میں تلوار۔
کسی کے ہاتھ میں آگ کے شعلے۔

لوٹو تبرکات علیؑ و بتولؑ کو
قیدی بنا کے لے چلو آلِ رسولؐ کو

اس قسم کی صدا گونجی..........

کم سن بچے بیبیوں کے اردگرد کسی کے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ۔
کسی کے ہاتھ میں ماں کی چادر۔
کسی کا ہاتھ ماں کا برقع۔

ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ رہے تھے:

اماں لوٹنے والے بھی آ گئے اور ہمارے سر پر ہے بھی کوئی نہیں۔ ہمیں بچائے گا کون؟ بیبیاں فرماتی تھیں:

"تمہارا اللہ محافظ"

مومنو!

یاد رکھئے لوٹ کا نام لینا آسان ہے لٹنا مشکل' لوٹ کی خبر ان کو ہوتی ہے جو خود لٹ جاتے ہیں۔ اب یہ حقیقت کون بتائے کہ زہراؑ کی بیٹی کو کس نے لوٹا' کیونکر لوٹا' کیسے لوٹا???

یہ صرف ان کو پتہ ہے۔..........ذاکرین کرام سے آپ مدت سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی پڑھتے ہیں ذاکرین کہ ایک خیمہ جلتا تھا' بیبیاں دوسرے خیمے میں' دوسرا جلتا تھا بیبیاں تیسرے خیمے میں' خیمے جلتے گئے' بیبیاں خیام بدلتی گئیں۔ لیکن میں عرض کیا کرتا ہوں کہ خیمے تو وہ بدلا کرتا ہے جس کو آگ ایک طرف سے [illegible] کی بہن تھی۔ خدا جانے اس عفت مآب نے اس مخدرۂ کبریٰ نے اس آگ سے

حسینی امانات کو نکالا کیسے؟

اپنی پشت پہ اٹھا کر سجاد کو باہر لے آئی' پھر سوچا کہ کوئی اور پردہ دار رہ نہ گئی ہو۔ جب پلٹ کر آئیں تو اردگرد سے خیمے جل چکے تھے۔ درمیانی خیموں میں قدم رکھتے ہی ایک بی بی خاک پر پڑی ہوئی نظر آئی تو مخدومہ مریم کبریٰ نیچے بیٹھ کر کندھا ہلا کر کہتی ہیں بیٹی جاگو! آگ ہر طرف سے گھیر چکی ہے۔ تو گریہ میں رندھی ہوئی آواز آئی:

پھوپھی اماں مجھے جل جانا منظور ہے میں اس کے بعد زندگی پسند نہیں کرتی۔

بی بی نے فرمایا:

کیوں؟ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟

غم میں ڈوبی ہوئی آواز آئی:

"پھوپھی اماں تمہارے مظلوم بھائی کی بڑی شہزادی فاطمہؑ ہوں۔

فرمایا:

جل کر کیوں مرنا چاہتی ہو؟

جواب دیا:

اس لئے (یہ لفظ میرے اپنے ہیں) کہ بابا کے بے غیرت قاتل نے میرے سر سے چادر چھین لی ہے۔ اب بے غیرتوں کے ہجوم میں ایک غیرت مند باپ کی بیٹی کیسے نکلے۔ اگر کوئی چادر ہے تو میرا سر ڈھانپ دو۔

ولعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وما علینا الا البلاغ المبین

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیمo

اَلَمْ یَجِدکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی

سب سے پہلے میں دعا گو ہوں کہ ہمارے کچھ نوجوان عزیز سفر حج و زیارت پر جا رہے ہیں۔ خداوند کریم ان کے سفر کو بے خطر کر کے اور ان کو اعمال صالحہ کے بجا لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ بلکہ جتنے لوگ بھی اس نیک سفر پر روانہ ہونے والے ہیں' پروردگار ان سب کے سفروں کو بلاخطر فرمائے (الٰہی آمین)

..............حضرت آیت اللہ خمینی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے اللہ افواج اسلام کو فتح مبین عطا فرمائے۔ (الٰہی آمین)

حضرت قائم آلِ محمدؑ کا ظہور جلد ہو' تاکہ ہم وہ دن قریب دیکھیں جب زہراؑ کی اولاد کی شاہی ہو اور عدل کا بول بالا ہو۔ (صلوٰۃ)

حضرات محترم!

میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کا ایک ارشاد گرامی پیش کیا ہے۔ سورۃ والضحیٰ میں اللہ نے قسمیں کھا کر حضرت پیغمبرؐ کو ایک یاد دہانی کرائی ہے

مجھے والضحیٰ کی قسم' مجھے رات کی تاریکی کی قسم'

اے محمدؐ!

میں نے تجھے چھوڑ نہیں دیا اور نہ میں تجھ سے ناراض ہوں اگر کافر بکواس کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ کافروں کا مومنوں کے خلاف ہمیشہ یہی حربہ ہوتا ہے کہ جب مومن کسی تکلیف میں مبتلا ہوں تو منکر کہا کرتے ہیں کہ جب تمہارا مشکل کشا صحیح ہے تو پھر تم مشکل میں مبتلا کیوں ہو؟ مسلمانوں پر جب بھی تکلیف آیا کرتی تھی تو کفار ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تمہارا خدا دیکھ رہا ہے تو تم مسائل میں کیوں گرفتار ہو............ اللہ فرماتا ہے:

میرا رسولؐ!

یہ کافروں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ مومنوں کی تکلیف کے وقت ان کو عقائد سے گمراہ کرنے کے لئے وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہارا مذہب سچا ہوتا تو تم پر یہ تکلیف کیوں آتی۔ اللہ فرماتا ہے کہ کافروں کی کسی بکواس پر افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں' میں اللہ تمہارا مددگار ہوں۔ میں اللہ کسی وقت تم سے ناراض نہیں ہوں۔ نہ میں تمہیں چھوڑ چکا ہوں۔ میرے پہلے کے احسانات بھی بہت ہیں' آئندہ بھی احسانات کی بارش کرتا رہوں گا۔ بعد والے احسانات بھی پہلے والے احسانات سے بہت زیادہ ہوں گے۔

میرے حبیبؐ!

مختصر جو احسان میں نے پہلے کیے ہیں وہ یہ تھے کہ آپ اس وقت یتیم تھے'

کیا تم یتیم نہیں تھے؟

میں نے تمہیں پالا'

میں نے تمہیں سرپرستی عطا کی'

میں نے تمہیں اپنے سائے میں رکھا'

میں نے تمہیں اپنی گود دی'

حالانکہ پالنے والا ابو طالب گود دینے والا ابو طالبؑ لیکن اللہ سیاہ و سفید کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے تجھے پالا ہے۔ (نعرۂ حیدری)

اور پھر فرمایا:

"تم ہدایت کے رستے میں پریشان تھے' میں نے تمہاری پریشانیاں دور کیں۔ کیا تم مفلس نادار غریب نہیں تھے؟ میں نے تمہیں دولت دی۔ تمام مفسرین فرماتے ہیں کہ پالنے والا ابو طالبؑ ہے' دولت دینے والی خدیجہؑ ہے۔ مگر اللہ فرماتا ہے:

"مجھے سیاہ اور سفید کی قسم۔

دن اور رات کی قسم۔

نور اور ظلمت کی قسم!

تجھے پالنے والا بھی میں ہوں۔

تجھے دولت دینے والا بھی میں ہوں۔

اب سمجھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اللہ کسی کافر کے فعل کو اپنا فعل نہیں کہا کرتا۔ (نعرۂ حیدری)

سامعین!

چونکہ یہ قصرِ ابو طالبؑ ہے لہٰذا میں قرآن کی روشنی میں مقامِ ابو طالب واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ فرماتا ہے:

میں نے پالا ہے تمہیں یتیمی کے بعد۔

میں نے تمہیں دولت دی ہے غربت کے بعد۔

تمام شیعہ سنی مفسر لکھتے ہیں کہ پالنے والا ابوطالبؑ ہے' دولت دینے والی خدیجہؑ ہے اوراللہ کا دستور ہے کہ کبھی کافر کے فعل کو اپنا فعل نہیں کہتا۔ حالانکہ جو فعل ابو طالبؑ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے یہی کام فرعون نے کیا تھا۔ نبیؑ پروری' نبی کو پالنا' فرعون نے بھی نبی کو پالا ہے' ابو طالب نے بھی گود میں نبیؐ کو پالا ہے۔لیکن اللہ نے فرعون کے فعل کو اپنا فعل نہیں کہا۔ ابو طالب کے فعل کو اپنا فعل کہا ہے۔ حالانکہ فعل دونوں ایک ہیں۔ موسیٰ علیہ اسلام سے کہا کہ تجھے فرعون نے پالا اور محمدؐ سے کہا تجھے میں نے پالا۔ بلکہ قرآن نے فرعون نے قول کو نقل کیا ہے۔فرعون نے موسیٰ سے کہا تھا۔

اَلَمْ نُرَبِّکَ وَلِیداً

"کیا ہم نے تجھے پالا نہیں ہے؟"

اب اللہ نے فرعون کے اس قول کی تردید نہیں کی ہے کہ فرعون نے نہیں پالا میں نے پالا تھا۔ ابو طالبؑ کے پالنے کی تائید کی ہے کہ محمدؐ تو یتیم تھا تجھے میں نے پالا ہے۔اللہ جس کے فعل کو اپنا فعل کہتا ہے ۔ وہ یا نبی ہونا چاہئے یا ولی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ عیسیٰ کے فعل کو اللہ نے اپنا فعل کہا:

اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَکَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ

انطاقیہ والوں کی طرف میں نے دو مبلغ بھیجے' حالانکہ بھیجے عیسیٰ نے تھے۔ اللہ فرماتا ہے میں نے دو مبلغ بھیجے اور ان کے بعد تیسرا بھی میں نے بھیجا۔عیسیٰ کے فعل کو اللہ کہتا ہے میں نے کیا۔ پیغمبرؐ نے سنگریزے مارے' اللہ فرماتا ہے:

گئے تیرے ہاتھ سے ہیں' لیکن:

مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی۔

ان سنگریزوں کے مارنے والا میں تھا' تیرا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر نہیں تھا بلکہ میرا ہاتھ تھا' یہ تو بات نہیں کرتا تیری زبان سے نکلنے والے کلمات اصل میں میری بات ہے نبیؐ کے فعل کو تو اللہ کہتا ہے کہ یہ تیرا نہیں میرا ہے۔ کافر کے فعل کو اللہ کبھی اپنا فعل نہیں کہتا۔ اب ابو طالبؑ کے فعل کو یہ کہنا کہ محمدؐ تجھے اس نے نہیں پالا میں نے پالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کے ایمان میں اللہ کو شک نہیں ہے۔ فرماتا ہے:

سیاہ وسفید کی قسم کیا تو یتیم نہیں تھا اور میں نے تجھے پالا۔

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی

میں نے تجھے اپنی گود میں لیا' گود ابو طالب کی تھی' کیا تو غریب نہیں تھا میں نے تجھے دولت مند بنایا۔ جس کے فعل کو اللہ اپنا فعل ہے وہ نہ مشرک نہ منافق بلکہ یا نبی یا ولی۔

سیاہ وسفید کی قسم کھا کر اللہ فرماتا ہے:

میرے پہلے احسان بھی بہت ہیں۔ آئندہ بھی بہت سے احسان کروں گا۔ لیکن بعد والے احسانات بہت زیادہ ہونگے۔ پہلے احسانات کیا ہیں؟ صرف دو۔ یتیمی کے بعد پالنا' غربت کے بعد دولت مند بنانا۔ یہ میرے سابق احسان ہیں' میں عرض کروں میرے اللہ یہ جو تو جتا رہا ہے محمدؐ کو اپنے احسان' یعنی یتیم کے بعد پالنا' غربت کے بعد دولت دینا' کیا محمدؐ کے علاوہ یہ احسان تو نے اور کسی پر نہیں کئے۔ آدمؑ سے لے کر آج تک جتنے یتیم پلے ہیں پالنے والا تو نہیں تو کون ہے؟ جتنے

غریب دولت مند ہوئے ہیں' دولت دینے والا تو نہیں ہے تو کون ہے؟

ہر یتیم کے پالنے والا تو' ہر غریب کو دولت مند بنانے والا تو۔ پھر محمدؐ کو جتلانے کا کیا مطلب' تیرے یہ احسان تو ہر کسی کے ساتھ ہیں۔ ہر یتیم کو پالنا' ہر غریب کو رزق دیتا ہے' دولت مند بناتا ہے۔ اگر احسان جتلانا تھے' تو وہ احسان جتلاتا جو صرف محمدؐ پر تھے اور کسی پر نہیں تھے' یہ کہنا کہ سیاہ و سفید' کی قسم میں نے تجھے رحمت اللعالمین بنایا'

میں نے تجھے صاحب خلق عظیم بنایا'

میں نے تمہیں سرتاج انبیاء بنایا۔

میں نے تجھے شافع محشر بنایا۔

میں نے تجھے صاحب قرآن بنایا۔

میں نے تیری شریعت کو تمام شریعتوں پر حکم بنایا۔

میں نے تجھے قیامت کے دن کا مختار عام بنایا۔

میں نے تجھے صاحب معراج بنایا۔

یہ احسانات جو صرف محمدؐ پر ہیں اور کسی پر نہیں' یہ کیوں نہیں جتلائے وہ جتلائے جو ہر ایک پر کرتا ہے۔ یتیم تھا میں نے پالا' غریب تھا میں نے پیسہ دیا' دولت دی تو یہ احسان کیوں نہیں جتلائے تو یقیناً

كَلَامُ الْحَكِيمِ لَا يَخلُ عَنِ الْحِكْمَةِ.

"حکیم کی کلام حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔" مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو تنبیہ ہو جائے' یہ لوگ تیرا خلق عظیم ہونا بھی نہ بھولیں گے۔ یہ تیرا رحمتہ اللعالمین ہونا بھی نہیں بھولیں گے' ان کو تیرا واقعہ معراج بھی یاد رہے گا' تیرا شافع محشر ہونا بھی یاد

رہے گا' تیرا مالک جنت ہونا بھی یاد رہے گا' تیرا نبیوں کا سلطان ہونا بھی یاد رہے گا' جو احسان یہ دنیا والے بھلا دیں گے میں خدا' سیاہ و سفید کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ابو طالبؑ بھی تیرا محسن ہے' خدیجہؑ بھی تیری محسنہ ہے۔

(ادوات محمد و آل محمد پر باآواز بلند صلوٰۃ)

یہ صرف اس لئے قسمیں کھا کر بتا رہا ہوں کہ جب قرآن کو رٹا لگانے والے ان آیات سے گزریں تو ان کو ابو طالبؑ کا احسان بھی یاد آ جائے' خدیجہ کا احسان بھی یاد آ جائے اور ساری دنیا بھلا دے تو بھلا دے' میں محسن کسی کا احسان بھلاتا نہیں۔ میرا حبیبؐ ابو طالبؑ بھی تیرا محسن اور خدیجہ بھی تیری محسنہ۔

اب ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل احسان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک شخصی احسان اور دوسرا اجتماعی اور ملی احسان.......... ایک ہے مجھے کچھ دے دینا یہ میرے اوپر شخصی احسان ہے' ایک ہے' میرے مشن کے لئے سرمایہ فراہم کرنا' یہ احسان صرف مجھ پر نہیں بلکہ جب تک مشن قائم رہے گا اس احسان کرنے والے کو احسان کا پھل ملتا رہے گا۔ کیا ابو طالبؑ اور خدیجہؑ نے صرف محمدؐ پر احسان کیا ہے یا محمدؐ کے مشن کے محسن ہیں؟ آپ صاحبان عقل و دانش ہیں آپ کے اذہان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مشن کی خدمت' دائمی خدمت' شخصی خدمت ناپائیدار خدمت ...... ابو طالبؑ اور خدیجہؑ کی خدمت دائمی ہے یعنی مشن کی خدمت ہے۔ اگر شخصی خدمت ہوتی تو قرآن محمدؐ کی ذات کی ہسٹری نہیں بلکہ قرآن محمدؐ کے مشن کی کتاب ہے۔ اگر یہ شخصی محسن ہوتے تو مشن کی کتاب قسمیں کھا کر محسنوں کے احسان کو یاد نہ کرتی۔ معلوم ہوا کہ یہ مشن کے محسن تھے لہٰذا مشن کی کتاب اس کا اعتراف کر رہی ہے اور اس کی تفصیل میں یہ عرض کر

دوں کہ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک دو گروہ اس کے ساتھ تعاون نہ کریں' یعنی ایک امیر' دوسرے غریب' خواہ سیاسی تحریک ہو یا قومی وملی۔ امیر کا رسوخ چلتا ہے' غریب کا ووٹ چلتا ہے۔ سیاسی تحریک میں امیر ناراض ہوں تو بھی فیل' غریب ناراض ہوں تو بھی فیل۔ لہٰذا ماہر سیاستدان وہ ہے جو ان دونوں کو اپنے کنٹرول میں کر سکے۔ امیروں سے بھی اپنی قیادت منوالے' غریبوں سے بھی اپنی سیاست منوالے۔ لیکن ان دونوں کا ذہن ایک دوسرے کے مخالف ہے۔ امیر چاہتا ہے کہ غریب غریب رہے تاکہ میرے جوتے پالش کرتا رہے۔ اگر یہ امیر ہو گیا تو میرے جوتے کون پالش کرے گا اور غریب چاہتا ہے کہ یہ امیر بھی مجھ جیسا غریب ہو جائے تاکہ اس کو غریبی کی قدر ہو' لہٰذا ان دونوں کو کنٹرول میں کرنا بہت مشکل ہے' ماہر سیاستدان کو چاہئے کہ دونوں پر بات کو واضح کرے اور ان کو اپنے مشن میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ امیروں سے امیرانہ شان کے مطابق' غریبوں سے غریبانہ شان کے مطابق' امیر کو کرسی کا لالچ دے' غریبوں کو روٹی کا لالچ دے۔ اب ہزاروں امیروں کو کرسی کون دے اور کروڑوں غریبوں کو روٹی کون دے؟ یہ تو اللہ کا کام ہے۔ لہٰذا ماہر سیاستدان وہ ہو سکتا ہے جو جھوٹ بولنے میں ماہر ہو۔ بغیر حلف کے بھی جھوٹ بول سکے حلف کے ساتھ بھی جھوٹ بول سکے' برادران اسلام کہہ کر جھوٹ بولے تو اس کی مرضی' نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی کہہ کر جھوٹ بولے تو اس کی مرضی۔

(نعرۂ حیدری)

حضرات گرامی!

ہے نا یہ سیاست کا مزاج۔ کوئی بھی تحریک ہو۔ سلطان الانبیاءؐ نے تحریک اسلام اٹھائی جو کوئی صوبائی تحریک نہیں تھی' ملکی تحریک نہیں تھی' عالمی تحریک تھی۔ عالمی

تحریک۔ نا مسئلہ اسلام ایک عالمی تحریک ہے۔ پیغمبرؐ نے عالمی تحریک اٹھائی دور تک جانا تو درکنار اپنے شہر میں بسنے والے امیر و غریب سب سے پہلے دشمن۔ مکے کے فرعون دشمن' مکے کے غریب دشمن۔ فرعون اس لئے دشمن کہ انہیں اپنی کرسی کا خطرہ کہ اگر ان کا کلمہ پڑھیں گے تو کرسی سے محروم ہو جائیں گے اور غریب کو یہ خدشہ ہے کہ اگر کلمۂ محمدؐ پڑھیں گے تو یہ رئیس' نواب مزدوری سے محروم کر دیں گے۔ یعنی روٹی کی فکر۔ غریب روٹی کے چھن جانے کے ڈر سے کلمہ نہیں پڑھتے۔ امیر کرسی کے چلے جانے کے خدشے سے کلمہ نہیں پڑھتے۔ یہ تھیں بڑی رکاوٹیں تبلیغ اسلام میں پیغمبرؐ کو' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

میں نے یہ رکاوٹیں دور کر دی ہیں۔ ایک طرف تجھے ابو طالبؑ کے بازو دے دیئے' دوسری طرف خدیجہؑ کی دولت دے دی' ابو طالبؑ کے بازو استعمال کر کے امیروں کو کلمہ پڑھا۔ خدیجہؑ کی دولت سے غریبوں کو روٹی دے اور کلمہ پڑھا۔

(نعرۂ حیدری نعرۂ صلوٰۃ)

سامعین گرامی!

چنانچہ امیروں کو کلمہ نصیب نہ ہوتا اگر ابو طالبؑ نہ ہوتے اور غریبوں کو کلمہ نصیب نہ ہوتا اگر خدیجہؑ نہ ہوتیں' ان دونوں کا احسان صرف محمد مصطفیٰؐ کی ذات تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے اسلام ان دونوں کا مرہون منت ہے اور دونوں برابر کے محسنِ اسلام ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے بارہ معصومینؑ کا باپ ہے ابو طالبؑ' بارہ معصومین کی ماں ہے خدیجہؑ۔ معصوم محمدؐ کے بعد بارہ ہیں تا حسنؑ سے مہدیؑ تک گیارہ ابو طالبؑ کے پوتے خدیجہؑ کے نواسے' اب ان گیارہ کے ساتھ ابو طالبؑ کو ملاؤ تو بارہ کے باپ ابو طالب اور ان گیارہ کے ساتھ زہراؑ کو ملاؤ تو بارہ کی ماں

خدیجہؓ۔

(بر محمدؐ و آل محمدؐ صلواۃ)

علیؑ سے مہدیؑ تک بارہ جن کا باپ ابو طالبؑ۔ اور زہراؑ سے مہدی تک بارہ جن کی ماں خدیجہؓ۔ اب تاریخ کی کتنی ستم ظریفی ہے' کتنا ظلم ہے کہ یہ خدیجہؓ محسن اسلام' تمام سادات کی اماں۔ جو زہراؑ کی اولاد ہے وہ جناب خدیجہؓ کی اولاد ہے۔ جس بی بی کو جناب زہراؑ اماں کہتی ہے' زہراؑ کی ساری اولاد اماں کہتی ہے۔ خدیجہؓ تمام سادات کی ماں' اعزازی ماں نہیں۔ (اعزازی مائیں بھی ہوا کرتی ہیں) لیکن خدیجہؓ سادات کی اعزازی ماں نہیں حقیقی ماں ہیں اور کتنے بیٹوں اور کتنی بیٹیوں کی ماں ہیں۔ چودہ سو سال ہو گئے' کروڑوں سادات کی نسلیں خدیجہؓ کی اولاد میں سے گزر گئیں کروڑوں موجود ہیں اور کروڑوں اور آئیں گی (مبالغہ ہے صرف سینکڑوں نسلیں کہنا چاہئے تھا) گویا اربوں نسل کی ماں اور حقیقی ماں۔ یہ تاریخ کا کتنا بڑا ظلم بلکہ مولوی کا کتنا بڑا ظلم ہے کہ جو کروڑوں نسلوں کی حقیقی ماں ہے اس کو تو مسجد میں ام المومنین کہنا پسند نہیں لیکن جو بیچاری کسی کی ماں نہیں وہ ہر جگہ ام المومنین ہے نعرۂ حیدری............نعرۂ تکبیر' نعرۂ رسالت' نعرۂ حیدر)

عزیزانِ گرامی!

اب میں کیا عرض کروں' تاریخ کی اس ستم ظریفی اور اندھیر گردی کا کیا علاج ہے؟ شاید ابو طالبؑ کا کوئی قصور ہو' خدیجہؓ کا کوئی قصور ہو' جس سے عامتہ المسلمین ناراض ہوں' میں یہ سمجھتا ہوں ایک ایک قصور ان کے نزدیک دونوں کا ہے......... ابوطالبؑ کا قصور صرف یہ ہے کہ علیؑ کا باپ ہے اور خدیجہؓ کا قصور صرف یہی ہے کہ زہراؑ کی اماں ہے۔ اس لئے علیؑ کے دشمن' علیؑ کے باپ کے ایمان کے دشمن اور زہراؑ کے دشمن زہرا کی ماں کے حق کے دشمن۔ اس کے علاوہ ان

دونوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ ہے محسنۂ اسلام۔ ادھر ایسے لوگ اسلام کے یار بن گئے' جنہوں نے کچھ بھی اسلام کو نہ دیا۔ خدیجہؓ نے اسلام کو سب کچھ دیا' ابو طالبؑ نے اسلام کو سب کچھ دیا۔ خدیجہؓ نے ساری دولت اسلام کے لئے وقف کر دی۔ حضرت پیغمبرؐ نے پوری زندگی دے دی اسلام کو۔ خدیجہؓ نے (غالباً دونوں نے خطاب کرتے ہوئے) قریش کے بھرے مجمع میں یہ خطاب کیا تھا کہ ہم لوگ اسلام سے لینے والے نہیں' ہم لوگ تو اسلام پرور ہیں۔ ہم اسلام کو پالنے والے ہیں۔ اسلام ہماری گود میں پل رہا ہے۔ ہم اسلام کو دینے والے ہیں' اسلام کو کھانے والے نہیں ہیں۔ ابو طالبؑ خدمت کر رہے ہیں اپنی طرف سے' محمدؐ خدمت کر رہے ہیں اپنی جانب سے اور اہل مکہ اور قریش میری خدمت بھی سن لیں۔ میں ملیکہ عرب عقیلہ' قریش' جتنے قریشی نامور رئیس' بیٹھے ہیں کوئی میرا ایک لاکھ کا مقروض ہے کوئی دو لاکھ کا مقروض ہے' کوئی پانچ لاکھ کا مقروض ہے کوئی دس لاکھ کا مقروض ہے' میں قریش کے بھرے مجمع میں اعلان کرتی ہوں کہ آج جس نے محمد مصطفیٰؐ حبیب خدا کو اللہ کا رسول مانتے ہوئے ان کی تصدیق کر دی خدا گواہ میں ہر ایک کا قرضہ معاف کر دوں گی۔ (نعرۂ حیدری)

سامعین محترم!

یہ ہے محسنہ اسلام۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر چچا بھتیجے کا باپ مر جانے کے بعد اس کا سر پرست ہوا کرتا ہے' اس کی کفالت کرتا ہے۔ ہے نا یہ دستور فطرت۔ اگر ابو طالبؑ نے محمدؐ کو پالا ہے تو پھر اس میں کون سی بڑی بات ہے؟ اس کے جواب میں میں عرض کروں گا......... تھا تو بھتیجا لیکن دیکھنا اور سوچنا یہ ہے کہ بھتیجا سمجھ کر پالا ہے یا کچھ اور سمجھ کر پرورش کی ہے۔ میں ایک مثال دے کر

بات واضح کرتا ہوں کہ دو چیزیں مقابلے میں آ جائیں' ایک کم قیمت' اور دوسری بیش قیمت تو عقل کیا کہتی ہے کہ کم قیمت کو قربان کرنا چاہئے یا بیش قیمت کو؟ یقیناً کم قیمت کو قربان کرنا چاہیے بیش قیمت کو بچانے کے لئے۔ اگر ایک ٹیڈی پیسے کا روپے سے مقابلہ ہو' یا پیسہ ضائع ہوتا ہے یا روپیہ ضائع ہوتا ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ پیسے کو ضائع کر دیں اور روپیہ بچا لیں۔ اگر ایک طرف روپیہ ضائع ہوتا ہے اور دوسری طرف سو روپیہ ضائع ہوتا ہے تو عقل کا تقاضا ہے کہ ایک روپے کو ضائع کر دو سو روپے کو بچا لو۔ لیکن جب سو سے مقابلہ ہزار کا ہو تو عقل کہے گی سو کو جانے دو' ہزار بچا لو۔ ہزار کا لاکھ سے مقابلہ ہو تو عقل کہے گی کہ ہزار کو جانے دو' لاکھ بچا لو۔ ہمیشہ کم قیمت کو قربان کیا جاتا ہے بیش قیمت کو بچایا جاتا ہے۔ کوئی تعلق بھی ہو اسی طرح سے ہے کہ اگر قوم کے مقابلے میں کوئی باہر کا آدمی ہو تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ غیر کو جانے دو قوم کو بچا لو۔ وہ ڈوبتا ہے تو ڈوب جائے' قوم ڈوبنے سے بچ جائے۔ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ غیر کو جانے دو قوم کو بچا لو۔ وہ ڈوبتا ہے تو ڈوب جائے قوم ڈوبنے سے بچ جائے۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ قریبی اور خونی عزیز ہے اسے بچا لو اور غیر کو جانے دو۔ اسی طرح اگر قوم کے مقابلے میں بھتیجا ہو تو فطرت یہ کہتی ہے کہ قوم کو جانے دو بھتیجے کو بچا لو اس لئے کہ قوم دور کا خون ہے' بھتیجا بھائی کا خون ہے۔ اور اگر بھتیجے کے مقابلے میں بیٹا ہو تو فطرتی تقاضا یہ ہے کہ بھتیجے کو جانے دو بیٹے کو بچا لو۔ اب کوئی شئے آپ کی نظر میں ہے کہ بیٹے کے مقابلے میں آ جائے تو بیٹے کو جانے دو اور اسے بچا لو؟

حضرات گرامی!

اس شے کا نام ہے دین۔ میری بات تو سمجھ میں آ گئی۔ قوم کے مقابلے

میں جو آئے گا وہ قربان ہو گا قوم پر' قوم قربان ہو گی بھتیجے پر' بھتیجا قربان ہو گا بیٹے پر اور بیٹا قربان ہونا چاہئے دین پر۔ یہ ہے دستور قربانی.......... اب قریشیوں نے حضرت پیغمبرؐ کو مکے میں رہنے نہ دیا' حضرت پیغمبر شعب ابو طالبؑ میں تین سال رہے۔

حضرت ابو طالبؑ نے مکہ چھوڑا محمدؐ کی خاطر۔

قوم کو چھوڑا محمدؐ کی خاطر۔

تجارت کو چھوڑا محمدؐ کی خاطر۔

اور گھر کی آرائش و آرام کو چھوڑا محمدؐ کی خاطر۔

حتیٰ کہ بیت اللہ کا کلید بردار ہونے کے باوجود بیت اللہ کو چھوڑا محمدؐ کی خاطر
شعب ابی طالبؑ میں یہ نظریہ قائم کر کے رہے کہ اگر محمدؐ نہیں تو وہ بیت
اللہ کس کام کا۔ محمدؐ قوم سے افضل' کعبے سے افضل' اس کے فضل کو دیکھ کر افضل کے
ساتھ رہے تین سال تک۔ چھوڑ دیا:

قوم کو'

بیت اللہ کو'

مکے کو۔

اب قریش کے متعلق پورے عرب میں یہ بات پھیل گئی کہ بڑے بدطینت
لوگ تھے یہ قریش' کہ انہوں نے کلید بردار بیت اللہ حضرت ابو طالبؑ کو شریف تر
انسان ہونے کے باوجود معمولی سے جھگڑے پر مکے سے نکال دیا ہے۔ اب ا
وفد ابو طالب کے پاس جانا چاہئے تاکہ کچھ لو کچھ دو کے نقطۂ نظر سے مصالحت
جائے۔ کچھ وہ ہماری مان لیں کچھ ہم ان کی مان لیں گے۔ یہ مصالحتی وفد مکے

روانہ ہو کر شعب ابی طالب میں پہنچا۔ حضرت ابو طالب نے فرمایا برادران قریش کیوں آئے ہو؟ عرض کرنے لگے آپ کا فراق اور جدائی ہمیں پسند نہیں۔ تمام عرب ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ سردار قریش تم سے ناراض ہے۔ آپ ناراضگی جانے دیں اور ہمارے ساتھ واپس تشریف لے چلیں۔ ابو طالبؑ نے فرمایا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ میں اپنے بھتیجے محمدؐ سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا ہمارے ساتھ مذاکرات کر لیجئے ہم اپنے مذاکرات میں دو باتیں رکھتے ہیں ان پر بحث ہو جائے' کچھ ہماری تسلیم ہو جائے۔ کچھ آپ کی.........حضرت ابو طالبؑ نے فرمایا: پیش کرو' کیا تجویز میں لائے ہو۔

انہوں نے کہا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ نواب مکہ' رئیس مکہ ولید کا حسین ترین بیٹا عمارہ بن ولید (خالد بن ولید کا بڑا بھائی) آپ لے لیں اور محمدؐ ہمیں دے دیں۔ آدمی کا آدمی سے تبادلہ ہو جائے۔

حضرت ابو طالب نے فرمایا:

"بڑے بے غیرت ہو تم' تمہارا بیٹا پالنے کے لئے لوں' اپنا بیٹا ذبح کرنے کے لئے دوں۔ دفع ہو جاؤ اس منشور پر بات نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے کہا دوسرا نکتہ بھی ہے کہ اپنے بھتیجے سے کہو' دولت چاہتا ہے تو ہم ڈھیر لگا دیں' مکان کی طلب ہے تو ہم عالی شان محل تعمیر کر دیتے ہیں۔ اور اگر حکومت چاہتا ہے تو سر پر تاج شاہی رکھوا دیں' اگر شادی کا خواہش مند ہے تو خاندان قریش کی کسی دوشیزہ کی طرف اشارہ کر دے ہم وہ رشتہ لے دیں گے۔ جو بات چاہے

منوالے لیکن ہمارے دین پر Attack نہ کرے ہمارے مذہب پر اعتراض نہ کرے۔

حضرت ابو طالبؑ نے محمدؐ کی طرف دیکھ کر فرمایا:

بیٹا اس کا فیصلہ آپ خود فرمائیں۔

حضرت پیغمبرؐ نے فرمایا:

چچا جان! آپ ہی فرما دیں۔

یہ مجھے دنیا کا لالچ کیوں دیتے ہیں۔ اگر ان کے بس میں ہے تو آسمان سے سورج اتار کر میرے ایک ہاتھ پر رکھ دیں' چاند اتار کر میرے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ مختصراً چودہ طبق کی دولت میرے قدموں میں ڈال دیں میں اس تمام دولت وسلطنت پر لات مار دوں گا' اللہ کے دین کی تبلیغ کو نہیں چھوڑوں گا۔

یہ دونوں نکات ناکام ہو گئے۔ اب سارے صنادید عرب' اکابر قریش گھبراتے ہوئے' ناراض ہوتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ابو طالبؑ پر ناراض کہ اس نے ہماری کوئی بات نہیں مانی' ادھر شریف النفس انسان کو ہر وقت یہ احساس ہوتا کہ شریف کا کمینے سے کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ ہزاروں شریف ہوں ایک کمینہ ہزار شریف پر غالب ہے لیکن یہاں تو مقابلے میں ایک شریف ہے محمدؐ اور سارے مکے اور قریش کے رئیس مقابلے میں ہیں۔ جب مذاکرات ناکام ہوتے ہیں' سیاستدان خوب سمجھتے ہیں کہ مذاکرات میں ناکامی کے بعد صاحب طاقت' طاقت استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ابو طالبؑ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ یہ سارے بدمعاش ہیں' یہ سارے غنڈے ہیں ہو سکتا ہے طاقت کا استعمال کریں۔ اور سبھی اکٹھے ہو کر رات کو ہم پر شب خون مار دیں۔ وہ دیکھ گئے ہیں کہ یہاں محمدؐ سوتا ہے' یہاں علیؑ سوتا ہے۔ ان کی علیؑ سے تو

دشمنی ہے نہیں' وہ محمدؐ کے بستر پر حملہ کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میری نیند یا غفلت سے فائدہ اٹھا کر محمدؐ کو بستر پر پڑے ہوئے قتل کر دیں۔ اس طرح ساری محنت رائیگاں نہ ہو جائے۔ لہٰذا ابو طالبؑ نے یہ تجویز سوچی' علیؑ کو اٹھایا' محمدؐ کے بستر پر سلایا' محمدؐ کو اٹھایا اور علیؑ کے بستر پر سلایا تا کہ اگر کافر حملہ آور ہوں تو محمدؐ کے بستر پر لیٹا ہوا علیؑ ذبح ہوتا ہے تو ہو جائے محمدؐ بچ جائے' تاریخ یہ پکار پکار کر کہتی ہے کہ ابو طالبؑ کی سوچ تھی کہ علیؑ ذبح ہوتا ہے تو ہو جائے لیکن محمدؐ بچ جائے۔ گویا ابو طالبؑ نے یہ ثابت کر دیا کہ جب قوم کے مقابلے میں اجنبی ہو تو اجنبی قربان' قوم محفوظ' قوم کے مقابلے میں بھتیجا ہو تو قوم قربان بھتیجا محفوظ' بھتیجے کے مقابلے میں بیٹا ہو تو بھتیجا محفوظ' بیٹے کے مقابلہ میں دین ہو تو بیٹا قربان' دین محفوظ۔ حضرت ابو طالبؑ اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں۔ اے دنیا والو! اگر میں محمدؐ کو بھتیجا سمجھتا ہوتا تو بھتیجے کے مقابلے میں بیٹا تھا' بھتیجے کو قربان کر دیتا بیٹا' بچا لیتا لیکن ایسا نہیں' علیؑ کو بیٹا سمجھتا ہوں' محمدؐ کو دین سمجھتا ہوں۔ (نعرۂ تکبیر' اللہ اکبر' نعرۂ رسالت یارسول اللہ نعرۂ حیدری یا علیؑ)

ابو طالبؑ نے کہا:

علیؑ کو بیٹا سمجھتا ہوں' محمدؐ کو دین سمجھتا ہوں' یہ بیٹے اور بھتیجے کا مقابلہ نہیں دین اور بیٹے کا مقابلہ ہے۔ لہٰذا دین بچ جائے اور بیٹا ذبح ہوتا ہے تو ہو جائے۔ ابو طالبؑ نے قربانی کی یہ عادت اپنے اسلاف سے سیکھی تھی۔ یہی معاملہ ابراہیم کو پیش آیا تھا کہ میرے لئے اپنی پیاری شئے ذبح کر دو' میرے لئے' اللہ نے فرمایا:

اللہ کے لئے کوئی کام کرنا ہے دین اور پیاری شئے ہے بیٹا' پیاری شئے ہے اسماعیلؑ' ابراہیم علیہ السلام نے دونوں میں موازنہ کیا کہ بیٹے کو بچاؤں' اللہ کے

حکم کی حفاظت کروں' فیصلہ کیا کہ دین پر بیٹا قربان ہو سکتا ہے' بیٹے پر دین قربان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اسماعیلؑ کو چھری تلے لٹا لیا تا کہ دین بچ جائے' اللہ کا حکم بچ جائے' ادھر اللہ نے بیٹے کو بھی ذبح نہیں ہونے دیا۔ دنبہ ذبح ہو گیا' اسماعیل علیہ السلام محفوظ رہا' اسماعیلؑ کا یہ بچ جانا ابراہیمؑ کی کمزوری نہ تھی' مشیت کی تبدیلی تھی۔ ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو چھری کے نیچے لٹانے سے بخل نہیں کیا۔ اگر اسماعیل بچا ہے تو مشیت کے ذریعے سے نہ کہ ابراہیمؑ کے بخل سے۔ ابراہیمؑ اپنے امتحان میں کامیاب رہے۔ انہوں نے تو بیٹا دے دیا دین کے لئے۔ بیٹا بچا ہے تو مشیت ایزدی نے بچایا' ابراہیمؑ نے بخل نہیں کیا۔ یہاں بھی ابو طالب نے علیؑ کو بستر محمدؐ پر سلا دیا۔ اگر علیؑ بچ گیا ہے مشیت کا یہی تقاضا تھا' ابو طالبؑ نے بخل ہرگز نہیں کیا۔ (نعرۂ حیدری)

(نعرۂ حیدری' یا علیؑ یا علیؑ۔ چمن چمن کلی کلی' علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ)

اور جو آدمی دین کے لئے ایک ٹیڈی پیسہ نہ دے سکتا ہو وہ دین کے لئے بیٹا دے سکتا ہے؟

افسوس کہ تاریخ کی ستم ظریفی۔ جنہوں نے ٹیڈی پیسہ دینا برداشت نہ کیا وہ تو اسلام کے یار بن گئے اور جس نے علیؑ جیسا بیٹا دین کو دے دیا اس کا دین سے کچھ واسطہ ہی نہیں.........

سامعین!

آپ یہ میرا جذباتی فقرہ نہ سمجھیں قرآن یہ کہتا ہے آیۂ نجویٰ پڑھ لیں آپ' کسی آدمی کو سستی شہرت حاصل کرنی ہو تو ایک نامور آدمی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ سستی شہرت حاصل کر سکتا ہے۔ خود کچھ نہ ہو تو بھی نامور کو ذریعہ بنا کر مشہور

ہو جائے گا۔ مثلاً میں تقریر کر رہا ہوں راولپنڈی میں ۔ بالفرض آپ کو تقریر پسند آ رہی ہے تو ایک آدمی ادھر میرے پاس کھڑا ہو جائے اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر میری تعریف اپنی طرف جلب کر لے کہ قبلہ میری بات سنیں۔ یقیناً میری تقریر رک جائے گی اور میں اس کی بات سنوں گا اور اگر وہ بات لمبی کر دے اور میری تقریر آپ کو اچھی لگ رہی تھی تو آپ اس کی بات سے بور ہو جائیں گے۔ اور اس پر نفرین کرنے لگیں گے' عجیب آدمی ہو' تو تقریر کو خراب نہ کرو۔ سارے آدمی بول اٹھیں گے اس کے خلاف ۔ لیکن اس کو آپ کی لعن وطعن کے باوجود ایک فائدہ حاصل ہو جائے گا کہ آپ سارے اس کو پہچان لیں گے۔ ہے نا ایسا؟ اسے فائدہ ہو جائے گا کیونکہ اس کا مشن یہی تھا کہ خواہ برے رنگ میں ہی کیوں نہ سہی' دنیا مجھے پہچان لے کہ میں یہ ہوں۔ اس کا مقصد تو حل ہو گیا۔ گلی میں ملے گا' بازار میں ملے گا تو سارے لوگ کہیں گے یہی بدبخت تھا کہ جس نے ہماری مجلس خراب کی۔ اس کو تو ناموری مل گئی۔ یقین جانیے کہ پیغمبر کے دربار کی مثال بھی ایسی ہی تھی۔ پیغمبر کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ مجوسی بھی جانتے تھے کہ عرب میں ایک پیغمبر آیا ہے' نصرانی بھی جانتے تھے کہ عرب میں ایک نبی آیا ہے۔ یہودی بھی جانتے تھے کہ عرب میں ایک نبیؐ ہے افریقہ والے بھی باخبر تھے۔ حضور فخر کائنات کی تو پوری کائنات میں شہرت تھی کہ ایک نبی اللہ کا پیغام لایا ہے لہٰذا ایرانی حکمران بھی اپنے سفیر اور نمائندے بھیجتے تھے اور ادھر مغربی ممالک بھی اپنے نمائندے بھیجتے تھے۔ افریقہ سے نمائندے آتے تھے' یمن سے بھی نمائندے آتے تھے' روم سے آتے تھے۔ ہر وقت پیغمبرؐ کی مسجد' غیر ملکی نمائندوں سے بھری رہتی تھی۔ کوئی اعتراضات کرنے کے لئے' کوئی سوالات سمجھنے کے لئے' کوئی اسلام کی حقیقت جاننے کے لئے

محمد مصطفیٰؐ کو تو پوری دنیا جانتی تھی کہ یہ نبیؐ ہیں لیکن آس پاس بیٹھنے والوں کو کون جانتا تھا کہ یہ کون ہیں؟ یہ کس باغ کی مولی ہیں؟ ان کو تو کوئی جانتا نہیں تھا۔ اب جو غیر ملکی نمائندے کثرت سے موجود ہیں' حضور اٹھتے وعظ فرمانے کے لئے' خطبہ دینے کے لئے' اب غیر ملکی نمائندوں نے اعتراضات کرنے تھے' حضور نے جوابات دینے تھے' کسی نے مسائل پوچھنے تھے حضور نے واضح کرنے تھے۔ کسی نے دین اسلام سیکھنا تھا حضور نے سکھانا تھا۔ الغرض مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی' صرف اس لئے کہ حضور کچھ کہیں گے ہم کچھ سنیں گے' بولیں گے پوچھیں گے۔ اب حضور کی تقریر ہے دونوں طرف' ایک طرف سے ایک بندہ کھڑا ہو گیا۔ حضور میری سنیں' حضور میری سنیں' حضور میری سنیں۔ اب آپ ان کی سننے لگ گئے۔ ایک فارغ ہوا ادھر سے دوسرا کھڑا ہو گیا' حضورؐ میری ایک بات سنیں ایک ختم کرتا دوسرا کھڑا ہو جاتا' دوسرا ختم کرتا پہلا کھڑا ہو جاتا۔ اب رحمتہ اللعالمینؐ کس کو کہے' خلق عظیم کس کو ڈانٹے۔ ڈانٹنے والا نبی نہیں' زور سے بولنے کی عادت نہیں۔ جھڑکنے کا رویہ نہیں۔ اللہ نے فرمایا:

تو خلق عظیم ہے تیرا کام جھڑکنا نہیں۔ اب جھڑکنا انہوں نے نہیں' رکنا انہوں نے نہیں۔ سارے لوگ بے شک برا سمجھیں' لعن طعن کریں مگر ان کو کچھ پرواہ نہیں۔ انہیں تو بس سہی خبط ہے کہ ہمیں پہچان تو لیں گے نا سارے۔ چلو لعنت ہی سے سہی پہچان تو لین گے۔ حضور اپنے مقام پر کبیدہ خاطر کہ یہ مصیبتیں مجھے کچھ کہنے نہیں دیتیں۔ مجمع اپنی جگہ پر بور کہ یہ مصیبتیں ہمیں کچھ سننے نہیں دیتیں۔ پیغمبر کی اس مجبوری کو دیکھ کر اللہ نے اپنا نمائندہ جبریلؑ بھیج دیا:

یارسول اللہ! اللہ تحفۂ درود و سلام کے بعد ارشاد فرماتا ہے:

کہ ان مصیبتوں کو میں دور کروں' تو تو خلقِ عظیم ہے' تو نے تو جھڑکنا نہیں لیکن اگر تیرا منشاء ہو تو اُن کو روک دوں۔ حضرت پیغمبرؐ نے فرمایا:

جبریلؑ تیرا بھلا ہو' ادھر سے کوئی رکاوٹ آتی ہے۔ تو بہت اچھی بات ہے تاکہ میں اپنے مشن کو جاری رکھ سکوں' جبریلؑ ایک آیت لے آیا اس آیت کا نام ہے آیت نجویٰ:

میرا حبیبؐ! یہ آیت ابھی پڑھ کر سنا دو اور ابھی سے یہ حکم نافذ العمل ہے' اعلان عام کر دو کہ اب تب تک کوئی بھی میرے کان سے منہ لگا کر بات نہیں کر سکتا جب تک اپنی جیب سے چند ٹکے بیت المال میں جمع کروا کر ان کی رسید نہ لے لے۔(نعرۂ حیدری' یا علیؑ)

اب وہ جتنی مجلس تھی ساری کافور ہوگئی۔ نہ پیسہ جمع کرواتے ہیں نہ بولنے کی اجازت ہے۔ علیؑ فرماتے ہیں اس دن میرے لئے عید ہوگئی۔ میں نے مزدوری کرکے ایک دینار کما کر اس دینار کے چار حصے کر لئے۔ ایک حصہ صبح' ایک قبل دوپہر' ایک بعد دوپہر' ایک شام کو سارا دن' سوائے میرے حضور کی بات سننے کے لئے کوئی یار حاضر نہ تھا۔ (نعرۂ حیدری)

کوئی بھی نہ آیا' سارے دن میں اور پیغمبرؐ اکٹھے رہے۔ جب شام ہوئی تو سارے دن کی تنہائی کے بعد جبرائیلؑ آ گیا:

اللہ فرماتا ہے:

کہ تیری تنہائی بھی تو مجھے پسند نہیں' سارا دن اکیلا بیٹھا رہا۔ یاری کا تو پتہ چل گیا۔ اب میں اپنے حکم کو واپس لیتا ہوں۔ اعلان عام کر دو جس نے بغض کی باتیں کرنی ہوں آ جائے۔ کوئی ٹیکس نہیں' کوئی پیسہ نہیں۔ اب ہمارے ذاکرین'

مبلغین شکوہ کرتے ہیں کہ فلاں محاذ پر چھوڑ گئے' فلاں محاذ پر چھوڑ گئے' فلاں محاذ پر چھوڑ گئے محمدؐ کو تنہا۔ میں کہتا ہوں ان کا یہ شکوہ فضول ہے جو آدمی ٹیڈی پیسے کے لئے محمدؐ کو تنہا چھوڑ دے بھلا وہ سر دے سکتا ہے؟(نعرۂ حیدری یا علیؑ)

یہ شرف تو ابو طالب کو حاصل تھا۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی کہ جو ٹیڈی پیسہ بھی نہ دے سکے وہ تو محمدؐ کے پکے یار اور جس نے بیٹا تک دے دیا اس کا اسلام سے واسطہ ہی کوئی نہیں۔

یہ قربانیاں ابراہیم سے شروع ہو کر آلِ محمدؐ میں جاری رہیں۔ ابو طالبؑ نے عمل کیا......... جب دین کے مقابلے میں بیٹا آ جائے تو دین بچایا جاتا ہے۔ بیٹے کو ذبح کیا جا سکتا ہے۔ اب محمدؐ مصطفیٰ کی گود میں دو بچے تھے۔ ایک کا نام ابراہیم ہے اور ایک کا نام حسینؑ ہے۔ ابراہیمؑ ماریہ قبطیہ کا بیٹا' حسینؑ زہراؑ کا لال۔ ابراہیمؑ محمدؐ کا بلاواسطہ بیٹا' حسینؑ بالواسطہ بیٹا۔ حسین بیٹی کا بیٹا اور ابراہیم ان کا بیٹا۔ ظاہری طور پر نسب میں قریب اپنا بیٹا ہوتا ہے۔ اب ایک زانو پر ہے اپنا بیٹا' دوسرے زانو پر ہے بیٹی کا بیٹا۔ ادھر سے جبریل آ گیا۔ کبھی ابراہیمؑ کا بوسہ' کبھی حسینؑ کا بوسہ۔ دونوں کو پیار فرما رہے ہیں' دونوں کو چوم رہے ہیں۔ جبرائیلؑ نے آ کر کہا:

اللہ فرماتا ہے:

ان دونوں میں سے ایک کو تم چن لو' ایک ہمیں دے دو۔ اب پیغمبر نے اپنے بیٹے کو بھی دیکھا' زہراؑ کے بیٹے کو بھی دیکھا۔ ظاہری نسب کے اعتبار سے ابراہیمؑ بلافصل بیٹا تھا' حسینؑ بالفصل بیٹا تھا۔ لیکن محمدؐ مصطفیٰؐ نے یہ نہیں دیکھا بلکہ سوچا کہ اگرچہ بلافصل بیٹا ہے لیکن صرف بیٹا ہے' اور اگرچہ وہ بالفصل بیٹا ہے لیکن دین ہے۔

ابراہیم بیٹا ہے' حسینؑ دین ہے اور جب دین اور بیٹے کا مقابلہ آتا ہے تو دین بچایا جاتا ہے اور بیٹا قربان کیا جاتا ہے۔ میرے اللہ ابراہیم تو لے لے حسینؑ میرے پاس رہنے دے۔

یہ سنت آگے چلی تو میدان کربلا میں ایک طرف علی اکبرؑ ہے دوسری طرف اللہ کا دین ہے۔ حسینؑ نے نانا سے بھی آگے قدم رکھا۔

نانا نے ایک بیٹا دین کے مقابلے دیا تھا۔

لیکن حسینؑ نے پورا گھر دے دیا۔

بیٹے اپنے مقام پر۔

بیٹیاں' اپنے مقام پر۔

بہنوں کا پردہ اپنے مقام پر۔

اور خود اپنا تن اپنے مقام پر۔

سب کچھ دینے کے بعد عرض کر رہے ہیں:

تَرَکْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِی هَوَاکَ.

پروردگار میں سب کچھ دے سکتا ہوں لیکن تیرے دین کو یزید کے حوالے نہیں کرسکتا۔

یہ حسینؑ کا کوئی معمولی بیٹا نہیں تھا' جس کا نام ہے علی اکبرؑ دو جملے علی اکبرؑ کا نذرانہ۔

نوجوان' شیعہ نوجوان تیرے سینے کا خون۔

تیرے سر کا خون' تیری پشت کا خون۔

ماہ محرم میں گلیوں میں بکھر جاتا ہے۔ اگر چودہ سو سال سے بہنے والا یہ خون

اکٹھا ہوتا تو آج خون کا ایک دریا موجزن ہوتا۔ لیکن خدا کی قسم ہمارا یہ ایمان ہے کہ شیعہ نوجوانوں کا یہ خون کا موجزن دریا حسینؑ کے بیٹے علی اکبرؑ کے ایک قطرۂ خون کے برابر بھی نہیں۔ یہ سارے نوجوان ذبح ہو جائیں تو حسینؑ کا نوجوان پھر بھی بہت قیمتی ہے۔

خدا جانے کس جگر کی مالک تھی وہ بی بی کہ جس کا بیٹا تھا علی اکبرؑ۔ کتنے دل گردہ کی تھی وہ ماں کہ جس کا فرزند تھا علی اکبرؑ .... میں ایسا کہتا ہوں کہ جب بیٹا جوان ہو جائے تو ماں کو جدھر سے بھی تکلیف ملے ماں پروا نہیں کرتی' اگر سسرال کی طرف سے تکلیف پہنچے تو بھی ماں پروا نہیں کرتی' اگر اپنے خاندان کی طرف سے تکلیف ہو تو بھی پروا نہیں کرتی' اس لئے کہ نوجوان بیٹا ماں کی ہر تکلیف کا علاج ہے۔ اب کتنی صابرہ تھی وہ ماں جس کا بیٹا علی اکبرؑ ہے۔ دن ڈھلا' دسویں کے دن' آیا ہے ماں کے دروازے پر' اماں 'سلام' میرے لائق فرزند بسم اللہ۔ ماں نے بیٹے کے سلام کا جواب دیا۔ بیٹے کس مقصد کے لئے آئے ہو' حکم کرو؟ علی اکبرؑ نے عرض کیا:

اماں میں جوانی کی عمر تک پہنچ گیا ہوں۔ آج تک آپ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ آج پوری زندگی میں پہلا سوال لایا ہوں۔ کیا میرا سوال مانا جائے گا؟

علی اکبرؑ کی ماں فرماتی ہیں:

میں تو ترس رہی تھی کہ میرا جوان بیٹا مجھ سے کچھ مانگے تو میں دوں............ بسم اللہ بیٹا مانگو۔ عرض کرتا ہے' جگر پر ہاتھ رکھو۔ میں مانگتا ہوں' فرماتی ہیں یوں نہ کہو' جگر پر ہاتھ رکھو۔ میں مانگتا ہوں' فرماتی ہیں یوں نہ کہو۔ جگر پر ہاتھ کیوں رکھوں میں کوئی ہاجرہ ہوں؟! تو نے مجھے ہاجرہ سمجھا ہے؟ میں اسماعیلؑ کی ماں

ماں ہاجرہ نہیں' میں زہراؑ کی کنیز ہوں' میں تیرے باپ حسینؑ کی خادمہ ہوں' جو جی چاہئے مانگ' ماں انکار نہیں کرے گی۔

عرض کرتے ہیں:

اماں اور کچھ نہیں مانگتا' صرف موت کی اجازت مانگتا ہوں۔

اہل دل!

موت کا نام جوان بیٹے کے منہ سے سن کر ضبط کر لینا' یہ علی اکبرؑ کی اماں کا جگر ہے۔ علی اکبرؑ نے عرض کیا: موت کی اجازت چاہتا ہوں۔

بی بی نے فرمایا:

تو نے مانگ لیا ہم نے دے دیا۔ اکبرؑ کہتے ہیں چلا جاؤں۔ بی بی کہتی ہیں اجازت تم نے اپنی مرضی سے طلب کی ہے میں روانہ اپنی مرضی سے کروں گی۔

قبلہ!

علی اکبرؑ کے نوکر سے کہو آج علی اکبرؑ کا گھوڑا تیار کر کے بھیج دے۔ آج علی اکبرؑ کی رکاب بھی میں پکڑوں گی' اور کوچ میں ہاتھ بھی میں ڈالوں گی۔ اس لئے کہ آج ہے علی اکبرؑ کی آخری سواری۔ میں چاہتی ہوں کہ بتولؑ کے بیٹے کا فدیہ بھیجوں تو اپنے ہاتھ سے روانہ کروں تا کہ میں زہراؑ سے عرض کر سکوں کہ تیرے بیٹے سے مجھے اپنا بیٹا کوئی پیارا نہیں تھا۔

گھوڑا اندر آیا' بی بی نے ''کوچ'' میں ہاتھ ڈالا' رکاب پکڑی' بسم اللہ میرے نوجوان۔ علی اکبرؑ بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوئے۔ ماں نے لگام دی۔ بیٹا سلام کرنے لگا۔ بہنو! پھوپھیو! خالاؤ! چچیو! میرا سلام.......... اکبرؑ کی ماں نے تمام بیبیوں سے کہا:

زہراؑ کی کنیزو!

زہراؑ کی بہوؤ!

زہراؑ کی بیٹیو!

میں سوال کر کے کہتی ہوں کہ جتنے بھی ابھی تک میدان میں گئے ہیں کیا کوئی بھی میرے بیٹے سے زیادہ حسین تھا؟

سب نے کہا:

لیلیٰ! تیرا بیٹا سب سے حسین ہے۔ فرماتی ہیں' پھر میدانِ حشر میں حسینؑ کی اماں کے سامنے گواہی دینا کہ میں نے اپنا بیٹا اس کے بیٹے کے سر کا صدقہ کر دیا ہے۔

اب علی اکبرؑ نے عرض کیا: اماں! اجازت۔

فرمایا:

کھلے دل سے' فی امان اللہ .... علی اکبرؑ نے گھوڑے کی باگ اٹھائی' اشارہ کیا' گھوڑے نے چلنے کا خیال کیا' ایک قدم نہ اٹھا سکا۔ اس مقام پر حمید بن مسلم کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ جتنے جوان گئے ہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن جب یہ جوان گیا تو تین دفعہ قنات کا پردہ اٹھا اور گرا۔

اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ.

تین دفعہ قنات کا پردہ اٹھا' تین دفعہ قنات کا پردہ گرا اور جب علی اکبرؑ صحن خیام سے نکلے تو پھر ایک گرد اٹھی جو کافی دیر تک برقرار رہی اور صدائے ماتم بلند ہوئی۔ اور خدا گواہ ہے ہمارے ذمہ دار علماء یہ پڑھا کرتے ہیں کہ جب علی اکبرؑ خیام سے نکلے تو پھر ایک گرد اٹھی جو کافی دیر تک برقرار رہی اور صدائے ماتم بلند

ہوئی۔ اور خدا گواہ ہے ہمارے ذمہ دار علماء یہ پڑھا کرتے ہیں کہ جب علی اکبرؑ خیام سے نکلے تو آج تم ہاتھوں سے ماتم کرتے ہو زنجیروں سے ماتم کرتے ہو زینب خاتون نے خیموں کا چکر لگایا تو زینبؑ خاتون کو ایک پتھر ملا۔ اکبر باہر نکلا تو زینب نے پتھر سے ماتم کیا۔

اَجْرُکُمْ عَلَى اللّٰہِ. اَجْرُکُمْ عَلَى اللّٰہ.

پروردگار! حسینؑ کے خوبصورت بیٹے کے صدقے میں تمام حاضرین مجلس کی نیک دعائیں قبول فرما۔

بس آخری جملہ سن لیجئے۔ علی اکبرؑ نے گھوڑے کو اشارہ کیا گھوڑے نے قدم اٹھایا۔ پیچھے سے کسی نے علی اکبرؑ کی عبا میں ہاتھ ڈالا۔ علی اکبرؑ نے گھوڑا روک دیا۔ فرمایا کون ہے مجھے روکنے والا.......... گریے میں ڈوبی ہوئی آواز آئی:

تیری پھوپھی زینبؑ ہوں۔ علی اکبرؑ نے کہا پھوپھی جان! جب اجازت دے دی تو روکتی کیوں ہو۔ پھوپھی نے فرمایا:

بیٹا روکتی نہیں ہوں ایک حسرت پوری کرتی ہوں۔ حسرت یہ ہے کہ جب میں ملنے کو آؤں گی تو تمہارا چہرہ چومنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس لئے تھوڑا سا جھکو میری گردن میں باہیں ڈال دو تاکہ دایاں اور بایاں رخسار چوم لوں۔ پھوپھی نے چوما علی اکبرؑ نے گھوڑے کو اشارہ کیا:

گھوڑے آگے بڑھو بابا اکیلا ہے۔ گھوڑے نے دوسرا قدم اٹھایا پھر کسی مستور نے دامن کو کھینچا۔ علی اکبرؑ نے پوچھا کون ہے؟ تو گریہ کے لہجہ میں جواب دیا تیری ماں ہوں' عرض کی اماں جان! جب اجازت دے دی تو روکنے کا مطلب کیا ؟ وہ دیکھو بابا اکیلا ہے' بی بی نے جواب دیا جب پالنے والی ماں کو موقعہ دیا ہے تو

میں بھی ماں ہوں مجھے بھی محروم نہ کرو۔ حسرت پوری کرلوں۔ ایک دفعہ منہ چومنے دو۔ چنانچہ دوبارہ علی اکبرؑ جھکے اور ماں نے چوما پیچھے ہٹ گئی اب جو تیسری بار شہزادے نے گھوڑے کو اشارہ کیا پھر دامن کو کسی نے کھینچا' علی اکبرؑ نے پوچھا کون ہو روکنے والے؟ خاموشی چھا گئی' جواب نہ ملا' بس گھوڑے سے فرمایا کیوں رک گئے ہو! تو گھوڑے نے زبان حال سے عرض کیا کہ میری مجبوری ہے گھوڑے نے گردن ہلا کر اپنے قدموں کی طرف اشارہ کیا۔ جب علی اکبرؑ نے جھک کر دیکھا کہ کمسن سکینہ گھوڑے کے سموں کو تھامے ہوئے ہے اور کہہ رہی ہے نہ لے جا جب علی اکبرؑ نے دیکھا' سکینہ گھوڑے کے سموں کو چھوڑ دو' بھائی کا حکم مان کر اٹھ کھڑی ہوئی' عرض کی میرے جوان بھائی میری کمسنی پر رحم کرو۔ اماں کا قد دراز تھا۔ پھوپھی کا قد بھی دراز تھا۔ کہ انہوں نے چوم لیا۔ میرا قد چھوٹا ہے اور گھوڑے سے اترنے کو میں نہیں کہتی ذرا اپنا دایاں قدم رکاب سے نکال لو تاکہ اسے سینے سے بھی لگا لوں اور جی بھر کر چوم بھی لوں تاکہ شام تک یاد کرتی رہوں کہ میں نے علی اکبرؑ کے قدم چومے تھے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن

چوتھی مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ○

سامعین گرامی!

آج میں قرآن حکیم کے ایک ارشاد گرامی کی روشنی میں اسلام کی حقیقت اور اسلام کی زندگی کے متعلق گفتگو کروں گا کہ حقیقت اسلام کیا ہے اور اسلام کی زندگی کی تفسیر کیا ہے؟

اسلام کی بلندی کے اسباب کیا ہیں اور اسلام کے تنزل کے اسباب کیا ہیں .... حضرت پیغمبرؐ نے اسلام کا آغاز فرمایا۔ قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ کی تبلیغ فرمائی۔ اس تبلیغ کے درمیان ایسی ابتدائی رکاوٹیں درپیش آئیں' جن کے پیش نظر حضرت پیغمبرؐ کو اللہ کے حضور عرض کرنا پڑا، "پروردگار میں نے تیری خواہش کے مطابق جو طریقۂ تبلیغ اپنایا ہے، اس کی کامیابی یعنی اسلام کی اشاعت کس طرح ممکن ہوگی؟

دیکھئے کوئی تحریک ہو، کوئی قوم ہو، کوئی ملت ہو اگر وہ ترقی کرتی ہے تو اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں اور اگر وہ تنزل کا شکار ہو جاتی ہے تو پھر بھی اس کے کچھ اسباب ضرور ہوتے ہیں' بغیر اسباب کے نہ ترقی ہوتی ہے نہ تنزل۔ اہل ذکر حضرات اور اہل فکر حضرات یہ بات جانتے ہیں کہ مجموعی طور پر ترقی کے اثرات یہ ہوتے ہیں کہ جس تحریک کو اُبھارنا ہے اس کے سربراہ تحریک پرور ہوں' تحریک خور نہ ہوں۔ اور تنزل کے اسباب یہ ہوتے ہیں کہ اس تحریک کے سربراہ تحریک کی پرور کرنے کے بجائے تحریک خور بن جاتے ہیں۔ کسی سیاسی تحریک یا جماعت کے سربراہ سیاست پرورش ہوں تو تحریک یا جماعت تنزل کا شکار ہو جاتی ہے مجموعی طور پر آپ ہر قوم کا جائزہ لیں تو یہی نتیجہ نکلے گا۔

ترقی کرنے کے لیے معاونت کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے ایک شخص کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس متمدن دنیا میں کوئی چند آدمی اس کے ساتھ نہ ہوں۔ ہر سیاسی یا مذہبی تحریک کو دو قوتوں کا تعاون ضروری ہے۔ امیر کا تعاون بھی درکار ہوتا ہے اور غریب کا تعاون بھی درکار ہوتا ہے امیر کا اثر و رسوخ اور غریب کا ووٹ کسی بھی سیاسی تحریک کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ جس سیاسی تحریک سے امیر ہٹ جائیں وہ بھی ناکام اور جس سے غریب ہٹ جائیں وہ بھی ناکام۔ کوئی بھی لیڈر کامیاب اس وقت ہوتا ہے جب وہ امیر' غریب سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو' بیان میں کشش ہو' طرز بیان دلکش ہو۔ شخصیت دل آویز ہو' تو پھر لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں یہ خوبیاں نہیں تو پھر حرف ڈھول پر ڈھنڈورا پیٹنے سے کامیابی نہیں ہوتی۔ اور سب سے بڑی ضرورت سیاست میں جھوٹ بولنا ہے۔ وہ سیاست دان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو جھوٹ نہ بول سکتا

ہو یا جھوٹ بولنے سے ڈرتا ہو۔ جو جھوٹ بولنے سے ڈرتا ہے، سیاست حاضرہ میں اس کا داخل ہونا بالکل غلط ہے۔ جھوٹ کا ماہر ترین شخص ہی سیاست کی کرسی کی طرف قدم بڑھائے گا تو کامیاب ہوگا...... سہروردی کا قول شاید آپ کو بھی یاد ہوگا اپنے دورِ حکومت میں اس نے بیان دیا تھا کہ وہ سیاستدان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو بات کرنے کے بعد اپنی بات سے مکر نہ سکے۔ یعنی سیاست حاضرہ کا طریق کار یہ ہے کہ جو بات چاہو کرو' کرتے چلے جاؤ لیکن انکار کرنا پڑے تو تم انکار بھی کر سکو۔ قسم قرآن اٹھا جاؤ کہ میں نے تو یہ بات کی ہی نہ تھی۔ غریب کو مطمئن کرتا ہے تو جھوٹا آدمی' امیر کو مطمئن کرتا ہے تو جھوٹا آدمی۔ اس لیے کہ امیر اور غریب کے ذہن ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور دو دشمنوں کو اپنے ساتھ بھلا کون ملا سکتا ہے امیر کا ذہن غریب کا دشمن' غریب کا ذہن امیر کا دشمن۔ عمومی بات کر رہا ہوں ورنہ بعض امیر غربا پرور بھی ہوتے ہیں اور بعض غریب بھی امیر نواز ہوتے ہیں۔ البتہ عام معمول زندگی میں ان دو مختلف ذہنوں کے حامل اشخاص کو اپنے ساتھ صرف وہی ملا سکتا ہے جو جھوٹ میں ماہر ترین ہو۔ امیر سے بھی جھوٹا وعدہ کرے غریب سے بھی جھوٹا وعدہ کرے۔ امیر کو وعدہ دے کرسی کا غریب کو وعدہ دے روٹی کا۔ امیر کرسی پر بولتا ہے' غریب روٹی پر بکتا ہے۔ دس بیس ہزار امیر ہوں تو ان سے وعدہ نبھائے کیسے اور لاکھوں' کروڑوں غریب ہوں تو ان کو روٹی دے کیسے؟ لیکن سیاست دان وہی کامیاب ہے جو غریب کو کہے کہ تجھے روٹی دوں گا اور امیر کو کہے کہ تجھے کرسی دوں گا۔ امارت' ملازمت' صدارت کی کرسیوں کا لالچ دے۔

مکے کی سرزمین میں سلطان الانبیاء ؐ نے ایک تحریک کا آغاز کیا یہ تحریک سیاسی تحریک نہیں تھی بلکہ خالص دینی تحریک تھی جس کا نام اسلام ہے۔ امیر بھی اس

کے مخالف' غریب بھی اس کے مخالف۔ امیر کو خطرہ کہ کلمہ پڑھوں گا تو کرسی چھوڑنا پڑے گی اور غریب کو یہ ڈر کہ کلمہ پڑھوں گا تو نوابین عرب مزدوری سے چھٹی کرا دیں گے۔ غریب روٹی کی فکر میں کلمہ نہیں پڑھتا کہ خود غریب ہے ہم کو روٹی کہاں سے کھلائے گا امیر کرسی کی خاطر کلمہ نہیں پڑھتا کہ کرسی سے محروم ہو جائے گا۔ لہٰذا تحریک اسلام کے رہبر صادق کے مکے کے نواب اور رئیس بھی دشمن اور مکے کے مزدور اور غریب بھی دشمن..........

فرد واحد ہے اسلام کی تحریک چلانے والا اور تحریک بھی مقامی نہیں' ضمنی نہیں' صوبائی نہیں' ملکی نہیں' عالمی اور؟ تحریک ہے۔ اتنی عظیم تحریک لیکن تعاون نہ امیر کر رہے ہیں' نہ غریب کر رہے ہیں' ہر کسی کو اپنی کرسی کی فکر لگی ہوئی ہے۔

حبیب اللہ ؐ نے بارگاہ خدا میں عرض کیا:

> میرے اللہ! تحریک تو میں نے چلا دی' تعاون نہ غریب کرتے ہیں نہ امیر۔ اور یہ دور حاضر کی سیاسی تحریک بھی نہیں' جس زبان سے اس تحریک کا آغاز کیا ہے وہ جھوٹ بولنا جانتی نہیں۔ نہ امیر کو جھوٹ سے مطمئن کر سکتی ہے نہ امیر کو لالچ دے سکتی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

> جھوٹ میں نے نہیں بولنا' سچ یہ مانتے نہیں۔ جبکہ تحریک عالمی ہے' تحریک دائمی ہے' تحریک ابدی ہے.......... اب آپ بتائیے کہ جب سارے عزیز و اقارب بھی چھوڑ چکے ہیں تو میں تحریک کو کیسے چلاؤں؟

مالک کائنات نے پوری سورت نازل فرما دی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا
سَجٰى. مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰىo وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ
لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰىo وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى
o اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى o وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى
o وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى o فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ o
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ o وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْo

یہ پوری سورت پیغمبرؐ کی اس مجبوری کا حل ہے۔ مجبوری سمجھ میں آئی!۔ تحریک عظیم ہے' امیر ساتھ دیتے ہیں نہ غریب ساتھ دیتے ہیں۔ جبکہ تحریک کی کامیابی کی ضمانت یہ ہے کہ امیر بھی ساتھ ہوں اور غریب بھی ساتھ ہوں۔ امیر بھی چھوڑ گئے غریب بھی چھوڑ گئے لیکن مالک کائنات فرماتا ہے:

میرے حبیبؐ فکر نہ کرو! مجھے ضحیٰ کی قسم، مجھے رات کی قسم جب وہ چھا جاتی ہے یعنی روشنی کی قسم' تاریکی کی قسم' یا یوں کہہ لیں کہ دن کی قسم' رات کی قسم' یا یوں کہوں کہ نور کی قسم ظلمت کی قسم۔ سیاہ سفید کی قسم تجھے امیر چھوڑ دیں تو پروا نہ کرو' غریب چھوڑ دیں تو پروا نہ کرو۔ میں تو تمہیں نہیں چھوڑ رہا۔

(نعرۂ حیدری)

میں تمہارا رب تو تمہارے ساتھ ہوں' تمہیں غریب چھوڑیں تو چھوڑیں' امیر چھوڑیں تو چھوڑیں لیکن میں تمہارا رب تو تمہارے ساتھ ہوں۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ میں تنہا خدا تمہارے لیے کافی ہوں۔ کتنے احسان میں تم پر کر چکا ہوں اور

آئندہ کتنے احسان کروں گا وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى. اگرچہ میں نے تم پر پہلے بھی بہت سے احسانات کئے ہیں لیکن جو بعد میں کرنے ہیں وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ پہلے احسانات پروردگار نے کیا فرماتے ہیں۔ اَلَمْ يَتِيْمًا فَاٰوٰى o فرماتا ہے کیا تم غریب نہیں تھے مگر ہم نے تمہیں پالا۔ کیا تم ہدایت کے رستے میں سرگرداں نہیں تھے۔ میں نے تمہاری رہنمائی نہیں کی۔ کیا تم غریب نہیں تھے میں نے تمہیں غنی نہیں کیا۔

دعوت فکر دے رہا ہوں۔ حافظانِ قرآن کو جو چند گھنٹوں میں قرآن ختم کر لیتے ہیں الحمد سے والناس تک ۔ کبھی انہوں نے ان آیات کو سوچا بھی ہے کہ یہ آیات کہہ کیا رہی ہیں۔ حافظ قرآن! حفظ کرنا تو آسان ہے' سمجھنا مشکل ہے' اللہ فرماتا ہے کیا میرے تم پر یہ احسانات نہیں ہیں۔ کیا تم یتیم نہیں تھے میں نے تمہیں پالا ہے۔ کیا تم غریب نہیں تھے میں نے تمہیں غنی کیا ہے۔ یہ قرآن کہہ رہا ہے اور سیاہ سفید کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ تم یتیم تھے میں نے تمہیں پالا ہے۔ تم غریب تھے میں' نے تمہیں دولت مند کیا ہے۔ یہ اللہ فرما رہا ہے' جو جھوٹ بول ہی نہیں سکتا' جو فرماتا ہے سچ فرماتا ہے...... اب ہر اہل شعور جانتا ہے کہ جب محمدؐ یتیم تھے تو پالا ابو طالبؑ نے اور جب غریب تھے تو دولت دی ابو طالبؑ نے اللہ قسمیں اُٹھا کے کہہ رہا ہے' مجھے دن اور رات کی قسم' سیاہ سفید کی قسم نور و ظلمت کی قسم تم یتیم تھے تجھے پالا میں نے ہے .... اللہ نے ابو طالبؑ کا نام نہیں لیا۔ اللہ بھی قرآن میں حلفیہ بیان دے رہا ہے اور تاریخ بھی قسم اُٹھا کر کہہ رہی ہے کہ تم یتیم تھے تو تمہیں پالا ابو طالبؑ نے اور غریب تھے تو دولت دی خدیجہ نے ......

اب میں حافظان قرآن سے پوچھتا ہوں کہ اللہ جو قسم اُٹھا کر کہہ رہا ہے

اللہ کی قسم سچی ہے یا تاریخ سچی ہے؟ اللہ کہہ رہا ہے میں نے پالا میں نے دولت دی‘ اور تاریخ کہتی ہے پالا ابو طالب نے اور دولت دی خدیجہؑ نے۔ ان دونوں میں سے سچا کون ہے؟ قرآن یا تاریخ؟ قرآن جھوٹا ہو نہیں سکتا اور تاریخ بھی سچی ہے کہ ظاہراً پالا ابو طالبؑ نے ہے اور دولت خدیجہؑ نے دی ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ فعل ابو طالبؑ کو اللہ شب و روز کی قسم اُٹھا کر کہہ رہا ہے کہ یہ فعل میرا ہے۔ جس کے فعل کو اللہ اپنا فعل کہے وہ بھلا کافر کیسے......؟ (نعرہ حیدری)

سامعین!

یہ قرآن کا انداز بیان ہے لیکن کافر جتنا بھی اچھا فعل کرے اللہ اس کو اپنا فعل ہرگز نہیں کہتا۔ اللہ صرف اس کے فعل کو اپنا فعل کہتا ہے جو معصوم ہو۔ کنکر مارے پیغمبر اللہ کہے میں نے مارے ہیں اِذْ رَمَیْتَ مَارَمَیْتَ‘ ہاتھ پیغمبر کا ہے صحابہ کے ہاتھوں میں اللہ کہتا تمہارا ہاتھ نہیں یہ میرا ہاتھ ہے۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ اس طرح وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ یہ تم نہیں بول رہے میں بول رہا ہوں۔ نبی کے فعل کو اپنا فعل کہتا ہے‘ کافر کے فعل کو اللہ اپنا فعل نہیں کہتا کہ یہ میں نے کیا ہے؟

اگر کافر نیک فعل بھی کرے تو اللہ اس کو اپنا فعل نہیں کہتا کیونکہ اللہ کافر کے کام کو اپنا کام کہنا اپنی توحید کی توہین سمجھتا ہے۔ ایک بڑے کافر نے ایک بڑے نبی کو پالا ہے‘ اس بڑے کافر کا نام تھا فرعون اور بڑے نبی کا نام ہے موسیٰؑ...... بڑے کافر نے بڑے نبی کو پالا ہے...... اللہ نے قرآن میں محمدؐ کا تذکرہ کیا ہے اور موسیٰ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ محمدؐ اور موسیٰ کے پالنے والوں ابو طالب اور فرعون کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مگر ابو طالب کے تذکرے اور فرعون کے تذکرے میں فرق رکھا ہے۔ موسیٰ کو فرماتا ہے‘ فرعون تم سے کہتا رہا ہے اَلَمْ نُرَبِّکَ فِیْنَا وَلِیْدًا‘ یعنی

فرعون کہتا تھا موسیٰ تجھے میں نے پالا ہے۔ لیکن محمدؐ کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے تمہیں پالا ہے یہ نہیں کہتا ہے کہ فرعون نے تجھے پالا ہے۔ فرعون نے بڑے نبی کو پالا ہے لیکن اللہ نے نہیں کہا کہ میں نے پالا ہے ایک ابو طالبؑ نے نبی اکرمؐ کو پالا ہے تو اللہ فرماتا ہے میں نے پالا ہے اگر خدانخواستہ فرعون اور ابو طالبؑ کے مذہب میں فرق نہ ہوتا تو اللہ ویسے ہی کہتا جیسے فرعون کے بارے میں کہتا ہے۔

(نعرۂ حیدری)

کیا یہ درس قرآن نہیں ہے......؟ قرآن نے فرعون کے فعل کو اللہ کا فعل نہیں کہا لیکن ابو طالبؑ کے فعل کو اللہ کا فعل کہا ہے۔

سامعین گرامی!

اب واپس پلٹتے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول کو تحریک اسلام کے فروغ کے لیے کیا طاقتیں عطا کی ہیں۔ ولید ابن مغیرہ جیسا نواب اور رئیس بھی دشمن اسلام‘ معمولی معمولی مزدور بھی دشمن اسلام۔ جہاں امیر ساتھ نہ دیں‘ غریب بھلا کس طرح ساتھ دیں گے۔ اب مبلغ کیا کرے؟ اللہ فرماتا ہے:

غریبوں کی پروا کرو نہ امیروں کی۔ یہ چھوڑتے ہیں تو چھوڑ جائیں میں نے تمہیں دو طاقتیں جو عطا کر دی ہیں۔ ان دو طاقتوں سے عالم کائنات میں اللہ کے دین کو فروغ دے۔ ایک طاقت ہیں ابو طالبؑ کے بازو اور دوسری طاقت ہے خدیجہ کی دولت۔ یہ میرے وہ احسان ہیں جو ہر احسان سے بلند ہیں۔ ابو طالبؑ تمہیں اس لیے دیا ہے کہ اگر امیر کلمہ نہیں پڑھتے تو ابو طالب کے بازوں کے زور سے امیروں کی گردن جھکا اور غریب اگر روٹی کے ڈر سے کلمہ نہیں پڑھتے تو یہ لے خدیجہ کا لنگر‘ دولت وثروت‘ غریبوں کو روٹی کھلا اور کلمہ پڑھا۔ ابو طالب کے بازو نہ

ہوتے تو امیر کو کلمہ نصیب نہ ہوتا۔ خدیجہ کے بازو نہ ہوتے تو غریب کو کلمہ نصیب نہ ہوتا۔ یہ دونوں ہیں محسن اسلام۔ جب تک کائنات قائم ہے ابو طالبؑ کا بھی اسلام پر احسان ہے اور خدیجہؑ کا بھی۔ بارہ معصومینؑ کا باپ ہے ابو طالبؑ اور بارہ معصومینؑ کی ماں ہے جناب خدیجہؑ۔ وہ بارہ بتا سکتے ہو؟ حسنؑ سے لے کر مہدیؑ تک گیارہ معصومؑ ہیں ان گیارہ کے ساتھ علیؑ مل جائے تو ان کا باپ ہے ابو طالبؑ اور حسنؑ سے مہدیؑ تک گیارہ کے ساتھ زہراؑ مل جائے تو ان بارہ معصومینؑ کی ماں ہے خدیجہؑ۔ ابو طالبؑ بھی بارہ معصومینؑ کا باپ، خدیجہؑ بھی بارہ معصوموں کی ماں۔ لیکن خدا جانے مسلمانوں نے انہیں پس پشت کیوں ڈال دیا ہے۔ شاید ان دونوں میں سے ہر ایک کا ایک ایک قصور ہے۔ ابو طالب کا واحد قصور یہ ہے کہ وہ علیؑ کا باپ ہے اور خدیجہؑ کا واحد قصور ہے کہ وہ زہراؑ کی ماں ہے۔ ورنہ دونوں محسن اسلام ہیں۔ تیرہ سال انہوں نے پیغمبرؐ کی نوکری کی ہے...... پھر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب انداز قرآن کو دیکھو۔ تیرہ سال کی ہے انہوں نے خدمت اسلام اور مکے کی عزت کیا ہے؟ عجیب و غریب انداز میں بیان کی ہے قرآن نے مکے کی منزلت ایک جگہ یہ فرمایا ہے:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنَ.

مجھے تین کی قسم، زیتون کی قسم، طور سینین کی قسم اور اس بلدالامین کی قسم۔

دوسری جگہ فرماتا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ o وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ.

مجھے اس شہر کی قسم جس شہر میں تم رہتے ہو۔ امین شہر بھی مکہ، اللہ کی قسم گاہ

بھی مکہ لیکن انہی تیرہ سالوں میں، لیکن جب ابو طالبؑ اور خدیجہ رحلت فرما گئے تو اسی شہر کے بارے میں فرمان ایزدی ہے اَخْرِجْ مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ میرا حبیب اس ظالم شہر سے نکل جا وہی جو بلد الامین ہے، وہی شہر جس کی قسمیں اٹھائی جاتی ہیں لیکن جب ابو طالب اور خدیجہ چل دیئے تو فرمایا اس ظالم شہر میں سے نکل جاؤ...... معلوم ہوا کہ مکہ کی عظمت سے بھی بلند تر ہے ابو طالبؑ کی عظمت، ابو طالب زندہ ہے تو مکہ بلد الامین ہے، ابو طالب زندہ ہے تو مکہ اللہ کی قسم گاہ ہے۔ ابو طالب چل دیئے تو فرماتا ہے یہ ظالم شہر ہے، حالانکہ شہر وہی ہے، وہی گلیاں ہیں، وہی کوچے ہیں، وہی محلات موجود ہیں۔ لیکن ابو طالبؑ کی زندگی تک بلد الامین ہے۔ ابو طالبؑ چل دیئے تو ظالم ہے۔ یہ دونوں محسن اسلام ہیں۔ ایک ابو طالبؑ دوسری خدیجہؑ۔

تیرہ سال مکے میں ابو طالب اور خدیجہ نے خدمات انجام دیں اور چل دیئے تو اللہ نے پیغمبر کو بے آسرا نہیں رکھا۔ ابو طالب کی دستار علیؑ کے سر پر اور خدیجہ کی چادر زہراؑ کے سر۔ دو متبادل مل گئے مکے میں، تیرہ سال ابو طالب اور خدیجہ، مدینے میں 10 سال علیؑ و فاطمہؑ یہ ہے اسلام کی (23) تیئیس سالہ عروجی زندگی ....معراج حیات، ارتقائی زندگی۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ سربراہ قوم پرور ہوں۔ کسی تحریک کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ اس کے سربراہ تحریک پرور ہوں۔ اسلام نے ان تیئیس سالوں میں ترقی کی ہے کیونکہ سربراہ اسلام پرور تھے۔ یہ ساری تاریخ اسلام کا خلاصہ ہے سربراہ تحریک پرور ہوں تو ترقی ہوتی ہے، تحریک خور ہو تو تنزل مقدر بن جاتا ہے...... چار اسلام پرور ملے ہیں پیغمبر کو، دو مرد

اور دو مستور۔ ابو طالبؑ اور خدیجہ مکہ میں اور علیؑ اور طاہرہؑ مدینہ میں۔ اسلام کی تیئس سالہ زندگی میں ارتقا کتنا ہوا ہے۔ جب تک اسلام پرور ساتھ ہیں ارتقا ہی ارتقا ہے اسلام نقطۂ صفر سے نقطہ معراج تک پہنچا ہے' ترقی ہی ترقی ہے' وجہ یہ ہے کہ اسلام خور کوئی نہیں ہے ان سربراہوں میں۔ ابو طالبؑ نے سب کچھ دیا ہے اسلام کا کھایا کچھ نہیں۔ ابو طالب کوئی معمولی حیثیت کا مرد مزدور نہیں تھا سلطان مکہ تھا، سید العرب تھا' کلید برادر بیت اللہ تھا' شریف مکہ تھا۔اس زمانے میں مکے کا سردار تھے۔

ابو طالبؑ نے تجارت چھوڑی تو محمدؐ کی خاطر' امارت چھوڑی تو محمدؐ کی خاطر' گھر چھوڑا تو محمدؐ کی خاطر' کعبہ چھوڑا تو محمدؐ کی خاطر' تین سال تک شعب ابی طالب میں محمدؐ کو پناہ دے کر بیٹھا رہا ہے۔ مکہ چھوڑ دیا' کلید برادری چھوڑ دی' تجارت چھوڑ دی۔ برادری چھوڑ دی' امیر ہو کر درختوں کے پتے کھا کر گزارا کر رہا ہے ابو طالبؑ ......محمدؐ کی نگرانی کو نہیں چھوڑا۔ ہر شے دے دی' محمدؐ کے سر پر ہاتھ رکھا' اسلام کو چار چاند لگا دیئے' اسلام ابو طالب کے زیر داماں نقطہ صفر سے اُٹھ کر نقطہ عروج تک پہنچا' وجہ یہ ہے کہ سربراہ اسلام پرور تھے۔ لیکن آگے کا قصہ سنئے' رسول رحلت فرما گئے' چاہیے تو یہ تھا کہ جس مقام پر رسولؐ نے اسلام کو چھوڑا تھا ترقی نہ کرتا تو اسی مقام پر تو رہتا۔ حق تو یہی تھا کہ جس نقطے پر اسلام کو چھوڑا اسی پر رہتا' لیکن تاریخ کہتی ہے کہ اسلام اپنے مقام پر قائم نہ رہ سکا' پیچھے ہٹتا گیا اور ہٹتے ہٹتے پورے پچاس سال بعد اسلام محمدیت سے ہٹ کر یزیدیت تک آ پہنچا۔ پچاس سال بعد جس کرسی پر محمدؐ بیٹھا کرتے تھے اسی کرسی پر یزید آ بیٹھا۔ عروج تک پہنچنے کے لیے اسلام کو لگے تیئس سال' پستی تک پہنچنے میں لگے پچاس سال۔ اسلام آگے بڑھا تو اسلام خور نہ تھے اور پیچھے ہٹا تو صاف ظاہر ہے کہ رحلت رسول کے بعد اسلام خور

آ گئے۔ اگر نہیں آئے تو اسلام پیچھے ہٹا کیوں؟ یزیدیت کی طرف اسلام کا رُخ کس نے موڑا؟ اپنے آپ تو نہیں مڑ گیا؟ جہاں پیغمبر نے اسلام کو چھوڑا تھا اسلام وہاں رہا کیوں نہیں۔ اپنے آپ کیسے ہٹ سکتا ہے' یقیناً کچھ ایسے منفی اسباب تھے' جنھوں نے اسلام کو پستی کی طرف مائل کر دیا۔ یزیدیت کی طرف موڑ دیا اور پچاس سال میں یہاں تک پہنچا دیا۔

وہ کون سے عوامل ہیں ؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی......البتہ علامہ مودودی صاحب نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک خلافت اور دوسرا ملوکیت۔ ان کی کتاب کا نام ہے خلافت و ملوکیت۔ کتاب کے نام سے پتہ چلتا ہے اسلام کے دو حصے ہیں ایک خلافت کا دوسرا ملوکیت کا۔ کتاب کا نام اسلام نہیں ہے! یہ دو لفظی نام رکھنے کا مطلب تو یہی ہے کہ اسلام دو حصوں میں بٹ گیا۔

ب اسلام کو نقطۂ معراج سے مقام تنزل تک پہنچنے کے لیے لگے ہیں پچاس سال اور ان کا نصف ہے پچیس سال محمد کے ساتھ یزید کی آمد کو لگے پچاس سال' نصف ہے پچیس سال۔ اب اس نصف مدت کے نقطے کا نام ہے جنگ جمل' جنگ جمل سے اوپر خلافت' جنگ جمل سے نیچے ملوکیت۔ اوپر کا حصہ خلافت راشدہ کا یعنی راشدوں کا حصہ بہترین حصہ' نیچے کا حصہ بدترین حصہ ملوکوں کا حصہ۔ درمیان میں ہے جنگ جمل۔ اب درمیانی نقطے کو بخاری شریف نے عجیب انداز میں بیان کیا ہے' بخاری والا کہتا ہے جنگ جمل کے بعد سارے مسلمانوں نے علی کے پیچھے جمعہ پڑھا (راوی ہے حسین نامی شخص) راوی کا کہنا ہے کہ ادائیگی نماز کے بعد میرے ساتھ بیٹھے ایک شخص نے مجھے کہنی ماری اور مجھے متوجہ کیا تو میں نے پوچھا کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا: آج جس طرح اس شخص نے نماز پڑھائی ہے تم نے نوٹ کی ہے

تمہیں کچھ اعتراض ہے؟ کہنے لگا کوئی اعتراض نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ پیغمبرؐ کو اس دنیا سے گئے پچاس سال ہو گئے۔ آج پچیس سالوں کے بعد اس شخص نے وہی نماز پڑھائی ہے جو محمدؐ پڑھایا کرتے تھے اس عرصہ میں یہاں ہم سو گئے یا نماز کہیں چلی گئی تھی..........نعرۂ حیدری۔

لفظ یہ ہیں بخاری شریف کے ذَکَّرُ نَا هٰذَا الرَّجُلُ صَلٰوۃَ الرَّسُوْلَ اللّٰهِ آج اس شخص نے ہمیں محمدؐ کی نماز یاد کرا دی ہے حالانکہ اس سے پچیس سال پہلے اسلام کا حسین دور تھا اس حسین دور میں نماز وہ نہیں رہی تو آخری پچیس سال کے برے دور میں بھلا اسلام کا کیا بچ گیا ہوگا؟

کتنا عظیم نقصان ہوا اسلام کا لیکن چور نہیں پکڑا گیا کہ کس نے یہ دن دکھائے ہیں' کس نے یہ غلطی کی ہے۔

ایک درخت کی پچاس شاخیں ہیں' بہترین سایہ بہترین پھل' تمام دنیا اس کے سائے میں بیٹھتی ہے۔ ایک آدمی آ کر یہ پچاس کی پچاس شاخیں کاٹ دے تو وہ چور کس طرح نہیں پکڑا جائے گا؟ یقیناً سارے لوگ اسے لعن طعن کریں گے کہ اے بدبخت تم نے کیا کیا ہے' اکٹھی پچاس شاخیں کاٹ دی ہیں تم نے!

لیکن صاحبان عقل کہتے ہیں کہ جب چور چوری کرتے ہیں تو عموماً احمق پکڑے جاتے ہیں اور ذہین و زیرک بچ نکلتے ہیں' سیانے فرزانے خود نہیں پکڑے جاتے بیوقوفوں کو پکڑا دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی سمجھدار آدمی یہ کام کرے اور پکڑا بھی نہ جائے تو یقیناً وہ پچاس شاخیں ایک دم نہیں کاٹے گا۔ یقیناً یوں ہوا کہ ایک شاخ کاٹی اور اس کی جگہ شاخ پیوند کر دی اور جواز یہ دیا کہ ہے تو بدعت لیکن خوبصورت ہے۔ لوگوں کو تسلی دے دی پریشان نہ ہونا شاخ اس لیے بدلی ہے اور پیوند کاری اس

لیے کی ہے کہ اس شاخ کا پھل پہلے سے اچھا ہوگا۔ ایک شاخ بدل دی رائے عامہ کو ہموار کر لیا کہ خوبصورت شاخ ہے۔ اگلے سال ایک اور شاخ کاٹ کر نئی شاخ لگا دی۔ تیسرے سال ایک اور شاخ پیوند کر دی۔ پچاس سال تک اگر ایک ایک شاخ پیوند ہوتی رہے تو پچاس سال کے بعد یہ درخت وہی رہے گا یا نیا درخت بن جائے گا..........؟

تنا وہی شاخیں سبھی بدل گئیں۔ اب یزید کے دور کے آنے تک' یزید کے دور کا نوجوان کیا جانے کہ یہ شاخیں محمدیت کی ہیں یا راشدیت کی۔

اب حسینؑ واحد معالج ہے اسلام کا' واحد ڈاکٹر ہے کہ جس نے اسلام کو بیمار ہوتا دیکھا' اسلام کی پیوندکاری ہوتے دیکھی' اسلام کی شاخیں بدلتے دیکھیں۔

اللہ نے حسینؑ کی صورت میں اسلام کو ایسا معالج عطا فرمایا کہ کسی کو ملا ہوگا نہ ملے گا۔ جس ڈاکٹر کے سامنے مریض کبھی بالکل تندرست تھا آج وہ سخت بیمار ہے' حسینؑ نے اسلام کو عظمت کے دور میں بھی دیکھا' جبریلؑ کو آتے دیکھا' قرآن پڑھتے دیکھا' پیغمبر کو بیان کرتے دیکھا' محمدؐ کی گود میں بیٹھ کر اسلام کا عروج اور اسلام کا بول بالا دیکھا اور پھر پیغمبرؐ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اسلام کی کسم پرسی دیکھی' بے احتیاطیاں دیکھیں' شاخ تراشیاں دیکھیں' پیوند کاریاں دیکھیں...... اسلام کی دونوں حالتیں حسینؑ کی چشم دیدہ ہیں۔ حسینؑ سمجھتے تھے اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس کو روبصحت کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ حسینؑ کا اسلام پر بہت خرچ ہوا تھا' حسینؑ کے اجداد کی قربانیوں سے پھلا پھولا تھا اسلام۔ جس کا خرچ نہ ہوا ہو اسے کیا درد؟ میرا گھر جلتا ہوگا تو احساس مجھے ہوگا دنیا تو تماشا دیکھے گی۔ اسلام پر جس کا خرچ ہوا ہے حسینؑ کو معلوم ہے۔ ہر تاریخ بتاتی ہے کہ کسی تحریک کو بچانے

کے لیے خون لگتا ہے یا پیسہ لگتا ہے۔ اسلام پر دونوں خرچ ہوئے ہیں۔ خون بھی پیسہ بھی، حسینؑ سمجھتے ہیں کہ خون بھی میرے گھر کا خرچ ہوا ہے پیسہ بھی میرے گھر کا لگا ہے۔ حمزہ کا جگر میرا خون ہے، جعفر طیار کے بازو میرا خون ہیں۔ علیؑ کے سر کا خون میرا خون ہے، حسنؑ کے جگر کے ٹکڑے میرا خون ہیں۔ زہراؑ کے پہلو کا زخمی ہونا میرا خون ہے، میرے نانا کے دندان مبارک کا شہید ہونا میرا خون ہے۔ خون لگا ہے تو میرے گھر کا اور خدیجہ کی دولت لگی ہے وہ بھی میرے گھر کی سارا خرچ میرے گھر کا ہوا ہے۔

اسلام بیمار پڑتا ہے حسینؑ نے حوصلہ دیا ہے اسلام فکر نہ کر تجھے بچاؤں گا۔ تجھے دوبارہ زندہ کروں گا۔ لیکن حسینؑ سمجھتا ہے کہ یہ صرف مرد کے بس کا روگ نہیں اسلام میں عورت نصف کی حصہ دار ہے۔ خدیجہ ابو طالبؑ کے ساتھ حصہ دار، زہرا علی کے ساتھ حصہ دار مرد کے ساتھ ساتھ عورت اسلام کی ترقی کے لیے شانہ بشانہ چلتی ہے۔ اسلام کے لیے میں اکیلا کیوں چلوں۔ ابو طالب اور علیؑ کی دستار میرے سر پر اور خدیجہؑ اور زہراؑ کی چادر زینبؑ کے سر پر۔ یہ دونوں بہن بھائی اسلام کو نئی زندگی دینے کے لیے کمر ہمت باندھ کر چل دیئے۔

قربان اس بہن بھائی کی عظمت پر۔ پیغمبرؐ نے تیئس سال میں اسلام کو نقطہ عروج پر پہنچایا۔ اور حسینؑ نے ارادہ کیا کہ قریب المرگ اسلام کو از سر نو زندگی دوں۔ اور اس طرح سے دوں کہ آنے والی نسلوں پر واضح ہو جائے کہ محمدی اسلام کونسا ہے اور یزیدی اسلام کون سا ہے۔ دونوں بہن بھائی مدینے سے چلے، تیئس سال نہیں لگائے تیئس مہینے نہیں لگائے، تیئس ہفتے نہیں لگائے، تیئس دن نہیں لگائے، تیئس گھنٹے نہیں لگائے، صرف چھ گھنٹے لگائے ہیں۔ دن طلوع ہوا ہے اور ڈھلا ہے،

بہن بھائی نے اسلام کا سارا نقصان پورا کر دیا ہے۔

اجو کم الی اللہ۔

تیئس سال پیغمبرؐ نے کتنا خرچ کیا ہے۔ خونی خرچہ کتنا ہے، مالی خرچہ کتنا ہے آج بہن بھائی نے گھر بیٹھ کر خرچہ تقسیم کر لیا ہے۔ خونی خرچہ حسینؑ کے ذمے، مالی خرچہ زینبؑ کے ذمے۔ اس لے کہ خون مردوں کی ذمہ داری ہے دولت کا خرچہ عورت کے ذمہ۔ بہن بھائی دونوں نے یہ خرچہ تقسیم کر لیا اور یہ خرچہ چھ گھنٹوں میں پورا کر دیا۔ جتنا خرچ پیغمبرؐ نے تیئس سال میں کیا تھا انہوں نے چھ گھنٹوں میں کیا۔ پیغمبر نے خونی خرچہ کتنا کیا؟ پہلا خونی خرچہ جو پیغمبر نے ہاشمی خون سے کیا وہ ہے جناب حمزہ کا جگر، جنگ احد میں ...... اس کا متبادل حسینؑ نے پہلا خرچ میدان کربلا میں علی اکبرؑ کا جگر کیا۔ آخری ہاشمی خون جو پیغمبر اسلام نے قربان کیا وہ ہیں جنگ موتہ میں جعفر طیار کے بازو۔ حسینؑ نے آخری ہاشمی خون جو کربلا میں دیا وہ ہیں عباسؑ کے بازو! پیغمبر نے چھ مہینوں کا بچہ کوئی نہیں دیا تھا حسینؑ نے بڑھ کر خرچ کیا ہے۔ چھ مہینوں کا بچہ بھی قربان کر دیا۔

خدیجہ نے اسلام کو دولت دی ہے چادر نہیں دی۔ زینبؑ خدیجہؑ سے بڑھ گئی۔ خدیجہؑ نے زیور دیئے۔ زینبؑ نے زیور دیئے۔ زینب نے اسلام میں ایسی دولت خرچ کی اسلام کی ضمانت کی بقا بن گئی فرمایا جب تک میری چادر چھن جانے کا تذکرہ رہے گا یزید پر لعنت ہوتی رہے گی۔

جب تک میری چادر کا سایہ ہے یزیدیت کہیں کامیاب نہیں ہوگی۔ میں قربان جاؤں اس بہن بھائی کی ہمت پر...... خدا گواہ ہے کہ لوٹ کا لفظ کہنا آسان ہے لٹانا بہت مشکل .... قربانیوں کا نام لینا آسان ہے قربان ہونا بہت مشکل۔

قربانی کا تذکرہ آسان قربان ہونا بہت مشکل قربان ہونا حسینؑ کے جوانوں سے سیکھو۔ حسینؑ کے پاس وہ جوان ہے جس پر جوانی کو بھی ناز ہے۔ حسینؑ کا خوبصورت بیٹا' جس کا نام علی اکبرؑ ہے ...... نوجوانو! علی اکبرؑ کی جوانی کی قسم خدا کرے تمہاری مائیں تمہاری جوانی کی چھاؤں تلے بیٹھیں۔ بڑی خوش قسمت ہے وہ ماں جو جوان بیٹے کے سائے تلے بیٹھ سکے۔ کس طرح کی ماں ہے علی اکبرؑ کی' جوان ہونے کا موسم بھی آیا تو موت پر کھول کر آ گئی .... علی اکبرؑ کی ماں تمہاری اپنی قسمت۔ اتنی خوش قسمت ماں ہے علی اکبرؑ کی .... مدینے میں حسینؑ کرسی پر بیٹھے ہیں' نوجوان ادھر ادھر پہرے دار بنے مستعد اور مؤدب کھڑے ہیں' کچہری لگی ہوئی ہے' مولاؑ کی تقریر ختم ہوئی تو عباسؑ کھڑے ہوئے اور کہا: میرے چاند اکبرؑ! .... اکبرؑ نے جواب دیا:

جی چچا جان! فرمایا:

آؤ اکبرؑ میں تمہیں مدینے کی گلیوں کی سیر کرواؤں۔ تم نے مدینے کی گلیوں کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا .... اندازہ کیجئے بنی ہاشم کا بستا ہوا گھر۔ عباسؑ کے ہاتھ میں علی اکبرؑ کا ہاتھ' گھر کے دروازے سے نکلے تو ایک ہاتف غیبی کی آواز آئی:

مدینے کی مستورات! کاروبار چھوڑ دو' گھر کی چھتوں پر چڑھ کر دیکھو حسینؑ کے گھر سے دو چاند بیک وقت طلوع ہو رہے ہیں .... اندازہ نہیں ہو سکتا کہ لیلیٰ کا چاند خوبصورت ہے یا ام البنین کا' ایک چہرے پر جمال محمدؐ ہے دوسرے پر جمال حیدرؑ۔ علی اکبرؑ جمال محمدی کا آئینہ' عباسؑ جمال حیدری کی تصویر۔ مائیں اپنے بچے نہ بھول جائیں' لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے خوبصورت کون ہے؟

وہ منظر بھی دیکھئے!

زینبؑ خاتون محو مطالعۂ تفسیر ہوتی اُدھر علی اکبرؑ کی ماں اندر داخل ہوتی تو مریم کبریٰ تفسیر قرآن بند کر کے رکھ دیتیں' اردگرد بیٹھی خواتین سے بھی کہتی تھیں' اور خود بھی اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں کہ میرے چاند علی اکبرؑ کی ماں آ رہی ہے' تعظیم کے لیے کھڑی ہو جاؤ ہم شکل پیغمبرؐ کی ماں آ رہی ہے۔

لیکن اب کون سا وقت ہے کہ کوئی تعظیم کے لیے اُٹھے۔ بڑا وقت تھا حسینؑ کی ماں پر۔ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ بڑا وقت تھا علی اکبر کی ماں پر کیونکہ جس ماں کا بیٹا جوان ہو جائے وہ میکے اور سسرال کی تکلیفوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور فوراً کہتی ہے مجھے کسی کی کیا پروا میرا تو بیٹا جوان ہو گیا ہے؟

لیلیٰ پر بڑا وقت تھا اور بیٹا بھی چاند جیسا محمدؐ عربی کی شکل والا۔ لوگ کہتے ہیں شیعہ روتے کیوں ہیں' میں کہتا ہوں اس طرح نہ کہا کرو شیعہ روتے کیوں ہیں بلکہ یہ کہا کرو کہ شیعہ جیتے کیوں ہیں؟ یہ نہ کہا کرو کہ یہ ماتم کیوں کرتے ہیں بلکہ یہ کہا کرو کہ یہ خوش کس طرح ہیں؟

خدا جانتا ہے کسی کا گیا کچھ نہیں ہمارا رہا کچھ نہیں' علی اکبرؑ کی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی ......!

آج سے چند سال پہلے کا واقعہ سب کو یاد ہوگا ہمارے ۹۳ ہزار قیدی تھے بھارت میں۔ خدا گواہ ہے وہ اڑھائی سال اُدھر قید رہے ہیں اور ان کی ماؤں نے اُدھر عید نہیں کی۔ اُدھر ایک کو گولی لگتی تھی اِدھر ۹۳ ہزار ماں کا کلیجہ پھٹ جاتا تھا۔ حالانکہ وہاں لگتی گولی ماں کو نظر بھی نہیں آ رہی تھی اور پھر بھی ماں تڑپ تڑپ کر مر رہی تھی .... کتنا عظیم جگر ہے اس ماں کا جو دیکھتی رہی ہے اور بیٹا قتل ہوتا رہا ہے۔

کتنا عظیم گردہ ہے علی اکبرؑ کی ماں کا' دسویں کے ڈھلتے ہی ماں کے دروازے پر آن کھڑا ہے علی اکبرؑ۔ اماں سلام ارے کتنی خوش نصیب ہے علی اکبرؑ کی ماں جس کو محمدؐ کی شکل والا جوان بیٹا سر جھکا کر کہتا ہے:

اماں سلام !..........

تڑپ کر اٹھی ہے لیلیٰ! بیٹے کو سینے سے لگایا' بیٹے کا ماتھا چوما آؤ میرے چاند بیٹے' کتنی مدت کے بعد میرے دروازے پر آئے ہو۔ آؤ مسند پر بیٹھو۔ علی اکبرؑ نے عرض کیا: اماں آج بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں' ضروری کام کے لیے آیا ہوں۔ علی اکبرؑ نے عرض کیا کہ میری زندگی کی اٹھارہ بہاریں گزر چکی ہیں' میں نے آج تک آپ کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ لیکن آج دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میری زندگی کا آخری دن ہے اس لیے کچھ مانگنے آیا ہوں۔ ماں نے کہا: میں تو منتیں مانتی پھرتی ہوں کہ تم مانگو اور میں دوں! شہزادے نے کہا: بہت مشکل چیز مانگنے آیا ہوں۔ بی بی نے فرمایا:

میں بتولؑ کی بہو ہوں' مجھے مشکل کا کیا خوف' جو دل چاہتا ہے مانگو ....شہزادے نے کہا: اماں! جگر پر ہاتھ رکھو! بی بی نے فرمایا:

مجھے ہاجرہ سمجھ رہے ہو کہ جگر پر ہاتھ رکھوں۔ شہزاد نے عرض کیا چلیں اور کچھ نہیں مانگتا صرف موت کی اجازت چاہتا ہوں...... اندازہ کیجئے گا! بی بی نے فرمایا: تم نے اجازت مانگی میں نے دے دی۔ یہ ہے حوصلہ بتولؑ کے لہو کا۔ شہزادے نے کہا: اماں چلا جاؤں' ماں نے کہا: اتنی جلدی نہ کیجیو! موت تم نے بہت جلدی میں مانگی ہے البتہ روانہ میں اپنی مرضی سے کروں گی۔

شہزادہ کہتا ہے: بابا میدان میں اکیلے ہیں۔

بی بی فرماتی ہیں! مجھے تمہارے بابا کی تنہائی کا احساس ہے' دیر نہ کروں گی۔ آخر میں تمہاری ماں ہوں اور تمہاری زندگی کا پہلا اور آخری سوال ہے تمہیں روانہ کرتی ہوں۔ مجھے کچھ تو جاؤ چاہت کر لینے دو۔

شہزادے نے کہا: اماں جیسے آپ کی مرضی۔

بی بی نے فرمایا:

فضہ جاؤ دروازے پر کھڑے میرے چاند اکبرؑ کے نوکر سے کہو آج تک جب بھی میرا چاند گھوڑے پر سوار ہوا ہے کوچ میں ہاتھ بھی تم نے ڈالا ہے اور رکاب بھی تم نے پکڑی ہے لیکن آج میرے بیٹے کی آخری سواری ہے' گھوڑا تیار کر کے اندر بھیج دو۔ آگے ماں جانے اور بیٹا جانے۔ گھوڑا اندر آیا تو بی بی نے باگ پکڑی' جوان بیٹے کے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی بسم اللہ میرا چاند' بسم اللہ میرا چاند...... بی بی نے رکاب میں ہاتھ ڈالا' کوچ دبایا اور علی اکبر بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوا۔ بی بی نے لگام بیٹے کے ہاتھ میں دی۔ بیٹے نے عرض کیا: اماں اب چلا جاؤں۔ ماں نے کہا:

بیٹے اتنی جلدی نہ کرو۔ ایک دفعہ باگ تھامو! میں ایک کام کر لوں......

اب رونے سے شرم نہ کیجئے گا جہاں جہاں بیٹھے ہو لیلیٰ کے چاند پر نظر رکھنا...... لیلیٰ خاتون جب سے سیدوں کے گھر میں آئی ہے' اکبرؑ بھی اٹھارہ سال کے ہو گئے لیکن لیلیٰ نے آج تک اپنے دیور عباسؑ کو نہیں دیکھا۔ شرم و حیا کی منزل کا اندازہ کیجئے۔ آج تک خاوند کے بھائی عباسؑ کے ماتھے نہیں لگی۔ کام کیا کیا بی بی نے؟

برقعہ پہن کر' ایک خیمے سے دوسرے خیمے' دوسرے خیمے سے تیسرے خیمے ہوتی ہوئی عباسؑ کے خیمے تک پہنچی۔ اُدھر عباسؑ کا چھوٹا بیٹا اس خیال سے باہر نکلا کہ جا کر میدان کا حال معلوم کروں۔ باہر نکلتے ہی چچی کے برقعے پر نظر پڑی تو فوراً

پیچھے مڑا۔

عباسؑ نے فرمایا:

بیٹا جلدی کیوں لوٹ آئے؟

عرض کرنے لگا:

بابا قیامت آنے والی ہے۔

(خدارا شرم کرکے نہ روئیں۔ تمہاری لاکھ جوانیاں لیلیٰ کے بیٹے کے قدموں پر قربان ...... علی اکبرؑ کے بعد تو جوانی جوانی ہی نہیں رہی)

بابا قیامت آنے والی ہے۔

عباسؑ نے پوچھا: کیسی قیامت؟ ...... بیٹے نے عرض کیا: بابا!

آج وہ بی بی ہمارے خیمے میں چلی آ رہی یہ جو کبھی نہیں آئی۔

عباسؑ فرماتے ہیں کون؟ شہزادہ عرض کرتا ہے۔ چچی لیلیٰ! لیلیٰؑ کا نام سننا تھا کہ عباسؑ کانپ گئے۔ پگڑی کے پیچ گلے میں آن گرے اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہاتھوں کا سہارا لے کر اُٹھے پگڑی سنبھل سکی نہ نعلین۔ دروازہ خیمہ پر پہنچے تو لیلیٰ کے برقعے پر نظر پڑی۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا' نظر کمزور محسوس ہونے لگی......... عرض کرنے لگے: میری شہزادی! کنیز کو بھیج کر دروازے پر بلالیتیں۔ آپ نے خود کیوں تکلیف کی؟

بی بی نے روتے ہوئے جواب دیا: عباسؑ آج مجھے شہزادی نہ کہو۔ میرے شہزادی ہونے کا دور گزر گیا۔ میرا بخت اقبال ڈھل گیا ہے' میرا زہراؑ سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ آج میرا حسین بھیگتے چہرے والا جوان موت کی طرف جا رہا ہے۔ تمہاری طرف اس لیے چلی آئی ہوں کہ میرا بیٹا ہے اور تمہارا شاگرد ہے' تم میرے

صحن خانہ میں چلو اور میرے بیٹے کو تھپکی دے کر خود روانہ کرو۔

بی بی تمہاری ہمت پر قربان .... ادھر بیٹے کے الوداع کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ عباسؑ نے تھپکی دے کر اجازت دی۔ ماں پھر متوجہ ہوئی .... اکبرؑ نے کہا اماں جان چچا نے اجازت دے دی ہے۔ اب آپ بھی اجازت عطا فرمائیں۔

شہزادی کہنے لگیں: میں کون سا روک رہی ہوں۔

بڑے خیمے کی طرف چل دیں' زینبؑ عالیہ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کرنے لگیں۔ میری شہزادی! عون کی ماں! جس کو اٹھارہ سال تو نے پالا ہے آج مجھ سے موت کی اجازت مانگ رہا ہے۔ یہ علیؑ اکبرؑ کی ماں کا ہی حوصلہ تھا کہ بیٹے کی زبان سے موت کا نام سن کر سہہ گئی اور کہہ دیا بیٹے تو نے اجازت مانگ لی میں نے دے دی۔ تمام بیبیاں علی اکبرؑ کی وجہ سے جناب لیلیٰ کی عزت کرتی تھیں' پس اندازہ کیجئے کہ کیسی باہمت تھی یہ ماں جس نے اپنی متاع حیات اور سرمایہ زندگی بھی اکبرؑ جیسا نوجوان فرزند قربانی کے لیے پیش کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان عصمت کی شہزادیاں معرفت کے کس زینہ پر فائز تھیں۔ خدا جانے حسینؑ نے اپنے نوجوان فرزند کی لاش کس طرح اُٹھائی ہوگی اور دکھیاری ماں نے کس طرح اپنے بیٹے کی نورانی شکل کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا ہوگا۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ کسی شہید کے لیے پردہ داروں نے خیموں سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن علی اکبرؑ کے گھوڑے سے گرنے کی خبر سن کر غالباً سب سیدانیاں خیموں سے نکل کھڑی آئیں حتیٰ کہ زینبؑ عالیہ لاش پر بھائی سے پہلے پہنچیں اور امام نے ان کو خیمے تک واپس کیا' اندازہ کیجئے کہ اس قدر زبردست صدمہ تھا کہ حضرت زینبؑ خاتون سے جب نہ رہا گیا تو باقی بیبیاں کیسے خیموں میں آرام کر

سکتیں تھیں خصوصاً اس ماں کو کب آرام آتا ہوگا جس کی زندگی کا سہارا علی اکبرؑ تھا اور جس بی بی سے آلِ رسولؐ سے رشتہ علی اکبر کی موت کی وجہ سے ختم ہو رہا تھا۔ ہائے حسینؑ ......

❀......❀......❀

مجلس پنجم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ.

سامعین محترم!

میں نے قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت آپ حضرات کے گوش گزار کی ہے الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ۔ الم حروف مقطعات قرانیہ جن کی صحیح تفسیر و تفصیل عالم کل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ متعدد مقامات پر حروف مقطعات پیش کیے گئے ہیں۔ عام مفسرین یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ الفاظ بطور چیلنج کے ہیں۔ یہ حروف مقطعات اس لیے رکھے گئے ہیں کہ تم کافر جو یہ اعتراض کرتے ہو کہ یہ کلمات محمدؐ پر وحی نہیں بلکہ ان کے اپنے مرتب کردہ ہیں تو ان حروف سے تم بھی سورتیں مرتب کرتے اور تمہارا اس کے مقابل نہ بنا سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محمدؐ کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ کا بنایا ہوا ہے...... یعنی یہ حروف تحدی ہیں اور چیلنج کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ متعدد سورتوں میں حروف مقطعات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ استعمال ہوئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ 14 حروف ہیں اور ان کو علم جفر کی اصطلاح میں حروف ناطقہ کہا جاتا ہے' ان کے مقابلے میں جو 14 حروف مقطعات کے طور پر استعمال نہیں ہوئے ان کو حروف صامتہ کہا جاتا ہے۔ اب اگر ان حروف ناطقہ کی کوئی بامعنی تعبیر ہو سکتی ہے یا بن سکتی ہے تو وہ ایک ہے'

صَرَاطُ عَلیٍ حَقًّا مستقیم یَاعَلِیُّ صِرَاطُ حَقٍ مستیم یَاعَلِیُّ صِرَاطُ حَقٍّ مستقیم صِرَاطُ عَلِیٌّ حَقٍّ نمسکه یَاعَلِیُّ صِرَاطُ حَقٍ نمسکه۔

علیؑ کا راستہ حق ہے ہم اسے توسل پکڑتے ہیں' یا علیؑ خود صراط حق ہے جس سے ہم توسل پکڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ بامعنی فقرہ ان حروف سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب جفر دانوں نے ان حروف مقطعات کے جو خواص بتائے ہیں وہ دوسرے حروف سے حاصل نہیں ہیں۔ آل محمدؐ علم جفر کا ایک بیش بہا خزانہ چھوڑ گئے۔ حضرت صادقؑ فرماتے تھے۔ میرے پاس وہ جامع ہے جس میں اولین و آخرین کے اسمٰی ہیں......... ایک بار امام حسنؑ شام سے مدینہ کی طرف تشریف لائے مدینہ میں پہنچ کر کتابوں کے انبار پر محیط ایک ورق آپ کے پاس تھا کسی نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''یہ جامع جفر ہے''

اس نے عرض کیا:

''حضور اس میں کیا ہے؟''

آپؑ نے فرمایا:

اس میں قیامت تک آنے والے شیعوں کے نام ہیں اس نے عرض کیا: کیا

''حضور اس میں میرا نام بھی ہے؟''

آپ نے فرمایا: ''تیرا نام بھی ہے'' دوسرا ساتھی جو کہ اس کے ساتھ تھا اس

نے کہا ''میرے متعلق بھی پوچھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا'' اس کا نام بھی ہے'' اس نے عرض کیا: ''حضور اگر اجازت ہو تو ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی دیکھ لیں'' جب دیکھا تو ان کے نام بھی موجود تھے۔ آپ نے فرمایا:

''اس میں تمہارے اور قیامت تک آنے والے موالیوں کے نام درج ہیں اور اس میں ہمارے دشمنوں کے نام بھی ملتے ہیں .... یہ وہ علوم ہیں جن پر آل محمدؐ حاوی ہیں .... حروف مقطعات قرآنیہ کے متعلق جو تفصیل مفسرین نے بیان کی ہے وہ کچھ یوں ہے ''الف'' سے مراد اللہ کی طرف اشارہ ہے۔ ل جبریلؑ کی طرف اشارہ ہے اور حرف محمدؐ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ قرآن براہ راست جبریل نے محمدؐ کی طرف پہنچایا۔ یا یہ کہ اس ل سے مراد اللہ اور م سے مراد عالم یعنی ان اللہ عالم ان حروف کی تفسیر حقیقی اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ بھی ایک معنی کیا گیا ہے بعض لوگوں میں حروف تہجی کے اعتبار سے عرف عام میں تفسیریں ملی ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حروف مقطعات بطور قسم کے استعمال ہوئے ہیں یعنی اللہ فرمانا چاہتا ہے کہ مجھے الف کی قسم' لام کی قسم' م کی قسم' اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ یعنی کتاب کے لاریب ہونے پر اللہ نے قسم کھائی ہے۔ اور یہ قسم یعنی قرآن مجید سارے کا سارا قابل قسم ہے۔ یا یوں کہئے کہ اللہ نے حلفیہ بیان سے قرآن کو شروع کیا! ''میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اب جبریلؑ کی زبان سے نکلا تو یہ حلفیہ جملہ اور محمد مصطفیٰؐ کی زبان پر سب سے پہلے آیا تو بھی حلفیہ جملہ یعنی جبریلؑ نے کہا! الف' ل' م (الم) کی قسم اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ پھر جس جس کان تک یہ کلمات پہنچے اور پھر ان کی زبان سے یہ جاری ہوئے تو پہلے پہلے قرآن سے انسان کی زبان پر جملہ آتا ہے الم کی قسم! اس میں کوئی

شک نہیں الف کی قسم' ل کی قسم' م کی قسم' اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ پھر جس جس کان تک یہ کلمات پہنچے اور پھر ان کی زبان سے یہ جاری ہوئے تو پہلے پہلے قرآن سے انسان کی زبان پر جملہ آتا ہے الم کی قسم اس میں کوئی شک نہیں۔ الم سے جو بھی مراد ہے وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جن کی قسم کھانا انسان کو سزاوار ہے۔ یعنی انہی حروف کی قسم کے بعد یہ مراد ہے کہ الف سے اللہ "ل" سے علیؑ اور "م" سے محمدؐ۔ اللہ محمدؐ علیؑ کی قسم اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ بہر صورت جس طرح امام بیان فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے جب مسلمانوں کے سامنے یہ کتاب آئی تو ہر پڑھنے والا کہتا ہے کہ جس کتاب کو میں پڑھوں گا پہلے حلفاً کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ گویا جو اللہ اور محمدؐ و علیؑ " کا حلف نہیں دے سکتا وہ قرآن کو پڑھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ (نعرۂ حیدری)

اور جس کے بعد پروردگار نے چیلنج بھی کر دیا میرا تو حلفیہ بیان کہ اس میں کوئی شک نہیں لیکن:

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ
مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ قُوْلُوْا شُهَدَآ۔

فرماتا ہے "کہ کچھ شک نہیں اس میں اور میں حلفیہ کہتا ہوں کہ یہ کتاب سچ ہے لیکن اے منکرین نبوت اور منکرین کتاب اگر تمہیں اس کتاب کے نازل من اللہ ہونے میں کوئی شک ہے تو بے شک اپنے آپ کو آزمالو:

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا۔

جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے اسمیں اگر تمہیں کوئی شک ہے تو آزمالو اور اس کا حل صرف یہی ہے کہ تم بھی ایسی ہی سورتیں بنا لاؤ۔ یہ کتاب

لانے والا ظاہری طور پر تمہارے ہی قبیلے میں سے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ تمہارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ تمہاری ان گلیوں میں چلا پھرا ہے اور وہی زبان بولتا ہے جو تم بولتے ہو اور کسی سکول میں بھی نہیں گیا مگر پھر بھی ایسی بے مثل کتاب لایا ہے اور اگر تمہیں شک ہے کہ یہ اس نے خود بنائی ہے تو پھر تم بھی اس جیسا ایک سورہ بنا لاؤ۔ ساری کتاب نہ سہی ایک سورہ ہی بنا لاؤ۔ ایک مقام پر ہے ایک سورہ ہی نہیں ایک آیت ہی بنا لاؤ۔ اگر یہ اپنا پورا قرآن بنا سکتا ہے تو تم ایک سورہ کیوں نہیں بنا سکتے۔ تمہارا ایک سورۃ کا نہ بنا سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب بھی اس کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ خالق کی بنائی ہوئی ہے اور اس پر نازل کی گئی ہے۔ پھر فرمایا صرف مکہ والے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں جتنے بھی تمہارے ہم خیال ہیں اور تمہاری مدد کر سکتے ہیں ان سب کو بلالو اور مل جل کر بھی اس جیسا ایک سورہ بنا لاؤ۔ وہ جس طرح ایک کتاب لا سکتا ہے تم ایک سورۃ کیوں نہیں لا سکتے...... چنانچہ یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب اس کا اپنا کلام نہیں اس کے خالق کا کلام ہے۔

اس کے بعد اللہ رب العزت نے فرمایا:

اور اگر تم اس کے مقابلے میں ایک سورہ بھی نہ لاسکو اور یقیناً نہ لاسکو گے تو فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا الناس والحجارة تو پھر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اور پھر ارشاد رب العزت ہوا:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ○ اِنَّ
شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ○

ایک شخص جو اس وقت کے شعراً میں بلند مقام رکھتا تھا اس نے ان تین

جملوں کے نیچے صرف ایک جملہ لکھا مَا هٰذَا كَلَامُ بَشَرٍ کہ یہ انسان کا کلام ہے ہی نہیں۔ تو انہوں نے مقابلہ نہ کر سکنے کے بعد یہ اعتراف کر لیا کہ یہ کلام واقع ہی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ محمدؐ کا کلام نہیں ہے۔ (صلوٰۃ)

سامعین محترم!

اب اس سے تھوڑا سا آگے کہ یہ کلام کسی آدمی نے اللہ سے نہیں سنا۔ اللہ زبان سے پاک ہے اور کسی آدمی نے یہ کلام جبریلؑ سے بھی نہیں سنا۔ ہاں اگر سنا ہے تو محمدؐ کی زبان سے سنا ہے۔ حالانکہ یہ کلام نکلا محمدؐ کی زبان سے ہے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ یہ اس کا کلام نہیں ہے میرا کلام ہے۔ جب کہ بولنے والی محمدؐ کی زبان ہے۔ سب سے پہلے یہ کلام زبان محمدؐ ہی سے جاری ہوا۔ پیغمبر اسی زبان سے اور باتیں بھی کرتے رہے' ان کو قرآن نہیں کہا گیا' ان کو حدیث کہا گیا ہے۔ اور جب یہ باتیں کرے تو اس کو قرآن کہا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں محمدؐ کی زبان سے ہو رہی ہیں۔ قرآن و حدیث بھی۔ اب جو اللہ کا کلام محمدؐ کی زبان سے نکلا ہے اس کو حدیث کہنا کفر ہے حالانکہ دونوں نکلے زبان محمدؐ ہی سے ہیں۔ اب کیسے پتہ چلے گا کہ یہ قرآن ہے اور وہ حدیث ہے۔ جبریلؑ نے کبھی نہیں بتایا کہ یہ قرآن ہے اور وہ حدیث ہے اور نہ ہی رسول نے کبھی فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ میرا کلام ہے۔ بس ایک زبان سے بولے ہیں کسی کو شک و شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن محمدؐ نے خود فیصلہ فرما دیا اور واضح کر دیا کہ میرا کلام کون سا ہے اور اللہ کا کلام کونسا ہے۔ میرے کلام کو اللہ کا کلام کہنا غلط اور اللہ کے کلام کو میرا کلام کہنا غلط ہے۔ جبکہ دونوں طرف کلام کرنے والی زبان محمدؐ کی ہی ہے۔ (صلوٰۃ)

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ محمدؐ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت نہیں

ملی بلکہ وہ تو اپنے کلام اور کردار سے پہلے ہی اپنے کو صادق و امین منوا چکے تھے۔ تمام عرب والے یہ تسلیم کر گئے کہ محمدؐ کی زبان بھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ اب یہ ان سے منوانے کے بعد جو یہ کہے کہ لوگ مجبور ہو جائیں کہ یہ قرآن ہے تو جس کو حدیث کہے لوگ مجبوراً مانیں کہ یہ حدیث ہے۔ اس لیے کہ اس کی زبان غلط بولتی ہی نہیں۔ پہلے محمدؐ کی صداقت تسلیم کرائی۔ جب صداقت تسلیم ہو گئی تو قرآن بھیجا تا کہ اب کوئی شک نہ کرے محمدؐ جو کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ بلکہ جو کہے اس کو ماننا پڑ جائے کہ یہ کلام میرا (اللہ) کلام ہے اور یہ کلام اس کا اپنا (محمدؐ کا) کلام نہیں ہے۔

ایک دفعہ بدترین دشمن اسلام ولید بن مغیرہ کے سامنے اللہ کے رسول نے چند آیات پڑھیں اور اس سے پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے۔ ولید بن مغیرہ کہنے لگا چالیس سال تک یہ شخص ہم سے مخاطب رہا۔ میں نے اس کی زبان سے ایک نقطہ غلط نہیں سنا۔ اب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے تو میں کیسے شک کروں۔ اگر عرب والے یہ کہتے ہیں کہ ہم قریشی ہیں ہاشمیوں کو کیونکر اپنا سردار مانیں ہاشمیوں کے سامنے نہ جھکنا ہماری غیرت کا تقاضا ہے ورنہ عقل یہ کہتی ہے کہ جس نے چالیس برس تک جھوٹ نہیں کہا اب یہ جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ چنانچہ محمدؐ جو یہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے تو میں ماننے پر مجبور ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

(نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت، نعرۂ حیدری)

سامعین!

مقصد یہ تھا کہ محمدؐ کی صداقت کو منوایا جائے چالیس برس تک اعلان رسالت نہ کرانا اس لیے تھا کہ پہلے یہ تسلیم کروالیا جائے کہ محمدؐ صادق ہے اور جو بھی

کہتا ہے وہ سچ کہتا ہے۔ قرآن کو قرآن کہتا ہے۔ حدیث کو حدیث کہتا ہے.........
یہاں تک کہ قرآن کو قرآن کہنا اور حدیث کو حدیث کہنا یہ بھی محمدؐ کے فیصلے کا محتاج ہے کہ محمدؐ نے کہا یہ قرآن ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ یہ قرآن ہے۔ لہٰذا قرآن کو قرآن ماننے کے لیے سب سے پہلے محمدؐ کی زبان کو لاریب مانا جائے گا۔ اور اگر کسی شخص کو محمدؐ کی زبان پر شک ہے تو اس کا قرآن پر ایمان نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ قرآن کو قرآن کہنے والی زبان تو محمدؐ کی زبان ہے اور خداوند کریم نے چالیس سال تک اس زبان کو اعلان رسالت سے خاموش رکھا۔ اس لیے کہ لوگ اس کی صداقت کو تسلیم کرلیں۔ اب محمدؐ جس کو قرآن کہے گا وہ قرآن ہے اور جس کو محمدؐ کی زبان پر شک ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتاب خدا کافی ہے۔ کیونکہ جس زبان سے قرآن ہم تک پہنچا ہے اس پر شک کرنے والے کے لیے قرآن کیسے کافی ہوسکتا ہے۔ اللہ نے ہر انسان کے کان میں تو یہ نہیں پھونک دیا کہ یہ کتاب میری ہے بلکہ محمدؐ نے کہا کہ یہ کتاب اللہ کی ہے اور محمدؐ کی بات شک سے بالاتر تھی کہ جب آپؐ نے فرمایا:

"اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا تم مان لو گے"

تمام سرداران قریش موجود تھے وہ یک زبان ہوکر بولے کہ اگرچہ دور تک کچھ نظر نہیں آرہا لیکن آپ کی زبان پر اعتبار ہے ہم اپنی آنکھوں کو جھٹلا سکتے ہیں آپ کی زبان کو نہیں۔ اب اگر کوئی شخص مسلمان ہوتے ہوئے بھی زبان محمدؐ پر شک کرے تو وہ ان غیر مسلم کافر قریشیوں سے بھی بدتر ہے جنہوں نے کلمہ نہیں پڑھا لیکن یہ کہا کہ آپ کی زبان کو شک سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ (نعرۂ حیدری)

اسی لیے کہ قرآن کو قرآن کہنے والی زبان محمدؐ ہے گویا قرآن کو لاریب کہنے سے پہلے کلام محمد کو لاریب کہا جائے گا۔ بچپن سے لے کر آخر تک محمدؐ کے کلام کو لاریب کہنا پڑتا ہے اگر یہ لاریب نہیں تو قرآن کیسے لاریب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اسی زبان نے تو سب سے پہلے قرآن کو قرآن کہا۔ چنانچہ بچپن سے آخر تک محمدؐ کی زبان لاریب اور شک سے بالاتر ہے۔

اور جب تک محمدؐ کی زبان کو شک و ریب سے بالا نہ سمجھا جائے نہ قرآن پر ایمان مستحکم ہوسکتا ہے اور نہ حدیث پر ایمان مستحکم ہوسکتا ہے پس جس شخص کو محمدؐ کے فرمان پر یقین نہیں۔ تو وہ اگر حَسْبُنَا کَلَامَ اللّٰہ کہے تو وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ کتاب اللہ کو کلام اللہ کہنے والی زبان پر شک ہے اور اسی طرح اگر وہ سنت رسول سے تمسک کا دعویٰ کرے تو جھوٹا ہے کیونکہ قرآن سنت کو بیان کرنے والی زبان وہی ہے جس میں اسی کو شک ہے بلکہ ایسا شخص نہ سنی ہے نہ شیعہ بلکہ دشمن خدا اور رسول ہے۔ اور جناب فاطمۃ الزہراؑ کو مال کی کیا ضرورت تھی؟ وہ غالباً یہی مسئلہ سمجھانے کے لیے تشریف لے گئیں تھیں۔ کیونکہ ایک عالم گیر مشن کو چلانے کے لیے بہت بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس بی بی کے باپ نے ایک عالم گیر اسلام کی تحریک چلائی' اس کو اس کی اہمیت کا بخوبی علم تھا۔ البتہ جن لوگوں نے اس مشن کی سربراہی سنبھال رکھی تھی بی بی ان کے ایمان کا پردہ چاک کرنے گئیں تھیں' تاکہ لوگ ان کی باتوں کے دھوکہ میں نہ رہیں اور حقیقت واضح ہو جائے' رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اب دو چیزوں کے تعین میں اختلاف ہے کچھ لوگ قرآن و اہل بیت کا نام لیتے ہیں اور کچھ قرآن و سنت مراد لیتے ہیں' بی بی نے اپنے مقدمہ میں اپنے حق کے اثبات کے لیے قرآن کو پیش کیا۔ وَارِث

سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ سُلَیْمَانؑ داؤد کے وارث تھے۔ اور حضرت زکریا نے اپنے بیٹے کے لیے دعا کی۔ اے اللہ مجھے فرزند عطا فرما جو میرا وارث ہو۔

یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ۔

جب دیکھا کرسی والوں نے کہ حَسْبُنَا کِتَابَ اللّٰہِ کا دعویٰ ہمارے خلاف ہے اور اس سے پہلو تہی کی۔ تو بی بی نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں حسنینؑ شریفین کو بطور گواہ پیش کیا۔ اور علیؑ کو پیش کیا جو مباہلہ میں رسول اللہ کے گواہ تھے پس گواہیوں کو جھٹلایا گیا۔ تو قرآن و آلؑ کا انکار ہوا' پھر بی بی نے رسولؐ کی تحریر پیش کی۔ جس کی حیثیت سنت رسولؐ کی سی تھی تو اس کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا تو پھر قرآن و سنت کا انکار ہوا۔

پس بی بی واپس آئیں اور پورے اسلامی مجمع کو سمجھا کر آئیں کہ اگر کرسی اقتدار والے حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ کریں تو ان کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر قرآن و سنت کی اتباع کا دعویٰ کریں تو غلط ہے' اور اگر قرآن و عترت سے تمسک کا دعویٰ کریں تو غلط ہے' کیونکہ قرآن کو انہوں نے رد کیا۔ آل کی شہادت کو قبول نہ کیا اور تحریر پیغمبر کو ریزے ریزے کر کے سنت سے انحراف کر لیا۔ پس نہ ان کا قرآن پر ایمان ہے اور نہ سنت پر ایمان ہے اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن و سنت پر ایمان اس کا ہو سکتا ہے جو محمد مصطفیٰ ؐ کی زبان کو شک و ریب سے بالاتر سمجھے۔ خواہ جوانی میں بات کریں یا ضعیفی میں۔ سفر میں یا حضر میں' جنگ میں یا صلح میں' تندرستی کی حالت میں یا بیماری کے دوران۔

پس جو شخص ان کی جوانی کی بات میں شک کرے ایمان سے خارج'

جو ان کی ضعیفی کی بات میں شک کرے ایمان سے خارج'

جو ان کی تندرستی کی بات میں شک کرے ایمان سے خارج'

اور جو ان کی بیماری کے زمانہ کی بات میں شک کرے بے ایمان ہوگا'

ان کی تقریر پر شک کرے تو بے ایمان ہوگا'

ان کی تحریر میں شک کرے تو بے ایمان۔

ہم شیعہ لوگوں کا ایمان ہے زبان محمدؐ پر وہ جو کچھ فرمائیں دین ہے۔ جس کا حکم دیں وہ دین ہوگا' جس سے محبت کا حکم دیں وہ محبت دین اور جس سے بے زاری کا حکم دیں وہ بیزاری دین ہوگا لہٰذا ہماری محبت جذبات کے تابع نہیں محمد مصطفیٰؐ کے فرمان کے تابع ہے۔

دین و اسلام کے بہانہ سے کھانے والے تو آپ کو بہت ملیں گے لیکن دین کو دینے والے اور دین پر خرچ کرنے والے بہت کم ملیں گے' آل محمدؐ وہ خاندان ہے جس نے حسب ضرورت دین پر ہر دور میں خرچ کیا۔ محمد مصطفیٰؐ نے دین بچایا اور زندگی بھر دین پر خرچ کرتے رہے۔ دنیا میں مسلمانوں کو عزت و وقار عطا فرمایا اور مرنے کے بعد مسلمانوں سے جنت و کوثر دینے کا وعدہ فرمایا۔

گویا یہاں بھی دیا اور وہاں بھی دیں گے' مسلمانوں سے کیا کچھ نہیں فرمایا؟

آل محمدؐ نے دین کی خاطر کیا کیا مصیبتیں سہیں' کلیجہ منہ کو آتا ہے' کیا کیا بیان کیا جائے۔ لوگ کہتے ہیں شیعہ روتے کیوں ہیں؟ حالانکہ جب یہ لوگ خوش ہوں تو پوچھنا چاہیے کہ تم خوش کیوں ہو؟ کہتے ہیں یہ ماتم کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ انہیں عبرت کرنی چاہیے کہ یہ لوگ زندہ کیسے ہیں؟ نفسیاتی فقرہ عرض کر رہا ہوں۔ کسی جوان عزت دار' غیرت مند' شریف النفس انسان کے سامنے دشمنوں کے بھرے

مجمع میں اس کی ماں کے سر سے چادر چھن جائے تو اس سے یہ پوچھنا کہ تم روتے کیوں ہو؟ عقلمندی نہیں۔ ہاں اس سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اس ہولناک حالت سے گزرنے کے بعد تم زندہ کیسے ہو؟ اے باغیرت مسلمان! اگر تیرے خاندان کی بیٹیوں بہنوں اور ماؤں کے سروں پر چادریں ہیں تو اس غیرت پر کیا خرچ ہوا ہے؟ یہ حسینؑ کی بہن کا احسان ہے' جس نے اپنی چادر لٹا دی اور تیری بہو' بیٹیوں کے سر پر شرم و حیا کی چادر ڈال دی' اور آج کے غیر مسلم ممالک بیٹی اور بہن کے نکاح کو قانونی شکل دینے سے گھبراتے ہیں اور یزید اور وہ ناپاک انسان تھا جس نے پیغمبرؐ کے فوراً بعد کے عرصہ میں محارم سے نکاح کو جائز قرار دے دیا تھا۔ یہ حسینؑ و زینبؑ کا احسان ہے جنھوں نے یزیدیت کے آگے کوہ گراں بن کر اس کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور حلال و حرام کے درمیان امتیازی نشانی کھینچ کر مسلمانوں کو غیرت اسلامی کا درس دیا۔ مشکل ترین اور ہوشربا حالت سے گزر پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی۔

جب بھی غیرت انسان کا خیال آتا ہے
بنت زہراؑ تیرے پردہ کا خیال آتا ہے

جب کوفہ کے نزدیک پہنچیں تو حضرت سجادؑ سے پوچھا۔ یہ سامنے کیا ہے سجادؑ نے عرض کی کوفہ۔ فرمایا! وہی کوفہ جس میں شہزادی رہ چکی ہوں۔ بقولے فضہ سے فرمایا جا کر شمر سے کہو کہ میں اس شہر میں شہزادی رہ چکی ہوں' مجھے اس شہر میں نہ لے جاؤ اور اگر لے جانا ہے تو ہمیں چادریں دے دو' اگر یہ بھی نہیں تو کسی ایسے راستے سے لے جاؤ جو غیر معروف ہو' اور اگر یہ بھی نہیں تو اس وقت لے جاؤ جب رات کی تاریکی چھا جائے اور شمعدان گل کیے جائیں' چنانچہ فضہ نے شمر سے بی بی

کی فرمائش کو بیان کیا۔

اس حرامزادہ نے منہ دوسری طرف کر کے انتہائی لاپرواہی سے اور بے حیائی سے کہا! کہ جاؤ۔ زینبؑ سے کہو اب تم کوفہ کی شہزادی نہیں بلکہ ہماری قیدی ہو۔ ہم جیسے چاہیں گے لے جائیں گے۔ جب فضہ نے شمر کا فقرہ دہرایا تو بقولے بی بی نے فرمایا:

میں اس حالت میں نہیں جاؤں گی' پس محمل رکا۔ ادھر حسینؑ کے سر والا نیزہ رکا۔ شمر تازیانہ لے کر کہ سجادؑ کی طرف بڑھا۔ تو سجادؑ نے بابا کے سر کی طرف رُخ کیا اور عرض کی:

بابا قیدی بہن آگے جاتی نہیں اور میری پشت برداشت نہیں کر سکتی۔ حسینؑ کے سر سے آنسو کے خون آلود قطرے ٹپکے تو بی بی نے سر اُٹھا کر عرض کی:

حسینؑ! رونے کی کیا وجہ ہے؟ بزبان حال سے فرمایا۔ میرا بیٹا بیمار ہے تازیانہ برداشت نہیں کر سکتا' دربار میں پیش ہوئیں' دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گئیں۔ بی بی کے تن اقدس پر نہایت خستہ اور بوسیدہ لباس تھا۔ غالبًا اچھے ملبوسات یا کربلا میں لوٹے گئے یا پھر نذر آتش کر دیئے گئے بس وہ لباس تھا جو مدینہ سے پہن کر آئی تھیں۔

ابن زیاد ایک اکھڑ' سرکش بدلگام اور تلخ مزاج انسان تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ حسینؑ کی بہن کہاں ہے؟ شمر نے کہا کنیز کے پیچھے ہے' اس بے غیرت نے کہا کنیز کو ہٹاؤ میں زینبؑ سے بات کرنا چاہتا ہوں حضرت سجادؑ رو کر بولے او ظالم اپنی زبان کو روک لے۔

تو کب تک میری پھوپھی کی توہین کرتا رہے گا۔ خاموش ہو جا' ماننے اور

جاننے والوں کے درمیان میری پردہ دار پھوپھی کی توہین نہ کر۔ قاتلوں کو انعام ملنے لگے' بیبیاں خاموش دیکھ رہی ہیں اور ان کے مقتولوں کے قاتل انعام طلب کر رہے ہیں۔ ہائے! علی اکبرؑ کی اماں تو نے کیسے برداشت کیا ہوگا جب علی اکبرؑ کے قاتل نے انعام وصول کیا ہوگا' راہ شام میں غالباً بی بی نے یہی فقرہ کہا!

خدا کرے کسی ماں کے سامنے اس کے جوان مقتول بیٹے کا قاتل نہ آئے'

بی بی نے کہا علی اکبرؑ جب تیرا قاتل میرے سامنے آتا ہے تو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ کاش تیری ماں نے یہ وقت نہ دیکھا ہوتا۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

مجلس ششم

لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

مسلمان ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ انسان مذکورہ بالا کلمہ پڑھ لے اگر کوئی شخص کافر ہے اور اسے یہ کلمہ پڑھا دیا جائے تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ آپ ملاحظہ فرمایئے کلمہ کا آغاز ہی "لا" سے ہوا ہے یعنی نہیں سے لَآ اِلٰهَ کوئی معبود نہیں۔ الا اللہ سوائے اللہ کے' جو نالائق ہے' نااہل ہے اسے پہلے ہٹانا چاہیے تھا تب لائق اور اہل آئے گا۔ اسی لیے پروردگار عالم نے توحید کے موافق نفی کو پہلے رکھا اور اثبات بعد میں ۔ لَا اِلٰهَ یعنی نہیں ہے کوئی خدا الا اللہ صرف اللہ خدا ہے' اثبات بعد میں اور نفی پہلے یعنی تلبیہ پہلے اور تعلیہ بعد میں ہمیشہ ہر جگہ یہی دستور ہے کہ نفی مقدم ہے ضد کی۔ جب تک ضد منفی نہیں اس میں تنبیہ نہیں آ سکتی۔ جہالت کی نفی ہوگی تو علم زینت بنے گا بخل کی نفی ہوگی تو سخاوت زینت بنے گی۔ بزدلی کی نفی ہوگی تو شجاعت زینت بنے گی۔ ہر خوبی ہر زینت دینے والی شے کی ایک "ضد" ہے جسے ہٹانا ضروری ہے' رجس ہٹے گا تو آلِ محمدؐ کی تطہیر زینت بنے گی۔ رجس کیا ہے؟

فرمایا:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا.

''میں نے تم سے رجس کو دور کیا''۔

صاف صریح مطلب یہ ہے کہ جو بھی آپ سے دور ہے وہ رجس ہے کیونکہ اہل بیتؑ سے اللہ نے رجس کو دور رکھا ہے۔ بندہ دور ہے تو بندہ رجس ہے' کوئی مکان آپؑ سے دور ہے تو وہ مکان رجس ہے کوئی صفت آپ سے دور ہے تو وہ صفت رجس ہے اس لیے کہ آپ سے پروردگار نے صرف رجس کو دور رکھا ہے۔ تو جو آل کے قریب ہے وہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ وہ نبیؐ کے دامن سے وابستہ ہے۔

زَیِّنُوْا مَجَالِسَکُمْ تم اپنی مجالس کو زینت دو' کس سے زینت دو؟ آپ جانتے ہیں کہ کسی مقام پر اگر مدحت کا پہلو سامنے ہو تو وہاں پر کسی ایسی بات کا تذکرہ نہیں ہونا چاہیے جس سے مدحت کا ضرر ہو۔

اگر کسی کی تعریف کرنی مقصود ہو، فضائل بیان کرنا ہوں تو فضائل میں کسی ایسی بات کا ذکر نہیں ہونا چاہیے جو آل محمدؐ کی مدحت کے منافی ہو۔ مثلاً فلاں شخص بڑا نمازی ہے' بڑا لائق ہے' پڑھا لکھا ہے' شریف ہے' بڑا سخی ہے ساری صفات اس کی گن لیں' لیکن ان صفات کو گنتے گنتے کوئی ایسا پہلو سامنے آ جائے اگرچہ صحیح کیوں نہ ہو لیکن اس کے فضائل کے لیے نفی کا باعث بن جائے گا' یہ خطیب فصیح و بلیغ کے لیے نا مناسب ہے۔ اتنا شریف' نہایت نیک اور لائق، قابل اگر کوئی پوچھے نسب کیا ہے؟ فلاں چور کا بیٹا اگرچہ اس کا باپ صحیح معنوں میں چور تھا' بیٹا نیک بن گیا لیکن اس کی نیکی کے بیان کرنے میں اس کے باپ کا حوالہ دینا ہر اس کی ہر نیکی

کی نفی ہے' اس کی دلیل ہے کہیں بھی کوئی فصیح و بلیغ انسان' مقام تعریف میں کوئی ایسا پہلو بیان نہیں کرے گا جو اس کے لیے نقص کا باعث ہو۔ حالانکہ پیغمبرؐ نے فرمایا ''علیؑ کے نام سے' علیؑ کے ذکر سے اپنی مجالس کو زینت دو۔ وہ علیؑ جو ابو طالبؑ کا بیٹا ہے۔ اگر محمدؐ کے نزدیک ابو طالب کا ایمان مشکوک ہوتا تو مقام تعریف میں علیؑ کو ابو طالب سے منسوب نہ کرتے۔ واضح سی بات ہے کہ جس کے نام سے مجلس کو زینت دینا ہے اگر یہ کہے کہ وہ علیؑ کافر کا بیٹا ہے تو وہ اس تعریف میں فرق پڑ جائے گا۔ فصیح کی شان سے بعید ہے کہ مقام تعریف میں کوئی ایسا پہلو ظاہر کرے جو اس کے لیے نقص کا باعث ہو۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو ابو طالب کے مسلمان ہونے کا یقین کامل تھا۔ اس لیے حضرت علیؑ کی تعریف کرتے ہوئے ابو طالب کا حوالہ دیا تا کہ حضرت علیؑ کی فضیلت کو چار چاند لگ جائیں' اگر رسولؐ کی نظر میں ابو طالبؑ کا ایمان مشکوک ہوتا تو اس مقام پر علیؑ کو یقیناً ابو طالب سے نسبت نہ دیتے' کوئی اور پہلو ذکر کر دیتے۔ حضورؐ کا یہ فرمانا ابو طالبؑ کے ایمان کے لیے ایک برہان قاطع کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت علیؑ نے بھی ہر مقام پر ایسا فرمایا مثلاً جنگ جمل (جو بصرہ میں ہوئی۔) یہ جنگ حضرت علیؑ کی اولاد کے لیے ایک تربیت گاہ تھی اس لیے کہ سابق حکومتوں میں علیؑ اور اولاد علیؑ کسی کو بھی خدمت کے لیے پسند نہیں کیا گیا تھا۔ اولاد علی سابق حکومتوں میں کسی فوج میں بھرتی نہیں ہوئے تھے۔ پہلی جنگ تھی جنگ جمل جس میں اولاد علیؑ کامل ہوئی۔ یہ ان کا ٹریننگ کورس بھی تھا اور باقاعدہ شمولیت بھی تھی اس سے پہلے کسی جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؑ کے شہزادے محمد حنفیہ کڑیل جوان تھے۔ میدان جنگ میں آ کر شجاعت کے جوہر دکھائے۔ محمد حنفیہ نے میدان میں جانے کا ارادہ کیا تو خود علیؑ نے

محمد حنفیہ کو گھوڑے پر سوار کروایا۔ اپنی تلوار ان کے حوالے کی اور نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے الفاظ ہیں کہ حضرت حنفیہ کو چار نصیحتیں فرمائیں:

فرمایا محمدؑ! میدان جنگ میں جانے سے پہلے اپنے باپ سے یہ چار درس سیکھ لے جس پر تو نے عمل کرنا ہے۔ یہ ٹریننگ کورس تھا محمد حنفیہ کا۔

لاتذول الجبال ولا تزل

یہ سامنے والا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے لیکن علیؑ کے شیر جیسے بیٹے کے قدم زمین سے نہ ہٹیں' یہ پہلا درس تھا۔

اس کے بعد فرمایا:

اِدْخِل فِی الْاَرْضِ قَدَمَک.

"زمین میں اپنے قدم اس طرح گاڑ دے جیسے میخ گڑ جاتی ہے"

یہ دوسرا سبق تھا اور فرمایا:

صرف سامنے والے سپاہی پر نظر نہ رکھ۔ اور دشمن کی فوج کے آخری سپاہی تک تیری نظر مسلسل کام کرتی رہے تاکہ دشمن کا ہر سپاہی یہ سمجھے کہ علیؑ کے شیر کی تلوار میرے سر پر آ رہی ہے۔

وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصَرَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ.

اور اس کے بعد چوتھیات یہ ہے کہ تو پر یقین ہو کر میدان میں قدم بڑھاؤ۔ تو مدد اللہ کی ذات کی طرف سے اترتی ہے اس بندے پر جو اللہ کی خوشنودی کے لیے جنگ کرے' یہ ہمیشہ ذہن میں رکھنا اور اسے پلے باندھ لو۔ علی نے چاروں درس دیئے اور اپنے بیٹے کو الوداع کیا۔ محمد حنفیہ نے میدان کارزار میں قدم رکھا اور عام انسان سے بہت بہتر جنگ لڑی۔ کیونکہ پہلی جنگ تھی اور پہلا واقعہ تھا

کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور اپنی طرف سے مطمئن ہو کر واپس آئے۔ جناب علیؑ کے فرمان کا حق پورا ادا کیا۔ جب واپس آئے تو یہ علیؑ کی سکھلائی تعلیم کا ایک انداز تھا' فرمایا: بیٹے واپس آ گئے ہو' اچھا گھوڑے سے اترو اور تلوار مجھے دو۔ اسی گھوڑے پر علیؑ خود سوار ہوئے اور بیٹے سے فرمانے لگے:

جس مقام پر کھڑے ہو کر میں نے تمہاری لڑائی دیکھی ہے، اُسی مقام پر کھڑے ہو کر تم میری لڑائی دیکھو۔ اب محمد حنفیہ وہاں کھڑے ہو گئے جہاں حضرت علیؑ کھڑے تھے اور علیؑ اسی گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کارزار میں گئے اور صفایا کر دیا' یعنی سارے کے سارے بکھر گئے۔ تتر بتر ہو گئے' واپس اسی مقام پر پلٹے گھوڑے سے اتر کر بیٹے کے پاس آئے محمد کو سینے سے لگا کر فرمایا:

بیٹا یہ ہے مقام تعلیم۔ بیٹا علیؑ کی اولاد اس طرح جنگ کرتی ہے جس طرح تو نے جنگ کی ہے اور ابو طالبؑ کے بیٹے ایسے جنگ کرتے ہیں جیسے میں نے کی ہے۔ اس کے بعد فرمایا یہ تو تھی تلوار کی لڑائی اب تیر لو' ترکش لو' کمان لو اور تیروں کی لڑائی لڑو۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ جس اونٹ کے اوپر سالار لشکر عورت سوار ہے اس اونٹ کے زانو لو تا کہ یہ علم گرے اور مسلمان قتل ہونے سے بچ جائیں۔

محمد حنفیہ یہی فرق ہے معصوم اور غیر معصوم کا' معصوم اپنے کمال میں تجربے کا محتاج نہیں ہوتا' اور غیر معصوم خواہ علیؑ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اپنے کمال میں تجربے کا محتاج ہوتا ہے۔ چونکہ محمد "صلب محمدؐ" میں سے نہیں تھا' تیر نشانے پر نہیں لگا۔ ضائع ہو گیا اب دوسرا تیر علیؑ نے مارنے نہ دیا کہا:

بیٹا یہ تیر کمان حسنؑ کو دے دو تو حسنؑ نے وہی کمان لی اور تیر چلے میں رکھا اور عرض کیا کون سا نشانہ؟

فرمایا:

وہی نشانہ جس سے تمہارے بھائی کا نشانہ چوک گیا ہے۔ حسنؑ نے تیر مارا تو اس اونٹ کے بالکل زانو کے وسط میں لگا۔ ابھی پہلا تیر پہنچ ہی رہا تھا کہ حسنؑ نے پھر تیر مارا جو پہلے کی پشت میں لگا۔ تیسرا تیر دوسرے کی پشت میں لگا۔ چار تیر مسلسل جب حسنؑ مجتبیٰ نے مارے تو حنفیہ نے کہا: آقا! میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ حسنؑ مجتبیٰ کے تیر کا نشانے پر لگنا اور محمد حنفیہ کا نشانہ خطا ہونا محمد کے لیے خفت تھی جس سے جبین مبین پر پسینے کے قطرات نمودار ہوئے۔ یہ علی ابن ابو طالب کا طریقہ تعلیم تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حسنؑ مجتبیٰ کو گلے سے لگاتے اور انہیں داد دیتے' علیؑ نے اپنے بیٹے محمد کو گلے سے لگایا ار پیشانی پر بوسہ دے کر فرماتے ہیں: میرے نونہال بیٹے! میرے بہادر بیٹے! اپنے ہم پلہ بہادر سے ہار جانا یہ توہین ہے مگر مقابلے کے دوران بڑے سے ہار جانا توہین نہیں ہے کہا:

حسنؑ تو سوتیلے تھے وہ میرے برابر کے نہیں فرمایا:

وہ تیرا مقابل نہیں ہے' نہ ہی تیرا ہم پلہ ہے' وہ تیرا سردار ہے کیونکہ تو علیؑ کا بیٹا ہے وہ محمدؐ کا بیٹا ہے تو کنیز کا بیٹا ہے وہ خاتون جنت کا بیٹا ہے' اور یہی وجہ تھی کہ اس واقع کے بعد محمد حنفیہ نے کبھی حسنؑ اور حسینؑ کو سامنے آنکھ بلند کر کے نہیں دیکھا۔ یہ تھی جنگ جمل محمد حنفیہ کا تربیتی کورس تھا۔ ٹریننگ تھی پھر بحیثیت جرنیل گئے۔ تین جرنیل تھے علیؑ کی فوج کے' ایک محمد حنفیہ' دوسرا مالک اشترؓ اور تیسرے خود علیؑ اور پوری کائنات میں واحد ہیں علیؑ جنہوں نے جنگ میں جانے کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بھی فخر سمجھا۔ حالانکہ سلاطین اپنی فوجوں کو ہی لڑواتے تھے۔ یہ علیؑ کا کام تھا یا خود لڑتے تھے یا اپنے بیٹوں کو میدان جنگ میں بھیجتے۔ محمد جرنیل ہے سپہ

سالار ہے لیکن علیؑ نے ہمیشہ اپنے بیٹے سے فرمایا: سپاہی بن کر میدان میں اترو۔ جب جنگ میں فیصلہ کر کے محمد واپس آئے تو ان کا جگر پیاس سے اچھل رہا تھا محمدؐ نے باپ کو سلام کیا' حضرت علیؑ نے سلام قبول کیا اور فرمایا بیٹے ڈر کر آئے ہو' حنفیہ نے کہا: بابا! ڈر کر نہیں آیا' لڑ رہا تھا کہ پیاس کا غلبہ ہو گیا ساقی' کوثر نے محمد کو سینے سے لگایا' اس کی پشت کو صاف کیا' پیار کیا اپنے ہاتھ سے جام بھر کر محمد کے منہ سے لگایا اور فرمایا:

بیٹے تم میدان کے شیر ہو اور شیر کے لئے دم لینا شیر کی توہین ہے جاؤ اور میدان میں اسی گرم خون کے ساتھ پھر لڑو۔ دوبارہ لڑ کے آئے پھر خون ابل رہا تھا' پیاس کا غلبہ تھا۔ سیراب کیا اور فرمایا شیر جھکا نہیں کرتے۔ تیسری دفعہ محمد گئے میدان میں دشمنوں کا صفایا کیا جب تیسری بار آئے تو زخموں سے چور چور تھے۔ آ میرے بیٹے اگر بہت تھک گیا ہے تو جا کر خیمے میں دم لے لے۔

ایک منافق شخص جس کی زبان حمایت (اقرار) کرتی تھی اور دل مخالفت (انکار) کرتا تھا۔ محمد حنفیہ کے سامنے آیا اور بظاہر نہایت ہمدردی سے محمد حنفیہ سے کہا محمد لگتا ہے تمہارے باپ کو تم سے محبت نہیں ہے۔ اسی لئے جب تو تیسری بار آیا ہے تو علیؑ نے تجھے شاباش نہیں دی۔ یہ تو تیری زندگی تھی اور خوش قسمتی تھی کہ دشمنوں کے چنگل سے زندہ سلامت بچ کر آ گیا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے باپ کو تم سے پیار نہیں دیکھو حسنؑ حسینؑ علی کو کیسے پیارے ہیں۔ تجھ سے پیار نہیں کرتے اس لئے بار بار میدان جنگ میں بھیجتے ہیں اس کا یہ کہنا تھا کہ محمد کے تیور بدل گئے اور فرمایا:

منافق بے حیا' خاموش میرا بابا برحق ہے۔ حق اسے زیبا ہے میرے بابا کی

سچائی پر شک مت کر۔ ان پر شک کرنا حق سے دشمنی ہے۔ بابا نے حسنؑ حسینؑ کو بٹھایا ہے تو بٹھایا ہے۔ مجھے لڑایا ہے' مجھے لڑایا ہے۔(سبحان اللہ)

خبردار میرے عادل امام بابا کے حق میں یہ گستاخانہ بک بک مت کرنا وہ شخص نہایت شرمندہ ہوا اور پھر خفت مٹانے کے لئے چاپلوسی کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ پھر مجھے اپنے بابا کا فیصلہ سمجھایئے انہوں نے حسنؑ اور حسینؑ کو آرام سے خیمے میں بٹھایا ہوا ہے' اور آپ کو شدید زخمی ہونے کے باوجود بار بار میدان جنگ میں بھیج رہے ہیں اس فیصلے کو مجھے سمجھایئے۔ اس کی علت سمجھایئے۔آپ نے فرمایا:

محبت میں کوئی کمی نہیں' پیار میں کوئی فرق نہیں' ان کی اپنی ڈیوٹی میری اپنی ڈیوٹی ۔علیؑ کے پیار میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس نے کہا مجھے سمجھائیں محمد نے کہا یہ بتاؤ کہ تمہارا جسم تمہیں پیارا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا جناب بہت پیارا ہے'

آپ نے فرمایا:

جسم منقسم ہے اعضاء میں' یہ بتاؤ ان اعضاء میں سے کون سا عضو تمہیں زیادہ پیارا ہے' سارے اعضاء پیارے ہیں۔

کہا کہ ہوسکتا ہے تمہیں منہ کے بجائے ہاتھ پیارا ہو'

ناک کے بجائے آنکھ پیاری ہو'

کان کی نسبت زبان پیاری ہو'

پیٹ کے بجائے دل پیارا ہو'

کوئی فرق؟ اس نے کہا کوئی فرق نہیں ہر عضو کا اپنا کام ہے اور اپنے کام کے لیے ہر عضو پیارا ہے ان میں سے جو بھی بیکار ہو جائے میں بے کار ہو جاؤں گا۔

منہ بے کار تو بھی میں بے کار'

ناک بے کار تو بھی میں بے کار'

کان بے کار' تو بھی میں بے کار'

پیٹ بے کار تو بھی میں بے کار

'دل بے کار تو بھی میں بے کار'

مجھے یہ سب بہت عزیز ہیں۔ سب کے سب مجھے پیارے لگتے ہیں اس لیے کہ ان میں سے کسی کے بغیر میرا گزارہ نہیں جب تم نے سن لیا کہ یہ سب پیارے ہیں مجھے بتاؤ پاؤں ہمیشہ چلنے کا کام کیوں دیتے ہیں، گرمی میں چلنا ہے تو پاؤں سے' ریت پر چلنا ہے تو پاؤں سے' سڑک پر چلنا ہے تو پاؤں سے' میدان میں چلنا ہے تو پاؤں سے' تھک جاتے ہیں بے چارے کبھی ان کے مقابل سر کو استعمال کرو اور پاؤں کو آرام کرنے دو؟ اس نے کہا نہیں حضور یہ سر اوپر رہنے کے لیے ہے پاؤں نیچے رہنے کے لیے ہیں ہاتھ اور کام کرنے کر لیے' پاؤں اور کام کے لیے' منہ اور کام کے لیے' ناک اور کام کے لیے جو ان کی ڈیوٹی ہے وہ اس ڈیوٹی سے نہیں ہٹ سکتے ویسے بھی مجھے اپنے بابا کی محبت میں شک نہیں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کان پیارے یا آنکھیں؟ کہتا ہے دونوں پیارے ہیں۔ محمد نے فرمایا اگر دشمن تجھے تیر مارتا ہے اور وہ تیر سیدھا آنکھ کی طرف آ رہا ہے کیا تیر کو آنکھوں کی طرف آنے دو گے کہا نہیں حضور پہلے ڈھال سے بچاؤں گا۔ ڈھال نہ ہوئی تو ہاتھ آگے کر دوں گا محمد نے فرمایا:

اگر تمہارا ہاتھ زخمی کر دے۔

تو کہتا ہے: ہو جاتا ہے تو ہو جائے۔ آنکھ تو بچ جائے گی

حضور نے فرمایا:

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے ہاتھ پیارے نہیں ہیں آنکھ پیاری ہے۔ دشمن تیری آنکھ کو تیر مارتا ہے تو اپنے ہاتھ کو مرواتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تجھے ہاتھوں کی نسبت آنکھیں زیادہ پیاری ہیں' کہنے لگا حضور ہاتھ کی ڈیوٹی یہی ہے کہ آنکھ کی سپر ہے جب ہاتھ آنکھ کی سپر نہیں بن سکا تو یہ ہاتھ کی ڈیوٹی کے خلاف ہے وہ ہاتھ ہاتھ نہیں ہے۔ حنفیہ نے فرمایا: بس تو نے اپنے سوال کا جواب خود دے دیا۔ حسنینؑ علی کی آنکھیں ہیں میں علیؑ کا ہاتھ ہوں وہ ہاتھ ہاتھ نہیں کہ آنکھ کو تکلیف ہوتے دیکھے اور بیٹھا رہے' یہ تھی علیؑ کی تربیت اور اس تربیت کا اثر۔ اب بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث کہ علیؑ کے ذکر سے مجالس کو زینت دو۔ روایت کے خلاف ہے۔

سب سے پہلا ذکر' ذکر اللہ

اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ.

اور اس کے بعد ہے ذکر محمدؐ اور آخر میں ہے ذکر علیؑ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کا فرمان ہے اللہ کو چھوڑ کر محمدؐ کے ذکر کو چھوڑ کر صرف علیؑ کا ذکر کرو۔ یہ حدیث روایات کے خلاف ہے۔ آپ نے سمجھا جب پیغمبر یہ بات کرتے ہیں کہ علیؑ کے ذکر سے مجلسوں کو زینت دو۔ حالانکہ علیؑ سے افضل ہے ذکر محمدؐ، محمدؐ کے ذکر سے افضل ہے ذکر اللہ۔ محمد کی زبان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ افضل کو چھوڑ کر مفضول کا اشارہ کرے۔ یہ کہا جا سکتا ہے' کہا جاتا ہے تو عرض ہے کہ تین دائرے ہیں۔ ایک دائرہ ہے بڑا ایک اسکے اندر اور تیسرا دائرہ اس کے بھی اندر' جو شخص باہر والے دائرے کے اندر ہو ضروری نہیں کہ دوسرے دائرے کے اندر بھی ہو لیکن جو شخص دوسرے دائرے کے اندر ہو وہ باہر والے دائرے کے اندر تو ہے لیکن تیسرے دائرے کے اندر نہیں جو تیسرے دائرے کے اندر ہو وہ تیسرے کے اندر بھی ہے'

دوسرے کے اندر بھی ہے اور پہلے دائرے کے بھی اندر ہے۔ دائرہ توحید ہے ہر دائرہ سے وسیع۔ اس دائرے میں لا الہ الا اللہ کہنے والے داخل ہیں محمد کو رسول مانیں یا نہ مانیں۔ خواہ وہ علیؑ کو امام مانیں یا نہ مانیں' یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر موحد شامل ہے۔ جو دائرہ توحید میں آ گیا۔ ضروری نہیں کہ محمدؐ کی رسالت کے دائرے میں بھی آئے لیکن جو محمدؐ کے دائرہ رسالت میں داخل ہو جائے وہ توحید کے دائرے میں خود بخود داخل ہے اس لیے کہ توحید کا دائرہ محمد کے دائرے سے باہر ہے جو محمد کے دائرے میں ہے وہ ظاہر ہے توحید کے دائرے میں بھی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ تیسرے دائرے میں بھی ہو لیکن جو تیسرا دائرہ ہے دائرہ ولایت جو شخص دائرہ ولایت میں آ جاتا ہے وہ شخص دائرہ نبوت کے بھی اندر ہے اور دائرہ توحید کے بھی اندر ہے۔

اس لیے لا الہ الا اللہ پڑھنا تو صرف داخلہ توحید کی علامت ہے کہ دائرہ توحید میں داخل ہو جاؤ۔ محمد رسول اللہ پڑھنا ہے۔ دائرہ نبوت میں داخلے کی علامت ہے جو دائرہ نبوت میں داخل ہے۔ دائرہ توحید میں خود بخود داخل ہے لیکن علیؑ ولی اللہ پڑھنا یہ چونکہ آخری دائرہ ہے جو علیؑ ولی اللہ پڑھتا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ تینوں دائروں میں داخل ہے وہ توحید کو توحید سمجھتا ہے' نبوت کو نبوت سمجھتا ہے، ولایت کو ولایت سمجھتا ہے اس لیے جس شخص نے علی ولی اللہ پڑھا تو پھر اس نے محمد رسول اللہ بھی پڑھ لیا۔ اس لیے کہ علی ولی اللہ بغیر لا الہ الا اللہ کے نہیں ہوتا اس لیے جس نے علیؑ کا ذکر کیا اس نے محمدؐ کا ذکر کیا' جس نے محمدؐ کا ذکر کیا اس نے اللہ کا ذکر کیا اور اللہ کا ذکر عبادت ہے لہٰذا علیؑ کا ذکر عبادت ہے۔

یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ نعرۂ حیدری کیوں لگاتے ہیں آپ لوگ؟ سب

سے بہتر نعرہ ہے نعرۂ تکبیر اس لیے کہ اللہ کے لیے یہی نعرہ ہے اور علیؑ خود میدان جنگ میں یہی نعرہ لگاتے تھے' اللہ اکبر جب تم علیؑ کے نعرۂ سے ہٹ جاؤ گے تو یہ نعرہ کیسے ہے؟ علیؑ کا اپنا نعرہ ہے اللہ اکبر تین محاذوں پر جہاں توحید کے محاذ کی بات تھی تو علیؑ کا نعرہ تھا اللہ اکبر' نبوت کے محاذ پر لڑائی کی تو علیؑ کا نعرہ تھا محمد رسول اللہ اور جب ولایت کی جنگ ہے تو علیؑ کا نعرہ ہے علیؑ ولی اللہ تو علیؑ کا نعرہ تھا لا الہ الا اللہ اللہ اکبر تم لوگ یہ نعرہ کیوں لگاتے ہو اس کے متعلق میں عرض کروں گا کہ ہر جنگ پر محاذ کا فرق ہے علیؑ نے یہ نعرہ وہاں لگایا اللہ اکبر جہاں مقابل والے توحید کے قائل نہ تھے یا ان لوگوں سے جنگ کے دوران جو توحید کے قائل نہ تھے۔ وہ یقیناً اہل مکہ سے لڑائی تھی تو علیؑ نے نعرہ بلند کیا اللہ اکبر۔ لیکن جب یہود خیبر سے لڑائی ہوئی تو وہاں نعرہ محمد رسول اللہ ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ اللہ اکبر کے قائل تھے محمد رسول اللہ کے قائل نہیں تھے۔ اور آخری جنگ میں علیؑ کا نعرہ تھا میں امام حق ہوں اور وہ باطل ہیں لہٰذا سامنے والے بھی لا الہ الا اللہ پڑھتے تھے محمد رسول اللہ پڑھتے تھے جبکہ جنگ نہروان اور جنگ جمل کا نعرہ تھا علیؑ حق' اس لیے ہم بھی اپنی مجالس میں علیؑ حق کا نعرہ لگاتے ہیں یا علیؑ کا نعرہ لگاتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے مقابل توحید کا دشمن کوئی نہیں کہ ہم اسے اللہ اکبر کا نعرہ سکھائیں۔ ہمارے مقابل محمد کا دشمن کوئی نہیں کہ ہم اسے محمد رسول اللہ کا نعرہ سکھائیں' ہمارے سامنے وہی لوگ آتے ہیں جو علیؑ کی ولایت کے قائل نہیں اس لیے ہماری مجالس میں بھی کہا جاتا ہے علیؑ حق۔

اپنی مجالس کو زینت دو علیؑ کے ذکر سے علیؑ کا ذکر عبادت ہے۔ نیک بخت ہے وہ انسان جو اس زینت سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ یہ ایک احسان ہے ہمارے اوپر' اللہ کا کرم ہے اور یہ احسان ہے ہمارے اوپر۔ اور اس

احسان کے شکر کے لیے ہمارے پاس کوئی الفاظ نہیں' اللہ کی کسی نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ تمام احسانات میں سے ایک عظیم ترین احسان ہے جس کا شکر نا ممکن ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے اگر انسان کی طویل زندگی ہو اور ساری عمر وہ پانی میں گزار دے' ہڈیاں گل جائیں گوشت گل سڑ جائے خون ختم ہو جائے' سارا جسم ختم ہو جائے سجدہ کرتے کرتے لیکن مسلسل سجدوں کے باوجود صرف اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا کہ اللہ نے بغیر مانگے اسے علیؑ جیسا امام دے دیا۔ ہر بندہ سمجھتا ہے کہ ہر زمین ہر پودا نہیں اُگاتی۔ ہر زمین پہ ہر پودا پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ اسی پودے' کو جنم دیتی ہے جو زمین کے مزاج کے موافق ہو۔ ایک زمین ہے جو گندم پیدا کرتی ہے' دوسری زمین ہے جو چنے پیدا کرتی ہے' ایک زمین ہے جو چاول پیدا کرتی ہے' ایک زمین ہے جو آم پیدا نہیں کرتی۔ ایسے ریگستان ہمارے سامنے موجود ہیں اور جو زمینیں زرخیز ہیں وہ بھی محدود ہیں' کوئی زمین کسی پودے کے لیے زرخیز ہے' کوئی زمین کسی پودے کے لیے زرخیز ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زمین پر ایک پودا اُگ آتا ہے۔ وہی پودا دوسری جگہ پر لگائیں تو جل جاتا ہے کیونکہ زمین کا مزاج اس پودے کو قبول نہیں کرتا۔ ایک درخت ایک زمین میں جل جاتا ہے اور وہی درخت دوسری زمین پر پھیلتا اور پنپتا ہے۔ زمین بیج کی مزاج شناس ہے جو بیج اس کے مزاج کے خلاف ہے زمین اس کو ختم کر دیتی ہے زمین بیج کی مزاج آشنا ہے اور وہ کسان جو زمین کے مزاج کو نہ سمجھتا ہو وہ کاشتکار ہونے کا اہل نہیں جب وہ زمین کو دیکھ کر اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس زمین کا مزاج کس پودے سے موافق ہے' میں کون سا بیج ڈالوں تو وہ اپنے بیج کا نقصان کرے گا۔ زمین کا قصور نہیں اس کی مزاج ناشناسی کا قصور ہے کہ اس نے زمین کا مزاج دیکھا نہیں تو گویا ہر زمین اپنے مزاج

کے مطابق پودے اُگاتی ہے، پالتی ہے، تو اسی طرح دین کا شعور، نماز عطا کرتا ہے، قرآن عطا کرتا ہے۔ جس زرخیز زمین میں یہ بیج کامیاب ہوتا ہے جو بیج قرآن سے مہیا کیا جاتا ہے لہٰذا یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو ناقص نماز قبول ہی نہیں ہوتی، نماز پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہماری نماز میں خیالات آ جاتے ہیں کبھی کسی بات کا خیال کبھی کسی بات کا خیال۔ لہٰذا ہماری نماز پر خلوص رہتی نہیں، پھر نماز کیوں پڑھیں؟ خیالات کی وجہ سے نماز چھوڑ دیتا ہے۔ میں عرض کروں گا زرخیز زمین جو بیج اس میں ڈالے جائیں ضروری نہیں کہ وہ صرف وہی بیج پیدا کرے کئی غلط جڑی بوٹیاں بھی پیدا کرتی ہے جنہیں تباہ کرنا پڑتا ہے۔ جس زمین میں ہم گندم کاشت کرتے ہیں ہزاروں جڑی بوٹیاں اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے کار جڑی بوٹیوں کا پیدا ہونا یہ زمین کی خاکی فطرت ہے۔ لہٰذا وہ تو بوٹیاں پیدا کرے گی لیکن کوئی زمیندار ان بوٹیوں سے تنگ آ کر زمین کو گندم سے محروم نہیں کرے گا اس لیے کہ اس کی اپنی فطرت، تیرا اپنا کام، جب فصل کٹنے کا موسم آئے گا۔ بوٹیاں خود بخود سڑ جائیں گی، گل جائیں گی، جب بیج ڈالے گا تجھے اس کا پھل ملے گا۔ تو نے ایک مقصد کو حاصل کرنا ہے زمین کے اس مزاج سے کوئی زمیندار تنگ نہیں کہ میں نے گندم کاشت کی تھی یہ بوٹیاں کیوں اُگ آئیں، ان کو مارنے کے لیے سپرے کرنا پڑتا ہے، دوائیں استعمال کرنا پڑتی ہیں، تاکہ زائد جڑی بوٹیاں مر جائیں لیکن جب موسم پکنے کا آتا ہے تو بوٹیاں وقت سے پہلے مر جاتی ہیں اور گندم کی فصل انسان استعمال کرتا ہے۔ ہمیں تو فصل سے مطلب ہے زمین اپنے مزاج سے کام کرے گی آپ اپنا کام کرو۔ شیعان علیؑ تمہارے دل و دماغ کی زمین زرخیز ہے اس میں ولائے علیؑ کی ملاوٹ ہے، اس زمین میں جتنی نماز، جتنا روزہ، جتنا حج جو بھی کاشت کرو گے یہ الگ بات ہے فضول

خیالات، یہ اس کی خاکی فطرت ہے اس لیے کہ ہم نوری انسان نہیں ہیں کہ خیالات نہ آئیں۔ ہم خاکی انسان ہیں خاکی فطرت کا کام ہے فضول بوٹیوں کا اُگانا، جب قیامت کے دن فصل وصول ہوگی تو نماز تیری کھڑی ہوگی خیالات غائب ہو جائیں گے۔ جڑی بوٹیوں کی مانند۔

بہترین نچوڑ ہے جس میں ولائے علیؑ کی ولا نہیں ہے وہ ذلیل شد ترین ہے جس میں ولائے علیؑ نہیں ہے وہ ذلیل شد ہے اس کا نماز، روزہ، حج کوئی بھی عبادت محض دکھاوا ہے۔ میرے امام علیؑ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے نماز روزے اتنے زیادہ ہوں کہ ستر انبیاء کی عبادت کے مترادف ہوں اگر وہ میری ولایت کا اقرار نہیں کرتا تو عبادت سمیت جہنم میں بھیجا جائے گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ زمین پروردگار نے زرخیز بنائی ہے۔ ہماری زمین دل و دماغ کی زمین اتنی زرخیز ہے جیسے درخت گرا گرا کر اپنے مزاج کے مطابق زمین زرخیز بنائی گئی ہو۔ یہ پروردگار کا اعجاز ہے اور اس کا ہماری ذات پر بہت بڑا احسان ہے کہ ہمارے دل و دماغ اتنے زرخیز ہیں کہ اس میں شجرہ طیبہ ولائے محمدؐ و آل محمدؐ کے علاوہ کوئی نجس درخت یہاں نہ پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ زمین شجرۂ خبیثہ کے لیے نہیں ہے یہ زمین شجرۂ طیبہ کے لیے ہے۔ شجرۂ طیبہ جس زمین میں آ جائے وہ زمین زرخیز ہے، شجرۂ خبیثہ کے لیے وہ زمین زرخیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس زمین کا شجرۂ خبیثہ سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ نیک بخت ہے وہ انسان جو شجرۂ طیبہ اس پاک زمین میں پائے اور اگر جاگیر شجرۂ طیبہ ہے، حضرت امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ شجرۂ طیبہ ہے شجرۂ خبیثہ نہیں اس لیے کہ دل و دماغ کی زمین کا مزاج ہی شجرۂ طیبہ جیسا ہے اس کا مزاج شجرۂ خبیثہ سے ملتا ہی نہیں اور اگر یہ شجرۂ طیبہ کے لیے ہے تو اس کا انداز شجرہ

طیبہ کے شایان شان ہونا چاہیے۔ لہذا!

اس شجرے کا پھل شراب نوشی نہیں ہو سکتی'
اس شجرۂ طیبہ کا پھل زنا کاری نہیں ہو سکتی'
اس شجرۂ طیبہ کے پھل بے نمازی نہیں ہو سکتا'
شجرۂ طیبہ کا پھل بے دین نہیں ہو سکتی'
اس شجرۂ طیبہ کے پھل بے نمازی نہیں ہو سکتا'
شجرۂ طیبہ کا پھل بے دین نہیں ہو سکتا۔

جس طرح یہ درخت پاک ہے اس کا پھل بھی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ پاکیزہ پھل کو دیکھ کر ہمیں پتا چلا کہ یہ درخت فلاں ہے۔ اگر آم کا پھل ہے دنیا سمجھے گی یہ آم کا درخت ہے اگر کوئی اور پھل ہے تو دنیا سمجھے گی فلاں درخت کا پھل ہے درخت پہچانا جاتا ہے اگر تیرے دل میں شجرۂ ولائے علیؑ ابن ابی طالب ہے تو اس کا پھل وہ ہونا چاہیے جو علیؑ کی ولاء کے لیے مناسب ہے۔ مومن اور بے نماز کا کوئی جوڑ نہیں' ولائے علیؑ اور بے نمازی کا کوئی جوڑ نہیں' ولائے علیؑ اور بے دینی کا کوئی جوڑ نہیں' ولائے علیؑ اور شراب کا کوئی جوڑ نہیں آپ ہمیشہ سنتے رہتے ہیں کہ جس دل میں قبرِ حسینؑ ہے وہ دل حسینؑ سے الگ نہیں رہ سکتا اور اگر دل میں قبرِ حسینؑ ہے تو جو نجس غذا منہ میں ڈالتا ہے تو کیا شراب پینے والا یہ نہیں سوچتا کہ یہ شراب کس قدر پاکیزہ ہے' اگر قبرِ حسینؑ دل میں ہے تو شراب پینے والا انسان' نجس غذا کھانے والے انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ جو چیز استعمال کر رہا ہوں وہ کس قدر پاکیزہ ہے؟ کیا اس سے ان کی توہین تو نہیں اگر ہے تو خود بخود سمجھ جائے گا کہ یہ کام نہیں کرنے چاہئیں۔ اس لیے معصوم خود فرماتے ہیں تم ہمارے لیے زینت بن کر

رہو ہمارے لئے داغ بن کر مت رہو۔ اس لیے کہ اسلام کو کسی نے کچھ نہیں دیا' ہم نے اسلام کو سب کچھ دیا کیا وجہ ہے تمہارے پاس کہ جوانی ختم ہو جائے حسین برچھی کھائے ہماری کیا عزت رہ جاتی ہے کہ زینب بازاروں میں آئے۔ ناموس زینبیہ کے بعد کیا عزت باقی رہ جاتی ہے اس لیے کہ جب ایک شخص نے کہا کہ معصوم آپ روتے کیوں ہیں؟ آپ پر مصائب آتے رہتے ہیں اور آپ روتے رہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تو نے غلط کہا ہے فردوں کا قتل ہو جاتا بے شک ہماری خاندانی روایات میں شہادت ہماری میراث ہے۔ مرد قتل ہوتے رہتے ہیں ہم اس لیے نہیں روتے لیکن ماں' بہن پھوپھی کا بازار میں آنا کیا یہ بھی ہماری خاندانی روایت ہے کہ لوگوں کی بہو بیٹیاں تو گھروں میں رہیں اور محمدؐ کی بہو بیٹیاں بازاروں میں آئیں۔ عجیب و غریب قسم کے واقعات میں نے پڑھے۔ عرض کرتا ہوں میں نے یہ روایت اپنی کتاب اصحاب الیمینیں بھی درج کی ہے لیکن آج تک میں نے کسی مجلس میں پڑھی نہیں۔ آج پہلی بار پڑھنے کی جسارت کر رہا ہوں' وہ روایت یہ ہے کتنا پُر درد زمانہ تھا۔ جس سے آل محمدؐ گزارے؟ کتنا ہولناک دور تھا جسے آل محمدؐ نے نبھایا؟ واقعہ کربلا کے بعد واقعہ حرہ ایک انتہائی سنگین واقعہ ہے بنی امیہ کی تاریخ پر ایک ایسا سیاہ دھبہ ہے جسے تا قیامت مٹایا نہیں جا سکتا۔ قتل حسینؑ کے بعد مدینے پر چڑھائی کی گئی اور تین دن قتل عام رہا۔ حتیٰ کہ روضۂ رسول تک مسلمانوں کا خون جوش مارتا ہوا گیا' کتنے مسلمان بے دریغ قتل ہوئے؟ کتنی عزتوں کی نیلامی ہوئی؟ کتنے بچے اگلے سال بے شوہر عورتوں سے پیدا ہوئے؟ یہ مدینہ کی تاریخ ہے واقعہ کربلا کے بعد' اس واقعے میں سادات کا پانی پھر بند رہا حالانکہ سجادؑ اس وقت شام سے واپس جا چکے تھے۔ سید دانیاں اپنے گھروں میں تھیں' پانی بند تھا اور عزت

دار لوگ اپنے گھروں میں خود بخود محفوظ تھے اس لیے کہ باہر یلغار تھی جو سامنے آتا تھا قتل ہو جاتا تھا۔ تو اس افراتفری کے باوجود خدا جانے کیا گزری؟ ایک شہزادہ اپنے گھر سے نکلا ہے جس کا نام قاسم ہے مسلم ابن عقیل کا بھیجتا ہے قاسم ابن عبداللہ بن عقیل۔ تین جوان بہنیں اور ایک ضعیفہ ماں اس کا باپ عبداللہ بن عقیل کربلا میں شہید ہو چکا تھا۔ یہ یتیم بچہ تھا' ماں بیوہ تھی' تین بہنیں تھیں انہوں نے مدینہ چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ ان سے یلغار برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر تین جوان بہنیں ہیں ایک ضعیفہ ماں ہے یہ بچہ وہاں سے نکلا۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ ریگستان عرب کو اس نے طے کیسے کیا ہوگا؟ اس نے کربلا کی جانب رخ کیا کہ کبھی تو قبر حسینؑ کی مٹی کی زیارت ہوگی' جب حسینؑ کی قبر پر پہنچیں گے تو اپنے سر وہاں رکھ کر کہیں گے آقا حسینؑ تیرے بعد ہماری یہ حالت ہوگئی لیکن سید زادہ دن کو سفر نہیں کرتے تھے جب رات کو چلتے تھے تو دن کو آرام کرتے تھے جیسا ہی سفر ہو گیا۔ عراق کی زمین پر وارد ہوئے یہ ایک بھائی تین بہنیں اور ایک بیوہ ماں دن کو چھپ گئے اور رات کو چلنے لگے۔ اچانک شہزادے کی ایک سپاہی پر نظر پڑی کوفہ سے کچھ دور۔ شاہزادے نے اپنے آپ کو جھاڑیوں میں چھپانا چاہا لیکن سپاہی نے دیکھ لیا' سہمے ہوئے ڈرے ہوئے شاہزادے کے پاس گھوڑا بھگا کر لایا شہزادے نے کہا کہ مسافر ہوں پردیسی ہوں سپاہی نے پوچھا اگر مسافر ہو تو بتاتے کیوں نہیں کس خاندان سے ہو؟ شاہزادہ کہتا ہے مجھے امان مل جائے تو میں بتاتا ہوں' ظلم ہوتا رہا ہے میں خوفزدہ ہو کر سر کو چھپاتا رہا ہوں۔ اگر امان مل جائے تو میں بتاتا ہوں میں مسلم بن عقیل کا بھتیجا ہوں' عبدالرحمٰن ابن عقیل کا بیٹا ہوں میرے ساتھ میری تین جوان بہنیں اور ضعیفہ ماں ہے میں کوفے کی طرف نہیں کربلا کی طرف جا رہا ہوں تاکہ وہاں حسینؑ کی قبر کی

مجاورت کر کے زندگی کا وقت گزاریں گے۔ گھڑ سوار گھوڑے سے اترا یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مختار تخت پر آ چکے تھے گھڑ سوار نے اتر کر شاہزادے کے قدم پکڑ لئے اور کہا شاہزادے اب ہم سے ڈرو نہیں۔ اب تمہارے غلام مختار کی شاہی ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں اور نہ سر چھپانے کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے ساتھ چلو' شاہزادے کو رہائش مل گئی۔ کہا میں آپ کے ساتھ کیسے چلوں میرے ساتھ تین جوان بہنیں ہیں میرے ساتھ ضعیفہ ماں ہے پردہ دار ہیں کیسے لے چلوں؟ وہ کہتا ہے میں آنکھیں بند کر لوں گا کھلے سر نہیں دیکھوں گا کوفہ کی طرف چلو میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ کوفہ کے شہر سے باہر پہنچے۔ شاہزادے نے کہا اب میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ میں برداشت نہیں کر سکتا وہ اور وقت تھا جب میری ماں چھپ کر کوفہ میں داخل ہوئی تھی اب میرے غلام کی یہاں شاہی ہے تو میں اپنی نوجوان بہنوں کو اس شہر میں کیسے لے جاؤں؟ رات ہو گئی تو انہیں لے جاؤں گا۔ میں اکیلا تیرے ساتھ چلتا ہوں کسی خفیہ مقام پر اپنی ماں بہنوں کو پناہ دی اور خود روانہ ہو گیا۔ کیا عالم ہوگا؟ دن غروب ہو چکا تھا نمازیں پڑھی جا چکی تھیں جب یہ وارد کوفہ ہوا۔ اتفاق کی بات کہ اس کے باپ عبدالرحمٰن ابن عقیل کا قاتل اسی وقت گرفتار ہو کر مختار کے سامنے لایا گیا جو کہ عبدالرحمٰن کے گھوڑے پر سوار تھا' اسی گھوڑے پر سوار تھا قاتل غالباً اس کا نام عثمان ابن خالد جانی ہے جس نے عبدالرحمٰن ابن عقیل کو قتل کیا تھا۔ عقیل کے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اور مومنین نے کوفہ کے بسنے والوں نے جب دیکھا کہ یہ ظالم تو اس سید کے گھوڑے پر سوار ہے تو گھوڑے کو درمیان میں کھڑا کر کے ان مومنوں نے اردگرد حلقہ باندھ کر اس گھوڑے کو سامنے رکھ کر ہائے حسینؑ ہائے حسینؑ کا ماتم کیا۔ وہ ابھی ماتم کر رہے تھے کہ سپاہی نے اس بچے کو مختار کے سامنے کھڑا کر

دیا۔ لوگ ماتم کر رہے تھے' مختار نے پوچھا یہ بچہ کون ہے؟ سپاہی نے کہا جس مقتول کے قاتل کو گرفتار کیا گیا ہے اُسی مظلوم کا بیٹا ہے' سید زادہ ہے یہ عبدالرحمٰن ابن عقیل کا بیٹا ہے خدا گواہ ہے مختار بے ساختہ کرسی سے اُٹھا اور زمین پر گرا' ہائے ہائے کر کے رونے لگا اور کہنے لگا بیٹے۔ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں میں تمام مصیبتیں ختم ہو گئی ہیں۔ ادھر تیرے باپ کا قاتل گرفتار ہے اور آواز دے کر کہا مومنین کوفہ اب گھوڑے پر رونا بند کر دو یہ اس مقتول کا شاہزادہ آ گیا ہے۔ سب نے پرسہ دیا اور پوچھا شاہزادہ اکیلا؟ کہا نہیں میری تین جوان بہنیں اور بیوہ ماں ہے لیکن میں انہیں وہاں نہیں لا سکتا کہ جب سے مدینہ سے چلے تھے میری ماں بہنوں کے پاس ایک برقعہ نہیں میری ماں کے سر پر چادر نہیں وہ یہاں آنے کے قابل نہیں' مختار نے کہا شاہزادے اب یہ تیری شاہی ہے اب میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک تم کھڑے رہو اور اپنے باپ کے قاتل کے متعلق حکم کرو پھر انہوں نے اس لعین کو واصل جہنم کیا وہ واصل جہنم ہو گیا تو شہزادے نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی لیکن میری ایک بی بی وہ ہے جو ہمیشہ اجڑی رہی آج میں حسینؑ کی کمسن شہزادی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ ہائے سکینہؑ ہائے پیاس' ہائے سکینہ ہائے پیاس' امام سجادؑ نے فرمایا تھا کہ اے مومن! تم ہمارے غم میں کتنا روئے ہو مومن نے کہا محرم چہلم باقی سال کے مہینے میں جب مجلس ہوتی ہے رو لیتے ہیں امام نے فرمایا اگر تم اتنا رو لو کہ تمہارے رونے کا پانی دریا بن جائے تو پھر بھی اپنے رونے پر فخر نہ کرو۔ مومن نے عرض کیا حضور کیوں؟ آپ نے فرمایا تمہاری آنکھوں کا دریا میری کمسن یتیم بہن کے ایک طمانچے کا بدلہ نہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ میری معصوم بہن نے کتنا دکھ اُٹھایا۔ کتنا رلایا گیا اسے۔ عجیب غمزدہ شہزادی ہے' میں مجلس میں کہا کرتا ہوں۔ حسینؑ کی یتیم

شہزادی ہم لوگ تیرا حق ادا نہیں کر سکتے ہم کیسے حق ادا کریں پتا نہیں زنداں میں تیرا وقت کیسے گزرا۔ جب ہتھکڑی لگی ہوئی خدا گواہ ہے کہ اس طرح تو دیکھ کر بھی دل کانپ جاتا ہے ایسا جواب اور ہتھکڑی میں تو نہیں سمجھ سکتا۔ چار سال کا سن معصوم اور ہتھکڑی۔ خدا جانے زندان شام میں سوتی کیسے ہوں گی؟ البتہ ایک روایت آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں کہ رات کو زینبؑ عالیہ سوئی ہوئی تھیں۔ ایک بچی اُٹھی جس نے مخدرہ طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ خاتون نے فرمایا کون ہے میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا' بچی سہم گئی' دوبارہ ہاتھ رکھا۔ بی بی نے فرمایا کون بچی سہم گئی جب تیسری دفعہ ہاتھ رکھا کون ہو؟ تیسری بار میرے سر پر ہاتھ رکھنے والی تو گریہ میں ڈوبی ہوئی ایک آواز نکلی پھوپھی اماںؑ ناراض نہ ہوں میں آپ کے مظلوم بھائی کی یتیم بچی ہوں۔ بی بی نے فرمایا:

سکینہؑ کیا چاہتی ہو؟ کیا مانگتی ہو؟

تمہارے جتنے کم سن بچے تو ہر شام سو جاتے ہیں۔ سکینہؑ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی بابا کا سینہ چاہتی ہوں جب سے بابا گئے ہیں مجھے رات بھر نیند نہیں آتی

تو پھوپھی نے اُٹھایا'

پھر ماں نے اُٹھایا'

پھر دوسری پھوپھی نے اُٹھایا'

لیکن بچی نے رونا بند نہ کیا آخر میں حضرت سجادؑ اپنی کڑیاں سمیت کر اُٹھے ارعرض کیا پھوپھی جان! میری بہن سکینہ آرام نہیں کرتی' میں حسینؑ کا بیٹا ہوں مجھ میں حسینؑ کا خون ہے' میں زمین پر لیٹتا ہوں میری زنجیر الگ کر دو اور میری بہن کو میرے سینے پر سلا دو جب میرے جسم سے بابا کی خوشبو آئے گی میری بہن

گریہ بند کر دے گی۔ جب سکینہؑ سجاد کے سینے پر سوئی کافی دیر تک تو چپ رہی آخر سجادؑ کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کر دی اور ہاتھ جوڑ کر سجادؑ بھائی کی داڑھی کو بوسہ دے کر عرض کی' سجادؑ بھائی تم میرے بابا حسینؑ تو نہیں ہو مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ میرا بابا حسینؑ کہاں گیا ہے' جب سے میرے بابا گئے ہیں مجھے نیند نہیں آتی۔

وَسَیَعْلَمَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْنَ اَیَّ منقلب یَنْقَلِبُوْنَ o

❁......❁......❁

ساتویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

اللہ کے نام سے ابتداء کرتا ہوں جو رحمان و رحیم ہے۔

حدیث میں ہے کہ:

کل امر ذی بال لم یُبدابسم اللّٰہ فَھُوَا اَبتَر.

یعنی جو بھی اہم اور مشکل کام اللہ کا نام لئے بغیر یعنی بسم اللہ پڑھے بغیر کیا جائے تو وہ بے نتیجہ اور ناکام ہوگا۔

اس لئے مومن کو چاہئے کہ ہر جائز کام کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو پڑھا کرے اور ایک روایت میں مومن کی پانچ علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

زیارت امام حسین علیہ السلامؑ زیارت اربعین یعنی چہلم ۲۰ صفر کے دن زیارت امام حسینؑ۔ ختم بالیمین یعنی دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا (خواہ نگینہ کوئی ہو۔)

اکاون رکعت نماز ۱۷ فریضہ اور ۳۴ نوافل۔

باآواز بلند ہر جائز کام کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا۔

سجدہ شکر ادا کرنا چنانچہ منقول ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہر نعمت کی آمد اور ہر تکلیف کی دوری پر سجدہ شکر بجا لایا کرتے تھے۔

روایت میں ہے کہ حضرت پیغمبرؐ نے شب معراج کو ملاحظہ فرمایا کہ جنت کی چار نہریں پانی' شراب' دودھ اور شہد کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے چار لفظوں سے نکلتی ہیں۔ اور یہ اس شخص کو ملیں گی۔ جو کثرت سے بسم اللہ کو پڑھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت مجیدہ برکات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہیں جاتے ہوئے راستہ میں ایک قبر پر عذاب کے فرشتے نازل ہوتے دیکھے لیکن واپسی پر وہی قبر ملائکہ رحمت کی آماجگاہ تھی۔ پروردگار سے ملتجی ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے تو وحی ہوئی اے عیسیٰ! یہ ایک گنہگار کی قبر ہے۔ جو مرا تھا تو اس کی عورت حاملہ تھی اس کا بچہ پیدا ہوا۔ تو آج اس کے بچے نے استاد سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا درس پڑھا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ جس کا بیٹا زمین پر میرا نام لے اس کے باپ کو کیسے عذاب میں مبتلا رکھوں۔ خداوند کریم تمام مومنین کو توفیق دے کہ ان کے بچے والدین کی مغفرت کا سبب بنیں۔

حدیث میں ہے کہ قرآن مجید کے تمام علوم سورۂ فاتحہ میں ہیں اور اگر تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو قرآن کے مضامین کے پانچ مراکز ہیں۔

☆ توحید کا ذکر اور صفات پروردگار کا بیان۔

☆ قیامت کا ذکر اور جنت و نار کا تفصیلی تذکرہ۔

☆ دعوت عبادت و معرفت

☆ اللہ کے نیک اور اطاعت گذار بندوں کا ذکر خیر۔

☆ منافقوں' مشرکوں' اور کافروں کے قصے اور ان کا عبرتناک حشر سورۂ فاتحہ میں اجمالی طور پر یہ سب موجود ہے۔

توحید و صفات پروردگار کا اجمالی ذکر پہلی تین آیتوں میں موجود ہے۔

قیامت کا ذکر اور جزاء و سزا کی پیشکش کا اجمالی خاکہ آیت نمبر ۴ میں ہے۔

عبادت اور استعانت کا ذکر پانچویں آیت میں ہے۔

اس کے بعد صراط مستقیم پر چلنے والے اطاعت گزاروں کا ذکر ہے۔

اور آخر میں کفار و منافقین جو مغضوب علیہم اور ضالین ہیں' ان کا ذکر ہے

پس قرآن مجید کی تفصیلات سورۂ فاتحہ میں اجمالاً موجود ہیں اور حدیث مذکور میں ہے کہ فاتحہ کے علوم بسم اللہ میں ہیں اور بسم اللہ کا اجمال بائے بسم اللہ ہے اور اس کا اجمال نقطہ باء ہے اور علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ بائے بسم اللہ کا تحتانی نقطہ میں ہو۔

حروف تہجی میں الف کو اولیت اور با کو ثانویت حاصل ہے۔ جس طرح موجودات میں اولیت اللہ کے لئے اور ثانویت محمد مصطفیٰؐ کے لئے ہے۔ الف تنہا ہے اور باء کو نقطہ کے ساتھ مقرون کر کے اس کی احتیاج کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس طرح موجودات میں اللہ ایک ہے اور اس کی اول مخلوق انا و علی من نور واحد کا مرکب ہے۔ مقام وجود میں نقطہ تیسری جگہ پر ہے۔ پہلے الف پھر با کا حرف اور پھر باء کے نیچے نقطہ۔ اور نقطہ کا نیچے ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باء کا ماتحت ہے۔

لیکن مقام ظہور و اظہار میں نقطہ کی حرکت حروف و الفاظ و عبارات کے وجود کی موجب ہے اس لئے کہ قلم کاغذ سے مس ہوتے ہی نقطہ کو تشکیل دیتا ہے اور

نقطہ کی حرکت حروف و الفاظ بناتی ہے گویا نقطہ ہی مظہر تمام حروف ہے کیونکہ نقطہ حرکت نہ کرے تو نہ الف ظاہر ہوسکتا ہے نہ با اور نہ کوئی اور حروف۔

گویا حضرت علیؑ نے اپنے آپ کو نقطہ سے تشبیہ دے کر مقام ولایت کو ظاہر فرمایا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے:

کُنْتُ کنزاً مخفیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْق۔

یعنی میں مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں بس میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ پہچانا جاؤں تو مقام وجود میں اللہ قدیم اور سب سے پہلی مخلوق محمدؐ لیکن مقام معرفت وظہور میں جب تک علیؑ کی معرفت نہ ہوگی محمدؐ کی پہچان نہ ہوگی اور جب تک محمدؐ کی پہچان نہ ہوگی اللہ کی معرفت حاصل نہ ہوگی۔

جب انسان علیؑ کے مقام کو سمجھ لے گا تو خود سوچے گا کہ جب نائب اتنا بلند ہے تو وہ جس کا نائب ہے وہ کتنا بلند ہوگا اور پھر سوچے گا کہ ان کے خالق کا مقام کتنا عظیم ہوگا۔

اسی بناء پر حضورؐ نے فرمایا:

انا مدینة العلم وعلی بابها

"میں شہر ہوں علم کا اور علیؑ اس کا دروازہ ہے اور شہر میں جو بھی آنا چاہے اسے دروازے سے گزرنا ہوگا۔"

ایک حدیث میں یہ دعا تعلیم کی گئی ہے۔ اے اللہ تو مجھے اپنی معرفت عطا فرما کیونکہ تیری معرفت کے بغیر تیرے نبیؐ کی معرفت ناممکن ہے اور نبی کی معرفت عطا فرما کیونکہ نبی کی معرفت کے بغیر امام و حجت کی معرفت ناممکن ہے اور امام و حجت کی معرفت عطا فرما کیونکہ امام کی معرفت کے بغیر گمراہی کا ڈر ہے یہ علت سے

معلول تک پہنچنے کی صورت ہے۔

یعنی جب دلائل کی رو سے وجودِ خالق کا پتہ چل جائے تو عقل انسانی فیصلہ کرنے پر مجبور ہے کہ اس کے اور میرے درمیان اب کوئی واسطہ ضروری ہے جس کی بدولت اس کے احکامات کو سمجھ کر اس کی اطاعت کر سکوں۔ کیونکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی اور رابطہ ہی نہیں۔ پس نبیؐ کی پہچان ضروری ہے جو واسطہ ہے اور نبیؐ کے فرمائشات حاصل کرنے کے لئے اس کے لئے ایسے نائب کی تلاش ضروری ہے جو نبوی شریعت کی صحیح نشاندہی کر سکے اور وہ امامؑ ہے پس امامؑ کی معرفت گمراہی سے بچنے کا ذریعہ ہے اور اس کو معقولات کی زبان میں دلیل اِنّی کہا جاتا ہے۔

لیکن مقام ارتقا میں چونکہ انسان نیچے سے اوپر کو جاتا ہے تو دین کی تلاش کے لئے پہلے امام کو جاننا ضروری ہے تاکہ شرعی احکامات اس سے حاصل کئے جائیں پس امام نبی تک پہنچائے گا اور نبی خدا تک پہچاننے کا وسیلہ بنے گا۔ اور اس کو معقولات کی زبان میں دلیل لِمّی کہا جاتا ہے۔ گویا مقام معرفت میں دلیل لِمّی سے کام لیا جاتا ہے اور مقام اطاعت میں دلیل لِمّی سے کام لیا جاتا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ وسلبیہ کے سمجھنے کے بعد عقل کہتی ہے کہ اس عظیم برتر خدا کی جانب سے نامزد مبلغ وہ ہوسکتا ہے جو بے عیب اور صفاتِ کمالیہ کا تاحد امکان جامع ہو اور نبی کی صفات جمالیہ و جلالیہ سمجھنے کے بعد عقل فیصلہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بعد ایسے شخص کو وصی نامزد فرمائیں گے جو اوصاف نبوت کا حامل ہو اور یہ ہے علت سے معلول کی معرفت۔

اور مقام اطاعت میں امام کا کردار رسول کے کردار کا کاشف اور رسول کا کردار رضائے پروردگار کا کاشف ہوتا ہے پس امام کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی

دلیل ہے اور یہ ہے معلول سے علت کی پہچان۔

گویا حضرت علیؑ کا اپنے آپ کو نقطہ سے تشبیہہ دینا معلول سے علت کی طرف جانے کا ایک لطیف اشارہ ہے جیسا کہ ظاہر میں ب کے نیچے کا نقطہ با کی پہچان کا ذریعہ ہے۔

اور قرآن مجید کے علوم کا نقطے میں سمانا بھی غالبًا اسی طرف اشارہ ہے کہ نقطے کی حرکت حروف اور الفاظ اور کلمات و کلام کی تشکیل کرتی چلی جاتی ہے۔ جس سے آیات و رکوعات و پارے عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بس سمٹا ہوا ہے تو ایک نقطہ ہے اور جب پھیل گیا تو پورا قرآن بن گیا جس طرح بڑ کے چھوٹے سے بیج کے دانہ میں بڑ کا تناور درخت پنہاں ہے۔ جب مناسب زمین میں دفن ہوا تو عرصہ کے بعد عالم ظاہر میں ایک بہت بڑے درخت کا اس نے روپ دھارا۔ گویا وہ سمٹا ہوا ہے تو ایک رائی کے دانہ کے برابر ہے اور جب مناسب مقام پر اس کو پھیلنے کا موقعہ ملا تو وہ شاخوں، ٹہنیوں، پتوں اور پھل سمیت ایک بڑا درخت ہے۔ اسی طرح پورا قرآن سمٹا تو نقطہ نظر آیا اور پھیلا تو قرآن مجید کی شکل میں ظاہر ہو گیا اور حضرت علیؑ کا اپنے آپ کو نقطہ تحت الباء سے تشبیہہ دینا اسی امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ یہ علوم جو قرآن میں سمٹ جائیں تو علیؑ میں ہیں اور پھیلیں تو پورا قرآن ہیں۔

گویا کتاب خدا کاغذوں پر لکھا ہوا خاموش قرآن ہے اور علیؑ بولتا ہوا قرآن ہے۔

وہ قرآن کتاب صامت ہے اور علیؑ کتاب ناطق ہے۔

ہم نے شریعت محمدی یا ازواج سے یا اصحاب سے یا آل سے حاصل کرنی ہے۔ لیکن اصحاب کا تعلق پیغمبرؐ کے گھر کے باہر سے ہے اور ازواج کا تعلق صرف گھر

کے اندر تک محدود ہے۔ البتہ آل محمدؐ وہ ہیں جو گھر کے اندر بھی ساتھ ہیں اور گھر سے باہر بھی ساتھ ہیں۔ لہٰذا پیغمبرؐ کی زندگی اور کردار کی پوری ترجمانی نہ اصحاب کر سکتے تھے اور نہ ازواج کر سکتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق محدود ہے۔ پس آل محمد ہی ہیں جو حضورؐ کی پوری شریعت کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔

علیؑ نے فرمایا:

یَنْحَدِرُ عَنِّی السیل۔

"یعنی علوم قرآنیہ مجھ سے سیلاب بن کر نکلتے ہیں۔"

یہ الفاظ نہج البلاغہ میں خطبہ شقشقیہ کے ہیں۔ قرآن پاروں سے اور پارے رکوعوں سے اور رکوع آیات سے اور آیات الفاظ سے اور الفاظ حروف سے بنتے ہیں۔ لیکن حروف مقامِ ظہور پر کتاب میں نہیں آتے جب تک نقطہ حرکت نہ کرے۔

پس کہا جاسکتا ہے کہ پارے نہ ہوں تو قرآن نہیں بنتا، رکوع نہ ہوں تو پارے نہیں بنتے، الفاظ نہ ہوں تو رکوع و آیات نہیں بنتیں اور حروف نہ ہوں تو الفاظ معرض وجود نہیں آتے۔ اور نقطہ سکون و سکوت میں رہے تو حروف نہیں بنتے۔

اور یہ بھی قابل غور ہے کہ نقطہ جس باصرہ کے ادراک کی آخری حد ہے زمین سے بہت بڑا جسم فضا میں پرواز کرے تو دور جا کر گھٹتے گھٹتے نقطہ تک جا پہنچتا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں نقطہ نہیں بلکہ ایک پھیلا ہوا لمبا چوڑا جسم ہے۔

اب جو لوگ خدا کی رویت کے قائل ہیں ان کے لئے دعوت فکر ہے کہ جو حس کچھ دور جانے والے جسم کے متعلق دھوکا کھاتی ہے اور نقطہ و جسم میں تمیز نہیں کر سکتی۔ وہی حس اس اللہ کو کیسے دیکھ سکتی ہے جو نہ نقطہ ہے نہ جسم بلکہ نقطہ و جسم دونوں

کا خالق ہے۔

بس درک ظاہری کی آخری منزل میں جسم نقطہ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا علیؑ کا اپنے آپ کو نقطہ سے تشبیہ دینا اس طرف اشارہ ہے کہ میری حقیقت کا جائزہ لینے والو! جہاں تمہارے ادراک کی آخری حد ہے وہ مری منزل ہے ۔تو تم مجھے کیسے پا سکتے ہو اس بنا پر خطبہ شقشقیہ کے الفاظ میں ہے:

لَا یَرْقٰی اِلَیَّ الطَّیر۔

"یعنی تمہاری عقل کا بلند پرواز پرندہ میری منزل کو نہیں چھو سکتا اور لطف یہ کہ نقطہ ذرا اوپر چلا جائے تو نظروں سے اوجھل ہو کر غیب کے پردہ میں چلا جاتا ہے۔ اب ظاہر میں نگاہیں تو کہیں گی کہ فضا میں کچھ نہیں لیکن عقل کہے گی ہے ضرور البتہ نظر نہیں آتا۔ غبارہ زمین میں اڑانے والا جس کے ہاتھ میں تاگا ہے وہ تو ضرور کہے گا کہ پردۂ غیب میں ہے البتہ جن کے ہاتھ میں یہ رشتہ نہیں وہ اس کے غائب وجود کا انکار کرے گا۔

اب حدیث ثقلین میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ قرآن و اہل بیت جدا نہیں۔ پس جس کا قرآن سے تمسک ہے وہ تو کہتے ہیں کہ اگرچہ امام غائب نظر نہیں آتا۔ لیکن چونکہ قرآن موجود ہے۔ لہٰذا آل کا فرد موجود ہے جو امام وقت ہے پس آل کے وجود کا وہی انکار کر سکتے ہیں جن کا قرآن سے تمسک نہ ہو کیونکہ قرآن رشتہ ہے جب یہ موجود ہے تو اس رشتہ کا جس سے تعلق ہے وہ کیسے موجود نہ ہوگا۔ شاید انہی وجوہات کی بناء پر امیر شام نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نماز میں ہضم کر لیا۔ جس کی آج تک سنت و رسم باقی ہے۔

اور آئمہ طاہرین نے اپنے شیعوں کو بسم اللہ کے جہر سے پڑھنے کی تاکید

فرمائی تا کہ بسم اللہ کے نقطہ سے تمسک رکھنے والوں کو دوہرا ثواب ملتا رہے۔ اور حاسدوں کا دل جلتا رہے۔

امیر شام نے صرف بسم اللہ کی چوری پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ حضرت علیؑ کے واضح فضائل پر ڈاکہ ڈالنا اس کا دستور زندگی تھا۔ چنانچہ جب حدیث سازی کا کاروبار شروع ہوا تو ایسی احادیث جو دشمنانِ علیؑ کی شان میں وضع کی جائیں۔ ان پر احادیث سازوں کو لاکھوں روپے بطور انعامات اور عہدوں کی پیش کش کی جانے لگی اور دوسری طرف آل رسول بالخصوص حضرت علیؑ کی تنقیص پر عہدہ جات و مناصب کے علاوہ قرب بارگاہ اور انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی تو بے دین جاہ پرست اور لالچ و طمع نکلنے والے درباری راویوں نے اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے خوب سبقت لینے میں سعی بلیغ کی۔ چنانچہ ایک راوی نے جب امیر شام کے سامنے یہ موضوعہ روایت پیش کہ کہ من یشریٰ والی آیت۔ ایک دشمن علیؑ کے حق میں ہے اور اس سے پہلے والی آیت میں الد الخصام سے مراد علیؑ ہے یعنی واقعہ کے بالکل الٹ۔

تو امیر شام نے ایک لاکھ پھر تین لاکھ آخر کار راوی کے اصرار پر چار لاکھ کا سودا ہو گیا اور اسے چار لاکھ بیت المال سے دے کر رخصت کیا گیا۔

اور جس طرح کذاب راویوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ سچے اور صحیح راویوں کو یعنی آل محمدؐ بالخصوص حضرت علیؑ کے حق میں زبان کھولنے والوں کو سنگین سزائیں دلوائی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کو جملہ شہری حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا۔

میثم تمار جیسے مقدس مومن کا دلسوز واقعہ عبرت کے لئے کیا کم ہے اسے سولی پر چڑھا دیا گیا اور ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے ۔لیکن اس کی زبان نے فضائل

علیؑ کے بیان کرنے سے توبہ نہ کی۔ اور اس نے ظاہر کر دیا کہ سچے مومن کا سر کٹ سکتا ہے۔ لیکن ہزار ہا تشدد کے باوجود محبت علیؑ کے راستہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ بلکہ اس کے ناطق خون کا ہر قطرہ قیامت تک آنے والی نسلوں کو درس دے جاتا ہے کہ حق پر ڈٹ کر رہنا اور مصائب سہنا، مومن کا طرۂ امتیاز ہے۔

کربلا والوں نے اپنے زمانے کی سپر پاور یزیدی حکومت کی دین اسلام پر یلغار کو روکنے کے لئے، کوہ گراں کی طرح سینہ سپر ہو کر رہتی دنیا تک ایک مثال قائم کر دی کہ تشدد کی تلوار حق والوں کا خون بہا کر عارضی خوشی کے گن تو گا سکتی ہے لیکن حق کو دبا نہیں سکتی اور اس کے خلاف حق والوں کا خون کا ہر قطرہ تشدد کی تلوار کو کند کرنے میں کافی ہے۔ چنانچہ جام شہادت نوش کرنے والے تا ابد زندہ ہیں اور ان کا ذکر درخشندہ ہے اور تشدد کی تلوار کو نتیجہ کے طور پر شرمندگی اور لعنت کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

حسینؑ کی بہن اسیر ہوئی اور دربدر اس کی تشہیر کرائی گئی لیکن اس کی اسیری نے ہر چہار سو یزیدیت کے پرخچے اڑا دیئے اور حسینیت کا پرچم لہرا کر حسینؑ کی کامیابی کا لوہا منوا لیا۔

یہ عزم و استقلال کی ملکہ مصائب کے کوہ گراں کو پائے استحقار سے روندتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور شام کے گلی کوچوں سے گزر کر حسینیت کے وقار کا ڈنکہ بجا دیا۔

میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ کربلا سے شام تک حسین کی آنکھ کھلی رہی۔ لیکن جب شام سے ایک فرسخ یا تین فرسخ کے فاصلہ پر پیدل چلنے کا حکم ملا۔ تو بھائی کے نیزے کی طرف رخ کر کے کہا۔ حسین!

یہ تماشائیوں کا ہجوم بھی دیکھ اور میری خستہ حالی بھی دیکھ۔ چنانچہ روایات میں ہے:

کانت فی ارذل ثیابها.

"بی بی کے جسم پر لباس نہایت پرانا تھا"

اور واعظ نجف کے بیان کے مطابق رق برق لباس میں ملبوس کم و پیش ایک لاکھ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ بس بہن کی آواز سن کر حسینؑ نے آنکھیں بند کر لیں۔

فانعمضت عینا ابی عبداللّٰه.

تو بی بی نے کہا:

لا تغمض عینیک وانظر الیّ.

یعنی اب آنکھیں بند کرو۔ شاید مقصد یہ ہو کہ جب تیرا امتحان تھا میں نے آنکھ بند نہیں کی تھی۔ اب میرے امتحان میں آپ بھی آنکھیں بند نہ کریں۔

شاید یہ بھی کہا ہو کہ تیرے امتحان سے میرا امتحان سخت ہے کیونکہ تو مرد ہو کر مردوں سے لڑتا رہا اور میں پردہ دار ہوں، سامنے بے غیرت لوگ ہیں۔ یعنی تیرا امتحان تیری خاندانی روایت کے مطابق اور میرا امتحان میری خاندانی روایات کے مطابق نہیں ہے۔

گویا تو نوک نیزہ پر قرآن پڑھتا جا اور میں ہر موڑ پر تیری بے گناہی کے خطبے پڑھ کر تیرے نام سے باغی کا لفظ نہ دوں تو زینب نام نہیں۔

وسعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

آٹھویں مجلس

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ   اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً

''حق آیا اور باطل گیا کیونکہ حق کے مقابلہ میں باطل کے قدم ہمیشہ اکھڑ جایا کرتے ہیں۔''

حق کا واقعہ سے تعلق اور صدق کا زبان سے تعلق ہے۔

اگر واقعہ حق ہے تو زبان کا بیان صدق کہلائے گا اور واقعہ باطل تو بیان کذب ہوگا۔ اللہ ایک ہے۔ یہ واقعہ ہے۔ اور:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه..........

اس کا بیان ہے۔ چونکہ واقعہ حق ہے لہٰذا اس کا بیان صدق ہے۔

اسی طرح محمد رسول اللہؐ واقعہ میں حق ہے تو

اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّداً رَسُوْلَ اللّٰه.

بیان صدق ہے۔ اسی طرح:

عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰه.

واقعہ میں حق تو:

اَشْهَدُ اَنْ عَلِیًا وَّلِیُّ اللّٰه.

بیان صدق ہے۔ ظاہر ہے کہ واقعہ پہلے ہوگا اور بیان بعد میں ہوگا۔ لہٰذا حق پہلے اور صدق بعد میں۔ کیونکہ صدق جو ہے وہ حق کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ پس یہ نہیں ہوسکتا کہ بیان پہلے ہو اور حق بعد میں ہو یا ترجمان پہلے ہو اور واقعہ کا ظہور بعد میں ہو۔

یہ ناممکن ہے کہ ہم:

لا الہ الا اللہ

پہلے کہیں اور توحید بعد میں ہو۔

یا ہم محمد کی رسالت کی گواہی پہلے دیں اور بعد میں وہ رسول ہوں۔

یا ہم علیؑ ولی اللہ پہلے کہیں اور وہ درجہ ولایت پر بعد میں فائز ہوں۔ لہٰذا مانا پڑے گیا کہ صدق حق کے تابع ہے کیونکہ صدق کا تعلق بیان سے ہے۔ اور حق کا تعلق واقعہ سے ہے اور واقعہ بیان سے پہلے ہوتا ہے۔

اب پیغمبرؐ کے اس فرمان پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ:

علیٌ مع الحق وَالْحَقُّ مَعَهٗ يَدُوْرُ حَيْثُمَا دَارَ

یعنی علیؑ حق کے ساتھ ہے (حق کے پیچھے ہے) اور حق علیؑ کے ساتھ ہے (علیؑ کے پیچھے ہے) وہ ادھر مڑتا ہے جدھر علیؑ مڑے۔

اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ حق کا تقدم دلیل لمی کے طور پر ہے اور علیؑ کا تقدم دلیل انی کے طور پر ہے۔ یعنی حق کا وجود علیؑ کے کردار کی علت ہے۔ یعنی وہ حق تھا۔ لہٰذا علیؑ کو اس کے ماتحت ایسا کرنا پڑا اور اس کے برعکس علیؑ کا کردار حق کی علت

نہیں بلکہ حق کا کاشف ہے یعنی چونکہ علیؑ نے ایسا کیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ حق یہی تھا۔

جس طرح کہا جائے نبض کی تیزی بخار کی دلیل ہے اور بخار کا ہونا نبض کی تیزی کی دلیل ہے۔ یہاں بخار نبض کی تیزی کی علت ہے اور نبض کی تیزی بخار کی کاشف ہے۔

لیکن پیغمبر کا دونوں کو مساوی حیثیت دینا اور آخر میں یہ فرمانا کہ حق' اس طرف جاتا ہے جس طرف علیؑ جاتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ حق اس طرف ہوتا ہے جس طرف علیؑ جاتا ہے ۔ دونوں طرف سے علت کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا جس طرح یہ حق کے تابع ہیں۔ اسی طرح حق بھی ان کے تابع ہے اور اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

حضرت امام حسنؑ نے جب اپنا مقام ولایت بیان فرمایا اور کسی منافق نے شک کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے عورت مردوں کے مجمع سے نکل جا۔ یہاں امام کا فرمان جس واقعہ کا بیان ہے وہ پہلے موجود نہیں تھا۔ تاکہ وہ حق کے تابع ہو بلکہ امام کے فرمانے پر واقعہ بن گیا۔ پس واقعہ نے حق ہو کر گواہی دی کہ وہ ان کے تابع ہے۔

اسی طرح حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک شقی منافق کو فرمانا: اے کتے! نکل جاؤ۔ حالانکہ وہ پہلے کتا نہیں تھا لیکن اب کتا بن گیا۔ پس واقعہ نے حق بن کر ثبوت دے دیا کہ حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے دیوار پر لٹکی ہوئی شیر کی تصویر کو حکم دیا کہ فلاں کو نگل جا تو حق نے واقعہ کا لباس فوراً پہن لیا اور تصویر نے شیر بن کر دشمن کو ہڑپ کر لیا اور کپڑوں سمیت اس کو کھا

گیا۔ حالانکہ شیر کی فطرت گوشت خوری ہے نہ کہ لباس خوری۔

اسی طرح امام حسنؑ کے اشارہ سے دیوار کا سونا بن جانا ثابت کرتا ہے کہ ان کا بیان ہمیشہ حق کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ حق کی علت بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح جب بچوں نے لباس طلب کیا تو فاطمہؑ نے فرما دیا' تمہارا لباس درزی کے پاس ہے۔ بس واقعہ بن گیا اور تھوڑی دیر بعد رضوانِ جنت نے درزی کی حیثیت سے سلے ہوئے لباس پیش کر دیئے اور ثابت کر دیا کہ حق ان کے تابع ہے۔

ان کا مقام تو بہت بلند ہے ان کی کنیز نے پیغمبرؐ کو مدعو کر لیا تو واقعاً کھانا تیار ہو گیا اور در پر پہنچ گیا۔ اسی طرح امام زین العابدین علیہ السلام کا بلخی زوار کو کہنا کہ یہ ہیرے موتی جواہر اٹھا لو۔ حالانکہ پہلے پانی کے قطرات تھے پھر لعل و جواہر بن گئے اور ثابت ہو گیا جس طرح یہ واقعہ کے ترجمانی میں صادق ہیں تو واقعہ بھی ان کے قول کو حقیقت کا لباس دے کر حق بنتا ہے۔ بس یہ حق کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح واقعہ ان کے بیان کو حق کا لباس دے کر ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ باطل تشدد سے دب جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس حق تشدد کے بعد طاقت پکڑتا ہے۔ اور زیادہ ابھرتا ہے۔ حق میں تصنع نہیں اور باطل کا بغیر تصنع کے چارا نہیں۔

اس لئے کہ حق کے پاس دلائل ہوتے ہیں اور باطل تشدد کو استعمال کرتا ہے۔

طاقت حق نہیں' حق طاقت ہے۔ طاقت میں حق نہیں' حق میں طاقت ہے۔ طاقت سے حق نہیں ملتا بلکہ حق سے طاقت ملتی ہے۔

حق و باطل کی جنگ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن جس طرح ہمیشہ

باطل تشدد کو سامنے لاتا رہا اور حق کے سامنے نہ جھکا اس کے مقابلہ میں حق نے بھی ہر قسم کا تشدد برداشت کیا۔ لیکن باطل کے سامنے جھکا نہیں۔ چنانچہ ابراہیم نے آگ میں جانا قبول کر لیا۔ لیکن باطل نمرود کے سامنے سرنگوں نہ ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کا قتل کر کے حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پناہ لی۔ اور دس سال کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکی صفورا سے شادی کر کے واپس پلٹے تو کوہ طور کے دامن سے گذر رہے تھے کہ دور سے آگ کو دیکھا۔ بیوی کو وہاں روک کر خود تشریف لے گئے ۔ دیکھا تو درخت زیتون کی شاخوں سے آگ کے شعلے نمودوار ہیں۔ جب آگ والی شاخ کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو وہ شاخ پیچھے ہٹ جاتی۔ رات پرنم تھی۔ سردی زوروں پر تھی۔ آخر ندا آئی:

انا اللّٰہ رب العالمین۔

اللہ نے فرمایا:

فرعون کی طرف تبلیغ کے لئے جاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چھ سوالات کئے۔

☆ میں نے ان کا قتل کیا ہوا ہے۔ اس کا کیا بنے گا اللہ نے فرمایا: اس کی فکر نہ کرو۔

☆ تبلیغ کے لئے دستاویز چاہئے؟ اللہ نے تورات عطا فرما دی۔

☆ میری زبان میں لکنت ہے؟ اللہ نے فرمایا اس کی پروا نہ کرو۔

☆ معجزہ چاہئے؟ اللہ نے فرمایا' عصا کو ڈالو اژدھا بنے گا۔

☆ کوئی اور معجزہ؟ فرمایا ہاتھ کو بغل میں ڈالو ید بیضا ہو گا۔

☆ میں اکیلا ہوں' ساتھی عطا فرما؟ اللہ نے فرمایا' جو چاہو ہوگا؟ عرض کی (یار نہیں) بھائی چاہئے۔ اللہ نے فرمایا:

ہارون کو ساتھ لو' اور جاؤ۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے معصومؑ سے یہی وجہ پوچھی کہ موسیٰ و ابراہیم علیہ السلام دونوں اولوالعزم پیغمبر تھے۔ اور دشمن بھی دونوں کے سرکش تھے۔ لیکن جب موسیٰ کو حکم ہوا کہ تبلیغ کے لئے جاؤ تو انہوں نے یکے بعد دیگرے ۶ دفعہ معذرت پیش کی اور اللہ نے تسلی کرائی۔ تب گئے۔ لیکن اس کے برعکس جب ابراہیم کو حکم ہوا تو فوراً عرض کی:

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْن۔

اور عذر پیش نہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

ابراہیمؑ کی پیشانی میں محمد وآل محمد کا نور تھا۔

حضرت پیغمبرؐ نے بھی ایک دفعہ علیؑ سے فرمایا۔ یا علیؑ تیری جرأت کے کیا کہنے کہ سورۂ برات کی تبلیغ کے لئے جب بھیجا گیا تو تو نے مکہ میں کوہ صفاء کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اہل مکہ سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں علیؑ بن ابی طالبؑ ہوں ۔ (حالانکہ گھر گھر سے ان کے اکابر کو آپ قتل کر چکے تھے۔) اور پھر جرات مندانہ انداز سے سورۂ برات کا پڑھنا یہ آپ ہی کا حصہ ہے اور منفرد کارنامہ ہے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قتل کیا تھا اور فرعون کے پاس مبلغ بن کر جانے سے ڈرتے رہے۔

اس سے مجھے ایک بات یاد آئی کہ فتح مکہ کے دن حضور نے بعض لوگوں کے قتل کی عام اجازت دی تھی خواہ وہ غلاف کعبہ سے بھی چمٹے ہوئے ہوں۔ دو کافر

آدمی جناب ام ہانی کے گھر میں پناہ گزین تھے۔ حضرت علیؑ علیہ السلام نے کپڑے سے منہ لپیٹ کر تلوار علم کر کے ان دونوں کو قتل کرنے کے لئے ام ھانی کے گھر میں داخل ہونا چاہا تو ام ہانی نے بازو پکڑ لیا اور کہا کہ میں اندر نہ جانے دوں گی اور رسول اللہؐ سے تیری شکایت کروں گی۔ علیؑ نے منہ سے کپڑا اٹھایا تو ام ہانی نے پہچانتے ہوئے معافی مانگ لی اتنے میں وہ دونوں کافر فرار ہو گئے اور جب رسول اللہ کے سامنے ام ہانی نے یہ ماجرا بیان کیا تو پیغمبرؐ نے علیؑ سے پوچھا۔ حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ:

ام ہانی نے اس زور سے میرا بازو پکڑا تھا کہ چھڑاتے چھڑاتے وہ دونوں کافر نکل کر بھاگ گئے۔ پس پیغمبرؐ نے فرمایا:

اگر تمام لوگ حضرت ابوطالب کی نسل سے ہوتے تو دنیا کا کوئی آدمی بزدل نہ ہوتا۔

بہرکیف حق بہت بڑی طاقت ہے اور تشدد و طاقت سے گردنیں جھکائی جاتی ہیں۔ لیکن حق دلوں کو جھکا لیتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے اعلان جنگ قبول کرنے کے لئے اپنی کم تعداد فوج کو چھٹی دے دی۔ حالانکہ سلاطین کا قطعاً یہ دستور نہیں۔ کیونکہ حسین علیہ السلام یہ یقین دہانی کرانا چاہتے تھے کہ حق کی جیت طاقت سے نہیں بلکہ دلائل سے ہوتی ہے اور باطل کی جیت ہمیشہ کثرت فوج اور طاقت کے استعمال سے ہوتی ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنا خواب بیان فرمایا:

کہ موت تیزی سے ہماری طرف آ رہی ہے تو علیؑ اکبر نے عرض کی:

اَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ.

کیا ہم حق پر نہیں؟

امام نے فرمایا:

بے شک ہم حق پر ہیں تو علی اکبرؑ نے جواب دیا:

اِذَنْ لانُبَالِي.

پھر ہمیں موت کی کوئی پروا نہیں۔

گویا شہزادے نے اپنے دادا کا جملہ دوہرایا۔ جب محمد بن حنیفہ نے پوچھا تھا۔ کہ آپ باریک لباس میدان جنگ میں کیوں زیب تن فرماتے ہیں تو علیؑ نے جواب دیا تھا:

اَبُوكَ لَا يُبَالِي وَقَعَ عَلَى الْمَوْتِ اَمْ وَقَعَ عَلَيْهِ الْمَوْتِ.

"(اوکما قال) یعنی اے فرزند تیرے باپ کو پروا نہیں کہ وہ موت پر کود پڑے یا موت اس پر آ پڑے۔"

جب شہزادہ قاسم سے امام نے دریافت کیا کہ موت کیسی چیز ہے تو قاسم نے جواب دیا کہ:

اَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ.

یعنی موت شہد سے بھی شیریں تر ہے۔

حبیب بن مظاہر نے مسلم بن عوسجہ سے کہا' اگر مجھے اپنی زندگی کا یقین ہوتا تو تجھ سے وصیت کی خواہش کرتا پس مسلم نے جواب دیا آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر مجھے آپ کی زندگی کا یقین ہوتا تو میں اپنے گھر والوں کی وصیت کرتا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ:

اَوصیک بھذا الرجل۔

میں تو اس شخص (حسین) کی وصیت کرتا ہوں کہ اس کو نرغہ اعداد میں چھوڑ کر نہ جانا۔

مسلم بن عوسجہ کا غالباً نو عمر فرزند تھا جس نے امامؑ کے قدموں پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ تو امام نے فرمایا۔ اپنے باپ کی شہادت کے بعد مجھے اپنا باپ سمجھو۔ بچے نے عرض کیا۔ پرسہ لینے کی غرض سے میں حاضر نہیں ہوا بلکہ اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے جہاد کا اذن عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:

تیری بیوہ ماں' تیرا داغ مفارقت برداشت نہ کر سکے گی۔ تو بچے نے عرض کیا وہ سامنے خیمہ کے دروازے پر میری ماں کھڑی ہے جس نے مجھے میدانِ جنگ کے لئے تیار کر کے بھیجا ہے۔ بالوں میں کنگھی کی' آنکھوں میں سرمہ لگایا اور چھوٹی سی تلوار میرے گلے سے لٹکائی اور بار بار کہتی تھی کہ میں اس وقت راضی ہوں گی جب تیری لاش میرے قدموں میں پہنچے گی۔

جب زینب عالیہ نے حسین سے عرض کیا کہ کافی لوگ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اب جو بچے ہیں یہ تو نہ چھوڑ جائیں گے؟ پس حبیب ابن مظاہر کو خبر ہوئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے باب زینبیہ پر لایا اور آواز دی۔ اے خاندان عصمت کے شہزادیو! یہ غلام دروازہ پر موجود ہیں۔ اگر آپ کو ہماری وفا کا یقین نہیں آتا تو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں۔ جب بی بی نے سنا تو صحابہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

بی بی جب روئی تو امام حسین نے ازراہِ تسکین فرمایا:

پہلے چار بزرگ محمدؐ' علیؑ' فاطمہؑ' حسنؑ چلے گئے۔ تو آپ نے صبر

کیا۔ اب میں چلا جاؤں تو صبر کرنا۔ بی بی نے عرض کی حسینؑ ان کے جانے میں اور آپ کے جانے میں بڑا فرق ہے۔ جب نانا کی رحلت ہوئی تو اماں کا سہارا تھا اور اماں کے بعد ابا کا سہارا تھا پھر ابا جان کے بعد حسنؑ کا سہارا تھا اور حسنؑ کی شہادت کے بعد آپ کا سہارا رہا۔ اب جب آپ جائیں گے تو فرمایئے میرا سہارا کون ہو گا۔ اس کے بعد سخت گریہ کیا۔

حسین علیہ السلام اچانک خیمہ سے باہر نکلے اور تلوار علم کر کے خیمہ کے پیچھے کی طرف چند قدم گئے اور رکے۔ ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر تلوار کی نوک کو زمین میں گاڑا اور دوسرے ہاتھ سے ریش اقدس کو پکڑا' اپنی بہن کے خیمہ کی پشت کو کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ نافع بن ھلال جملی کا بیان ہے کہ میں بھی حسینؑ کے پیچھے آ کر قریب کھڑے ہو کر دیکھتا رہا۔ اچانک حسین نے سرد آہ کھینچی اور رونا شروع کر دیا۔ نافع کہتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ قبلہ!

کیا وجہ ہے کہ آپ نے خیمہ زینبیہ کی پشت پر نظر جما کر سرد آہ کھینچی اور رو دیئے۔ آپ نے فرمایا:

جب زینب جیسی بہن ہو تو حسینؑ جیسا بھائی کیوں نہ روئے۔ جبکہ میں سوچ رہا ہوں کہ کل جب ہم سب شہید ہو جائیں گے تو اس پردہ دار کے پردہ کا کیا بنے گا!

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

نویں مجلس

زَیِّنُوا مجالسکم بذکر علی بن ابی طالب فان وذکرہ ذکری وذکری ذکر اللہ وذکر اللہ عبادہ.

یعنی اپنی مجالس کو علیؑ بن ابی طالب کے ذکر سے مزین کرو۔ کیونکہ اس کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کا ذکر عبادت ہے۔

زینت کا معیار بدلتا ہے کیونکہ ہر دماغ کے نزدیک زینت کا معیار الگ ہے۔ مثلاً بچہ ہے تو وہ زمین پر بیٹھنا اور اس پر لیٹنا زینت سمجھتا ہے پھر بڑا ہو کر جب اس کا ذہن بدلتا ہے تو معیار زینت بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً کرسی و بستر پر بیٹھنا زینت سمجھتا ہے۔ پھر ایک زمانے میں عیاشی اور کھیل کود کو زینت سمجھتا ہے۔ پھر ضعیفی کے زمانے میں عبادت و قرآن خوانی اس کی زینت ہوتی ہے۔

نبی وہ ذات ہے جس کا جوانی و ضعیفی میں معیار زینت ایک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عقل ناقص نہیں ہوا کرتی۔ پس جو کسی دور میں اس کے دماغ پر شک کرے وہ خود بد دماغ ہے۔

پس اس نبی کا فرمان ہے علیؑ کے ذکر سے مجالس کو زینت دو۔

یعنی زینت،

نہ گھوڑوں سے،

نہ جوڑوں سے،

نہ محلات سے،

نہ اولاد سے،

نہ زر و دولت سے،

نہ حسین لباس سے،

بلکہ تم مجالس کو علیؑ بن ابی طالب کے ذکر سے زینت دیا کرو۔

خواہ مجلس

ایک آدمی کی ہو،

سو آدمیوں کی ہو،

دس آدمیوں کی ہو،

(سو آدمیوں کی ہو،)

یا ہزاروں اور لاکھوں کی،

اسی طرح جنگل کی مجلس ہو، یا گھر کی مجلس ہو،

امام بارہ ہو، یا مسجد،

زمین کی مجلس ہو، یا عرش بریں کی،

مجلس کی زینت ہے ذکر علی۔

سوال ہوتا ہے کہ حضور پیغمبرؐ کا یہ فرمان کیسے ہوسکتا ہے جبکہ علیؑ کے ذکر سے افضل ذکر رسول اللہؐ کا ذکر ہے اور رسول اللہ کے ذکر سے افضل ذکر اللہ کا ذکر ہے تو

انہوں نے افضل کو چھوڑ کر مفضول کو کیسے مجالس کی زینت قرار دیا؟

جواب یہ ہے کہ یہاں تین دائرے ہیں۔ ایک بڑا دائرہ' پھر اس کے اندر دوسرا دائرہ' پھر اس کے اندر تیسرا دائرہ۔ بس جو چیز بڑے دائرے کے اندر ہو ضروری نہیں کہ درمیانہ دائرہ کے اندر بھی ہو۔ لیکن جو چیز درمیانہ دائرہ کے اندر ہو گی وہ بڑے دائرہ کے اندر ضرور ہو گی۔ لیکن ضروری نہیں کہ چھوٹے دائرے کے بھی اندر ہو۔ البتہ جو چیز تیسرے چھوٹے دائرہ کے اندر ہو گی وہ اپنے سے بڑے دونوں دائروں کے اندر ہو گی۔

توحید (لا الہ الا اللہ) کا دائرہ وسیع ہے اس میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو اللہ کو ایک مانتے ہیں۔ اس کے اندر رسالت (محمد رسول اللہ) کا دائرہ ہے اور جو اس دائرہ میں داخل ہیں وہ اس سے باہر والے توحید کے دائرہ میں بھی داخل ہیں اور اس کے بعد آخری دائرہ ولایت (علیؑ ولی اللہ) ہے اور جو لوگ آخری دائرہ ولایت میں داخل ہوں وہ دائرہ نبوت و توحید دونوں میں داخل ہونگے۔ پس جو علیؑ ولی اللہ پڑھے گا اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے محمد رسول اللہ اور اس سے پہلے لا الہ الا اللہ پڑھے۔ لہٰذا علیؑ کا ذکر رسول اللہ کے ذکر کو اور رسول کا ذکر اللہ کے ذکر کو مستلزم ہے۔

سوال ہوتا ہے کہ تم علیؑ کا نعرہ "یا علی" کیوں لگاتے ہو؟ حالانکہ علیؑ خود نعرۂ اللہ اکبر لگایا کرتے تھے۔ تو میں کہوں گا بے شک جب علیؑ احد و بدر وغیرہ میں مشرکین سے لڑے تو ان کا نعرۂ اللہ اکبر تھا کیونکہ جو مقابل تھے اللہ کی کبریائی کے مخالف تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلہ میں لا الہ الا اللہ کے منکر نہیں۔ تا کہ ہم نعرۂ تکبیر سے ان کو قائل کریں اور ہمارے مقابلہ میں نبوت کے منکر نہیں تا کہ ہم نعرۂ

رسالت سے ان کو قائل کریں بلکہ ہمارے مقابلہ میں ولایت علیؑ کے منکر ہیں۔ بس ہم اپنی مجالس میں "نعرۂ حیدری یا علیؑ" لگاتے ہیں۔

علیؑ کے نام کے ساتھ ابن ابی طالبؑ کا کہنا ایک نقطہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ جس مقام پر کسی کی تعریف کی جاتی ہے۔ متکلم فصیح و بلیغ و موقع شناس و دانشمند کے لئے نازیبا ہے کہ تعریف کے مقام پر اس کے اوصاف حسنہ بیان کرتے ہوئے اس کا کوئی ایسا پہلو بیان کر دے جس میں اس کی منقصت ہو۔ مثلاً فلاں آدمی بڑا شریف' بڑا نیک' بڑا دیانت دار نمازی تہجد گزار ہے اور ساتھ ہی کہہ دے کہ جو فلاں چور یا ڈاکو کا بیٹا ہے تو یہ کہنے سے سابقہ اوصاف کو سن کر سامعین جس قدر متاثر ہوئے ہوں گے اس کا سر بھی شرم کے مارے جھک جائے گا۔ پس اس کی وہ شان نہ رہے گی جو ہونی چاہیے تھی۔

اس مقام پر پیغمبرؐ علیؑ کی تعریف کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ علیؑ کے ذکر سے مجالس کو زینت دیا کرو۔ پس حضرت ابو طالب کے ایمان و وفا میں اگر حضور کو شک ہوتا یا ان کے کافر ہونے کا یقین ہوتا تو ابن ابی طالب کہنے سے گریز کرتے تا کہ نہ سامعین کے دماغوں میں علیؑ کی منقصت کا پہلو داخل ہو اور نہ حضرت علیؑ یہ سن کر خفت محسوس کریں۔ گویا پیغمبرؐ نے تعریف کے مقام پر علیؑ ابن ابی طالب کہہ کر واضح کر دیا کہ ابو طالبؑ کا ایمان شک و ریب سے بالاتر ہے ورنہ اس مقام پر ان کا نام نہ لیا جاتا۔

اور خود حضرت علیؑ بھی مقام فخر میں اپنے والد ماجد ابو طالب کا نام لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ نے جنگ جمل میں اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کو جنگ میں لڑنے کا ڈھب تعلیم فرمایا (کیونکہ جنگ جمل علیؑ کی

اولاد کے لئے ایک تربیتی کورس تھا اس لئے کہ سابق حکومتوں میں ان کو نہ فوجی خدمت کا موقع ملا اور نہ کسی محاذ پر گئے) نہج البلاغہ کے الفاظ ہیں:

تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَلَا تَزُلْ فِی الْاَرْضِ قَدَمَکَ اَعِرِ جُمْتَکَ لِلّٰهِ وَارْمِ بِبَصَرِکَ اَقْصَی الْقَوْمِ وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ.

☆ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں لیکن تیرا قدم اپنے مقام سے پیچھے نہ ہٹے۔

☆ زمین میں اپنے قدم اس طرح گاڑ دو جس طرح میخ لکڑی میں گڑ جایا کرتی ہے۔

☆ اپنے سر کو عاریۃً اللہ کو دے دو (یعنی اپنے مرنے کی فکر نہ کرو اور موت سے نہ ڈرو)

☆ لڑتے ہوئے دشمن کے آخری سپاہی تک نظر رکھو۔ تاکہ دشمن کا ہر سپاہی سمجھے کہ علیؑ کے شیر کی تلوار میرے سر پر منڈلا رہی ہے۔

☆ اپنی شجاعت پر بھروسہ نہیں' بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھو اور یقین کر لو کہ مدد اس کی جانب سے ہوتی ہے۔

پس علیؑ نے اپنے شیر فرزند کو گھوڑے پر سوار کیا اور تلوار آبدار و شرربار عطیہ پروردگار عطا فرما کر میدان کارزار کی طرف روانہ فرمایا اور ایک مقام بلند پر کھڑے ہو کر جنگ کا نقشہ دیکھتے رہے جب محمد میدان سے انتہائی کامیابی کے ساتھ واپس پلٹے تو علیؑ اسی گھوڑے پر وہی تلوار لے کر میدان کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا:

میری جنگ بھی بلند مقام پر کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا چنانچہ جب شاہ مردان و شیر یزداں نے دشمن کی فوجوں کا صفایا کر دیا اور

میدان سے واپس آئے تو بقول بعض واعظین نے محمد بن حنفیہ سے فرمایا:

بیٹے دیکھو علیؑ کے بیٹے اس طرح لڑتے ہیں جس طرح تم لڑے ہو۔ لیکن ابو طالب کے بیٹے اس طرح لڑتے ہیں جس طرح میں نے جنگ کی ہے۔

علیؑ نے مدح کے مقام پر اپنے بیٹے کے سامنے اپنے باپ کی شجاعت پر فخر کیا۔

بقول بعض واعظین کے' اس کے بعد تیر کمان محمد بن حنفیہ کو دی اور فرمایا کہ عائشہ کے اونٹ کے زانو میں تیر مارو۔ تاکہ وہ پیا ہو اور مسلمان قتل سے بچ جائیں۔ محمد بن حنفیہ نے تیر مارا۔ لیکن نشانے پر نہ لگا۔ پس آپ نے حسنؑ کو حکم دیا چنانچہ حسن کا تیر نشانہ پر لگا۔ اگرچہ یہ جنگ دونوں کے لئے تربیتی کورس تھا۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معصوم اپنے کمال میں تجربہ کا محتاج نہیں ہوتا اور غیر معصوم تجربہ کا محتاج ہوتا ہے۔

پس محمد کا سر خجالت سے جھکا اور پیشانی پر عرق کے قطرات نمودار ہوئے تو علیؑ نے یہ کہہ کر محمد کو تسلی دی اور اس کی دلجوئی کی کہ تو اس کے برابر نہیں کیونکہ تو میرا بیٹا ہے اور وہ محمد کا لخت جگر ہے اور حسن کی کامیابی تیرے لئے باعث شرم نہیں بلکہ باعث فخر ہے۔

اس کے بعد تازیست محمدؒ نے بابا کا یہ فرمان یاد رکھا اور کبھی حسنینؑ کی برابری کا تصور تک نہ کیا۔

چنانچہ جنگ صفین میں ترقی کر کے محمد بن حنفیہ علیؑ کی فوج کا جرنیل تھا اور

پوری کائنات میں علیؑ واحد سلطان ہے جس نے میدان جنگ میں اپنی اولاد کو لڑایا اور خود بھی لڑے۔ پس علیؑ نے فرمایا:

بیٹے! میدان کارزار میں گھس جاؤ اور شعلۂ جوالہ بن کر دشمن کی فوج کے میسرہ پر ٹوٹ پڑو۔ چنانچہ محمد نے میسرہ دشمن پر بھرپور حملہ کیا اور جان کی بازی لگا کر خوب لڑے۔ جب میسرہ پر فتح پا کر واپس پلٹے تو زرہ کے سوراخوں سے خون رس رہا تھا اور سینہ زخموں سے چور تھا پانی مانگا تو شیر خدا نے اپنے نوجوان کو اپنے سینے کا سہارا دے کر اپنے ہاتھوں سے جام شربت دیا۔

محمد نے پیا تو علیؑ نے فرمایا:

بیٹے میدان جنگ میں سستی مناسب نہیں۔ اب فوراً دشمن کے میمنہ پر حملہ کر دو چنانچہ محمد نے تعمیل حکم کے لئے شیر بیشۂ شجاعت کی طرح دشمن کے میمنہ کو للکارا اور میدان میں گھس گئے چنانچہ اپنی ہمت اور خداداد شجاعت کے جوہر دکھا کر فوجوں کا صفایا کر کے واپس پلٹے تو پھر علیؑ نے اپنے پیارے بیٹے کو پانی پلایا۔ اس دفعہ زخموں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور خون ابل رہا تھا۔ لیکن علیؑ نے فرمایا:

بیٹے! سستی کو دور کرو اور جا کر آخری حملہ قلب لشکر پر کرو۔

چنانچہ علیؑ کے شیر نے دشمن کی ٹڈی دل فوج کو تھوڑی دیر میں پسپا کر دیا اور فاتحانہ انداز سے واپس آئے تو مولاؑ نے فرمایا:

بیٹے اب الگ خیمے میں جا کر آرام کر لو۔ چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے

الگ خیمہ میں جا کر آرام کیا۔

اتنے میں ایک منافق نے موقعہ پا کر محمد بن حنفیہ کو بہلانے کی کوشش کی اگرچہ ظاہراً زبان میں محبت تھی لیکن دل میں دشمنی علیؑ موجود تھی۔ کہنے لگا تمہارے باپ نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ کیونکہ ان کو تمہارے ساتھ محبت کم ہے اور حسن و حسینؑ زیادہ پیارے ہیں۔ ان کو خیمے میں بٹھائے ہوئے ہیں اور تمہیں تین بار مسلسل موت کے منہ میں دھکیلتے رہیں۔ اپنے جسم کی حالت تو دیکھو کہ کوئی جگہ زخموں سے خالی نہیں۔ مناسب یہ تھا کہ ایک دفعہ تمہیں اور ایک دفعہ ان کو بھیجتے۔

یہ سننا تھا کہ علیؑ کے شیر کے تیور بدلے اور پیشانی پر بل آیا فرمایا:

او نابکارا میرے امامؑ بابا کے حق میں نازیبا الفاظ استعمال نہ کر۔ وہ حق ہے اور حق کے ساتھ ہے۔ حسنین کا سائے میں بٹھانا حق ہے اور مجھے لڑانا حق ہے۔ (الفاظ اگرچہ میرے ہیں لیکن مضمون روایت اسی طرح ہے۔

اس شخص نے عرض کیا: اے فرزند امیر المومنینؑ مجھے سمجھایئے تو! حضرت محمد بن حنفیہ نے سمجھانے کے انداز سے پوچھا۔ بتاؤ تمہارے جسم کے تمام اعضاء تمہیں پیارے ہیں یا کچھ پیارے ہیں۔ اور کچھ نہیں؟ اس نے کہا کہ سب پیارے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم ہمیشہ چلنے کی خدمت پاؤں سے لیتے ہو۔ کبھی تو یہ خدمت سر یا ہاتھوں سے لیا کرو۔ اس نے عرض کیا: پاؤں چلنے کے لئے پیارے ہیں، یہ ان کی ڈیوٹی ہے۔

آپ نے فرمایا:

اگر دشمن تیر چلائے اور وہ تیری تمہاری آنکھ کی طرف آ رہا ہو تو کیا کرو گے؟ کہنے لگا ہاتھ کو ڈھال بنا کر آنکھ کو بچالوں گا۔

آپ نے فرمایا: اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں آنکھ پیاری ہے۔ ہاتھ پیارا نہیں۔ اس نے عرض کیا ہاتھ اس لئے پیارا ہے کہ سر کے لئے ڈھال بنے۔

آپؑ نے فرمایا:

یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔ دیکھو حسنینؑ شریفین علیؑ کی آنکھیں ہیں اور میں علیؑ کا ہاتھ ہوں۔ جب تک ہاتھ میں حس وحرکت موجود ہے آنکھیں محفوظ رہیں گی۔

بہرکیف موضوع میرا بیان یہی تھا کہ علیؑ کا ذکر زینت مجالس ہے۔

اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہی علیؑ جیسا امامؑ دیا اور یہ وہ نعمت ہے جس کا شکر ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر تخلیق آدمؑ سے قیامت تک زندگی ہو اور پوری زندگی عبادات خدا میں بسر ہو تو جسم گل سڑ جائے' ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔ خون خشک ہو جائے پھر اتنی لمبی عبادات کے باوجود اللہ کی طرف سے اس نعمت کا شکر ادا نہیں ہوسکتا کہ اس نے ہمیں علیؑ نے ایسا امام عطا فرمایا ہے۔

دیکھئے ہر زمین کاشت ہونے والے بیجوں کی مزاج شناس ہوتی ہے۔ اس بیج کو اور اسی پودے کو پروان چڑھاتی ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہو۔ پس کاشت کار وہی کامیاب ہے جو زمین کا مزاج شناس ہو۔ پہلے دیکھے کہ یہ زمین کس بیج کے لئے موزوں ہے پھر وہی بیج کاشت کرے ورنہ ناموزوں بیج کا زمین کے پیٹ میں گل سڑ جانا' زمین کا قصور نہیں' بلکہ اس کاشتکار کا قصور ہے جس نے زمین کے مزاج کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی یا زمین کا مزاج جاننے کے باوجود اس میں ناموزوں بیج کی کاشت کی۔ ہمیں تجربہ ہے کہ بعض زمینیں گندم کے لئے موزوں ہیں

لیکن چنے کے لئے ان فٹ (Unfit) ہیں۔ بعض چاول پیدا کرتی ہیں۔ اور کپاس کے لئے موزوں نہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بس ہر زمین میں وہی پورا پروان چڑھتا ہے۔ جو زمین کے مزاج کے موافق ہو۔

اے شیعو! تمہارے دل و دماغ کی زرخیز زمین شجرۂ طیبہ یعنی ولائے محمدؐ و آل محمدؐ کے لئے موزوں ہے۔ اس میں شجرۂ خبیثہ اگ ہی نہیں سکتا' کیونکہ اس زمین کا مزاج شجرۂ خبیث کو قبول ہی نہیں کرتا۔

لیکن یاد رکھو! اگر دل میں شجرۂ طیبہ یعنی ولائے محمدؐ و آل محمدؐ ہے تو اس شجرہ کا پھل بھی ایسا ہونا چاہئے جو اس شجرہ سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایسا پھل نمودار نہ ہو جو شجرہ خبیثہ سے مناسبت رکھتا ہو۔ بس یہ شجرہ نماز کے لئے ہے' اور روزہ کے لئے ہے' نیک اعمال کے لئے ہے۔ اس شجرہ پر بے حیائی اور بدکاری کا ثمرہ نہیں لگ سکتا کیونکہ نجس پھل شجرۂ خبیثہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔

عزادار کے دل میں قبر حسینؑ ہے تو نجس غذا' یا شراب پیتے وقت وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ یہ شراب کس کی قبر پر گرا رہا ہوں۔ یا اس نجس غذا کے ذرات کس قبر پر گر رہے ہیں۔

بعض لوگ نماز نہ پڑھنے کا کا عذر یہ بتاتے ہیں کہ ہمیں نماز میں خیالات آتے۔ لہٰذا ایسی نماز مقبول ہی نہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ تمہارے دل و دماغ کی زمین کو ولائے علیؑ کی وجہ سے وہ زرخیزی نصیب ہے کہ اس میں نیکی کا ہر بیج کامیاب ہے۔ اور ایک کے بدلے میں ہزاروں' لاکھوں گنا نصیب ہوگا۔ البتہ ان لوگوں کی عبادات نماز و روزہ وغیرہ بیکار ہیں جن کے دلوں میں ولائے علیؑ نہیں اور ان کی زمین دل شور ہے۔ بس ان کا ہر عمل ضائع اور برباد ہوگا۔ چنانچہ معصومؑ نے

فرمایا:

> اگر ستر نبیوںؑ کے اعمال کے برابر اعمال بھی اس کے نامہ اعمال میں ہوں لیکن ہماری ولا نہ رکھتا ہو تو اعمال کی گٹھڑی سمیت اوندھے منہ جہنم میں گرا دیا جائے گا۔

آپ لوگ زرخیز زمین پر نگاہ کریں جس میں گندم بوئی گئی ہے۔ تو کیا وہ زمین گندم کے علاوہ کسی دوسری بوٹی کو پیدا نہیں کرتی؟ ہم نے دیکھا ہے گندم کے علاوہ ہزاروں بے کار جڑی بوٹیاں اور خود رو پودے اس میں کاشتکار کی مرضی کے خلاف اُگ آتے ہیں۔ مختلف ادویہ کا سپرے کرکے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' پھر بھی وہ بچ جاتے ہیں۔ یہ زمین کی خاکی فطرت ہے۔ لیکن کبھی زمیندار ان کی اس فطرت سے تنگ آ کر گندم کاشت کرنے سے بخل نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ زمین اپنی خاکی فطرت نہیں چھوڑے گی۔ تاہم جب فصل کے پکنے کا وقت آئے گا تو وہ غلط بوٹیاں اور بیکار پودے گل سڑ جائیں گے اور مجھے پوری فصل نصیب ہوگی۔ لہٰذا زمین کی فطرت سے مجھے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

اے مومن! اسی طرح تیرے دل و دماغ کی زمین ایمان اور ولائے علی کے صدقہ میں انتہائی زرخیز ہے۔ جب تو نے اس میں نماز کی کاشت کی تو اس نے اپنی خاکی فطرت کے ماتحت غلط قسم کے خیالات لانے شروع کر دیئے اور یہ خیالات زمین کی انہی بے کار بوٹیوں کی مثال ہیں۔ کیونکہ اس جسم کی فطرت خاکی ہے نوری نہیں۔ لہٰذا ان فضول خیالات کے ڈر سے اپنی ایمان کی زرخیز زمین کو نماز اور دیگر عبادات کی کاشت سے محروم نہ کرو۔ بروز قیامت جب ان عبادات کے فصل کی برداشت ہوگی۔ تو غلط خیالات مر جائیں گے اور تمہیں جزا پوری ملے گی۔ لہٰذا تجھے

گھبرانے کی کی ضرورت نہیں؟ تم اپنا کام کرو اور یہ خاکی فطرت اپنا کام کرتی رہے۔

یاد رکھو اس اسلام پر کسی نے لگایا کچھ نہیں اور ہم نے بچایا کچھ نہیں۔ ہمارے پاس کیا بچا؟ جب ہماری آقا زادیاں کھلے سر بازاروں میں گئیں؟! ایک شخص نے معصومؑ سے عرض کیا کہ قتل ہونا آپ کی خاندانی روایات کے مطابق ہے لہٰذا آپ زیادہ نہ گریہ کریں تو آپ نے فرمایا:

> تو نے انصاف نہیں کیا۔ بے شک قتل ہونا تو ہماری خاندانی روایات کے مطابق ہے۔ لیکن بہو بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کو کھلے سر دربار بازار میں جانا بھی آلِ رسول کی خاندانی روایات کے مطابق ہے؟

میں نے اپنی کتاب ''اصحاب الیمین'' میں اس واقعہ کو درج کیا ہے کہ جب واقعہ حرہ پیش آیا اور یزید پلید کے حکم سے مدینہ کو تاراج کیا گیا تو تین دن مسلسل قتل عام کا بازار گرم رہا۔ منبر رسول سے قبر رسول تک زمین خون سے لالہ زار ہوگئی اور اگلے سال بے شوہر عورتوں کے ہزاروں بچے پیدا ہوئے اس افراتفری میں عبدالرحمٰن بن عقیل کا یتیم شہزادہ قاسم اپنی بیوہ ماں اور تین بہنوں کو لے کر مدینہ سے نکلا اور جنگلوں کی خاک چھان چھان کر کوفہ کی سرزمین میں وارد ہوا۔

ادھر اس زمانہ میں حضرت مختار برسراقتدار تھے اور دشمنان حسینؑ سے بدلہ لے رہے تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کا قاتل عثمان بن خالد جہنی بھاگنا چاہتا تھا کہ مختار کی پولیس کے ایک گشتی دستہ نے مشکوک حالت میں اسے گرفتار کرلیا جبکہ وہ عبدالرحمٰن بن عقیل کے گھوڑے کے ارد گرد جمع ہو کر گریہ وزاری میں مصروف تھے کہ اچانک ابو عمرہ جو کوفہ کا پولیس افسر تھا' اس نے قاسم بن عبدالرحمٰن کو دربار میں حاضر

کیا۔

مختار نے سوال کیا۔ یہ کون ہے؟ تو جواب ملا کر عبدالرحمٰن بن عقیل کا یتیم شہزادہ قاسم ہے۔

ممکن ہے بلکہ درایت کا یہی تقاضا ہے کہ مختار نے کھڑے ہو کر شہزادے کا استقبال کیا ہوگا اور اسے کرسی پر جگہ دی ہوگی اور رو رو کر کہا ہوگا لوگو! تم گھوڑے کے اردگرد جمع ہو کر ماتم و گریہ میں مصروف ہو۔ ادھر دیکھو اس گھوڑے سوار کا فرزند قاسم بن عبدالرحمٰن یہ موجود ہے۔ چنانچہ لوگوں کا گریہ زیادہ ہوا۔ اور شہزادے سے مختار نے دریافت کیا۔ اب کیا ارشاد ہے تو قاسم نے فرمایا:

اپنے باپ کے قاتل کو میں خود قتل کروں گا۔ چنانچہ وہ ملعون قتل ہوا۔

اب شہزادے کو مومنوں نے محبت و پیار کی نگاہوں سے دیکھا لیکن باپ کے قاتل کو قتل کرنے کے باوجود بھی قاسم کا چہرہ مرجھایا ہوا دیکھ کر لوگ حیران ہوئے۔ آپ نے کہا میں کیا بتاؤں؟ میرے ہمراہ میری بیوہ ضعیفہ ماں اور تین جوان بہنیں ہیں۔ جنہوں نے کئی دنوں سے کھانا نہیں کھایا اور ان کے جسم کے کپڑے بوسیدہ ہیں۔ سر پر برقعہ و چادر نہیں اور میں ان کو فلاں جگہ بٹھا آیا ہوں پس لوگوں نے چادریں بھی دیں اور برقعے بھی دیئے اور ان کی دعوت کا بھی انتظام کیا اور انکے لئے رہائش کا گھر بھی مہیا کیا۔

ہائے زینب! کوفہ سے شام تک چادر مانگتی گئی۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک مومن سے عالم خواب میں دریافت کیا کہ تم میرے باپ کو کس قدر روتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا۔ سارا سال روتے ہیں جب بھی فرش عزاء بچھایا جائے۔ اس موقعہ پر امام نے فرمایا تم اگر

اتنا روؤ کہ تمہارے آنسوؤں کا پانی ایک نہر کی شکل میں بہنے لگے تو پھر بھی فخر نہ کرو۔ کیونکہ تمہارے آنسوؤں سے بہتا ہوا دریا میری کمسن بہن سکینہ کی ایک مصیبت کا بھی بدلہ نہیں ہوسکتا۔ ہائے وہ کس قدر طمانچے سہتی رہی اور کیا کیا ظلم برداشت کرتی رہی۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن

دسویں مجلس

عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَهٗ یَدُوْرُ حَیْثُمَا دَارَ

علیؑ حق کے ساتھ اور حق اس کے ساتھ ہے اور حق ادھر ہی مڑتا ہے جس طرف علیؑ مڑے۔ حق و باطل کی باہمی جنگ روزِ اول سے ہے۔ نہ کبھی حق نے باطل کے سامنے گردن خم کی اور نہ کبھی باطل حق پر تشدد کرنے سے باز آیا۔ ہابیل و قابیل کی جنگ سے لے کر آج تک یہی سلسلہ جاری ہے۔

انسان کی متضاد عناصر سے تخلیق ہی جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ کیونکہ مزاج انسانی میں آگ کی گرمی اور پانی کی ٹھنڈک پھر خاک کی یبوست اور ہوا کی رطوبت باہمی آویزش کا موجب ہیں۔ انسان میں حق کی طاقت بھی ہے اور باطل کی قوت بھی ہے یعنی نیکی بھی کر سکتا ہے اور برائی کی طرف قدم بھی بڑھا سکتا ہے اس میں طاقت ملکوتی بھی موجود ہے اور طاقت طاغوتی بھی کارفرما ہے۔ پس کسی کام کو کرنے کے لئے طاغوتی اور ملکوتی قوتوں کی جنگ ہوتی ہے اور جو طاقت فتح پا لے اس کے تابع ہو کر انسان قدم اٹھاتا ہے۔

مثلاً اگر چوری کا ارادہ کرتا ہے تو ملکوتی طاقت پر غالب طاغوتی طاقت یعنی جہالت اسے اکساتی ہے بس اگر ملکوتی طاقت غالب ہو تو ارادہ ختم اور طاغوتی طاقت غالب تو غلطی کا ارتکاب۔ اسی طرح اگر نماز کا ارادہ کرے تو ملکوتی طاقت (عقل) اس کو آگے بڑھاتی ہے اور طاغوتی طاقت یعنی جہالت اس کو سست کرتی ہے پس جو طاقت غالب ہوگی اسی کے ماتحت عمل کرے گا۔

اور چونکہ انسان میں دو قوتیں موجود ہیں اسی لئے انسان فرشتہ اور حیوان سے ممتاز ہے۔ کیونکہ فرشتے میں ملکوتیت ہے حیوانیت نہیں اور حیوان میں صرف حیوانیت ہے ملکوتیت یعنی عقل نہیں۔ بس فرشتے کی نیکی بلا مقابلہ ہے کیونکہ اس کے راستے میں طاغوتیت کی رکاوٹ نہیں اور حیوان کی غلطی بلا مقابلہ ہے کیونکہ نیکی کی طرف لانے والی اس کے پاس عقل نہیں۔

اب اگر انسان نیکی کرے تو فرشتے سے برتر اور برائی کرے تو حیوان سے بدتر۔

بس جس طرح انفرادی طور پر انسان کے اندر ملکوتی و طاغوتی جنگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی طرح مجموعی طور پر بھی انسانوں میں یہی جنگ جاری ہے کچھ حق کے علمبردار ہیں اور کچھ باطل کے طرفدار ہیں بلکہ ایک انسان کی زندگی بعض اوقات حق اور باطل میں تقسیم ہوا کرتی ہے کچھ دن باطل پرستی میں گزار کر حق کے اصول کے سامنے بعض اوقات جھک جاتا ہے اور حق پرست بن جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کا رزلٹ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی حق سے باطل کی طرف اور باطل سے حق کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

حضرت پیغمبرؐ کی زبان وحی ترجمان نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ علیؑ ہمیشہ

حق کے ساتھ ہے اور حق ہمیشہ علیؑ کے ساتھ ہے ان دونوں میں کبھی جدائی اور مفارقت ہوتی ہی نہیں۔ اور چونکہ علیؑ حق کے ساتھ بلکہ خود حق ہے اس لئے ناممکن ہے کہ حق باطل کے سامنے جھکے

لواتّبع الحق اھوائھم لفسدت السموات. الخ

یعنی اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع کرتا تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بس نظامِ کائنات کا محفوظ رہنا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ حق نے کبھی باطل کی بیعت نہیں کی اور مشہور مقولہ ہے:

اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یَعْلٰی عَلَیْہِ.

یعنی حق بلند ہو کر رہتا ہے اور دبا نہیں رہتا اگرچہ بعض اوقات وقتی طور پر باطل کو غلبہ حاصل ہو بھی جائے تب بھی اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے حق کا بول بالا ہوتا ہے۔ اور باطل کا منہ کالا۔

دیکھئے ہر آدمی کے دشمن ہوا کرتے ہیں۔ کم یا بیش۔ ایسا انسان کوئی نہ ہوگا جس کا دشمن کوئی نہ ہو۔ اور انسان اس قسم کا بھی کوئی نہ ہوگا جس کا دوست کوئی نہ ہو" کیونکہ عناصر اربعہ (جو متضاد ہیں) سے مرکب انسان دوستی اور دشمنی سے خالی رہ ہی نہیں سکتا۔

علیؑ وہ کامل انسان ہے جس کے دشمن ہر ایک کے دشمن سے زیادہ ہیں۔ بلکہ خدا ورسول کے دشمنوں سے بھی اس کے دشمن زیادہ ہیں۔ کیونکہ جو خدا کے دشمن ہیں وہ علیؑ کے دشمن بھی ہیں۔ اسی طرح جو نبیؐ کے دشمن ہیں وہ علیؑ کے دشمن بھی ہیں اور خدا و نبی کے دشمنوں کے علاوہ علیؑ کے مخصوص دشمن بھی ہیں اور علیؑ نے اپنی زندگی میں ان تینوں دشمنوں سے جہاد فرمایا اور علیؑ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا

ہے کہ ان کی زندگی کا اکثر حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ اور علیؑ کی لڑائی کے محاذ تین ہیں۔

۱۔ محاذ توحید۔

۲۔ محاذ نبوت۔

۳۔ محاذ ولایت۔

علیؑ کی زندگی کا پہلا حصہ محاذ توحید پر جنگوں میں صرف ہوا۔ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق وغیرہ۔ ان جنگوں میں موضوع جنگ کلمہ لا الہ الا اللہ تھا اور یہ محاذ توحید تھا۔ اس کے بعد جنگ خیبر ہے۔ جس میں موضوع جنگ حضرت پیغمبرؐ کی نبوت تھی کیونکہ مقابل میں یہودی لا الہ الا الہ پڑھتے تھے۔ منکر توحید نہ تھے۔ اور موسیٰ کلیم اللہ پڑھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ کے منکر تھے۔ پس یہ جنگ محاذ نبوت پر تھی۔ پھر آخری زندگی میں علیؑ نے تین جنگیں لڑیں۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان۔ ان جنگوں میں نہ تو لا الہ الا اللہ پر جھگڑا تھا اور نہ محمد رسول اللہ پر نزاع تھی" یہاں اور امت علیؑ کے محاذ پر جنگیں لڑی جا رہی تھیں بس علیؑ نے احد و بدر خندق فتح کر کے محاذ توحید پر فتح حاصل کر کے لا الہ الا اللہ کی لاج رکھی اور جنگ خیبر میں یہودیوں کا تکبر خاک میں ملا کر محمد رسول اللہ کا کلمہ بلند کیا اور آخری جنگوں میں دشمنان ولایت سے جنگ کر کے علیؑ نے علیؑ ولی اللہ کا ڈنکا بجا دیا۔ پس پورا کلمہ

لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ علیؑ ولی اللّٰہ.

حضرت علیؑ کی ہی کاوش و محنت کا نتیجہ ہے۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ اسرائیل کا چھوٹا سا ملک کروڑوں مسلمانوں کی ناک میں دم کئے ہوئے ہے تو سوچتا ہوں اور یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہودی میں مرجب اور مرجب کے ساتھیوں کی اولاد ہے اور ان سے لڑنے والے ہیں ان

کی اولاد جن کو مرحب والے منہ دکھاتے تھے تو یہ علم پھینک کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ بس جس طرح وہ مرحب کے سامنے قدم نہ جما سکتے تھے ان کے ماننے والے اور ان کی اولاد مرحب کی اولاد کے سامنے کیسے ٹھہر سکتی ہے؟ پس خیبر شکن کا فرزند آئے گا تو اولاد مرحب خود بخود ٹھکانے لگ جائے گی۔

بہرکیف میں عرض کر رہا تھا کہ علیؑ کے دشمن ہر ایک کے دشمن سے زیادہ ہیں اور علیؑ نے زندگی بھر خدا اور رسول اور اپنے مخصوص دشمنوں سے جنگ کی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جس شریف کا کوئی ایک کمینہ بھی دشمن ہو اس شریف کی زندگی موت سے بدتر بن جاتی ہے اور جس شریف کے ہزار ہا کمینے دشمن ہوں تو وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ اور کمینے دشمن کا کام ہے شریف کی نیکی پر پردہ ڈالنا اور اس کی طرف ہر قسم کی برائی منسوب کرنا۔

علیؑ جس کے دشمن کی نہ زمین میں کوئی حد ہے نہ زماں میں کوئی حد ہے۔
ورنہ عموماً دشمن کی حد ہوتی ہے کسی کے ایک شہر میں دشمن اگر زیادہ ہوں تو ضلع کی حدود تک۔ اگر اور بڑھے تو صوبہ کی حد تک۔ اور اس سے بھی تجاوز کریں تو ملکی حدود تک دشمن ہوں گے۔ ایک علی ہی وہ ذات شریف ہے جس کے دشمن کی زمین میں کوئی حد نہیں۔ مکہ مدینہ و عرب تک محدود نہیں بلکہ اللہ کی پوری زمین مشرق تا مغرب اور شمال تا جنوب جہاں بھی ٹٹولیں گے علیؑ کے دشمن نکل آئیں گے۔ اسی طرح زمان میں کوئی حد نہیں

ورنہ عموماً دشمنی دنوں تک مہینوں تک یا سالوں تک ہوا کرتی ہے۔

اور صلح و صفائی ہو جایا کرتی ہے اور دشمن کی آخری حد موت ہے جب مر گیا تو دشمنی ختم۔ ایک علیؑ وہ ذات شریف ہے جن کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ۱۴ سو سال ہو گئے لیکن آج تک دشمن ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ بڑھتے جا رہے ہیں۔

کہاں تک شمار کروں؟

مکہ دشمن،
مدینہ دشمن،
راوی دشمن،
محدث دشمن،
مفسر دشمن،
کاتب دشمن،
قلم دشمن،
پرس دشمن،
ذرائع ابلاغ دشمن،
خطیب دشمن،
واعظ دشمن، اور کلاس فیلو دشمن،

اور تاریخ و حدیث اس دور میں مرتب و مدون ہوئی جب علیؑ کا نام لینا بھی جرم تھا اور امیر شام کی طرف سے تو علی پر سب کرنے کا سرکاری آرڈر تھا۔ چنانچہ علیؑ کو گالی دینا اور علیؑ سے دشمنی رکھنا بارگاہ حکومت کے تقرب کا بہت بڑا وسیلہ تھا۔ بنی امیہ کی ۸۰ سالہ حکومت میں علی پر سب ایک سنت جاریہ بن گئی تھی۔

مروج الذہب میں ہے کہ جب اقتدار تبدیل ہوا تو عباسی فرمانروا نے شام کی دانشور جماعت سے علیؑ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ہم نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ علیؑ مدینہ کے چوروں میں سے ایک چور تھا۔

بس علیؑ کی تاریخ ایسے پرخطر دور سے گزرنے کے بعد حق کا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ کہ ایسے دور میں لکھی جانے والی کتب حدیث و تفسیر و تاریخ میں جن کے فضائل کے انبار لگائے گئے ان کے فضائل کہیں نہیں اور علیؑ جس کے فضائل پر بین تھا اس کے فضائل شمار نہیں ہو سکتے۔

اگرچہ قلم کاغذ راوی سب دشمن تھے۔ لیکن یہ کسی قلم کو جرأت کہ علیؑ کے خلاف لکھ سکے اور نہ کسی پریس کو جرأت کہ علیؑ کے خلاف کوئی مواد شائع کر سکے۔

دوستوں نے فضائل چھپائے اپنی جان و مال و عزت کے تحفظ کے لئے اور دشمن نے فضائل پر پردہ ڈالا جاگیر و منصب و دولت کمانے کے لئے۔ لیکن جب زبانوں سے تشدد کے قفل کھلے اور آسمان حقیقت سے ظلم کے بادل چھٹے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ زمین و آسمان کے اندر علیؑ کے فضائل چھلکتے نظر آئے اور پھر حقیقت نے ظلم کے بادلوں کی تہوں کو چیر کر حقیقت میں نگاہوں کے سامنے علیؑ کے فضائل کو ایسا نکھار کر پیش کیا کہ اس کے مقابلہ میں دوسروں کے فضائل ریگزار کے مقابلہ میں ذرہ بے مقدار سے بھی کم ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے حق کا بولا بالا۔

آج بھی آپ دیکھیں تو حق کو دبانے اور مٹانے کے کس قدر خطرناک، اور حیا سوز حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

حقہ بند،
پانی بند،
بول چال بند،
پھر قلم بند،
زبان بند،
ضلع بند،

لیکن ہم نے تو نجف سے روانہ ہوتے مولا کے روضہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کی تھی کہ اے مولا! جب تک زندگی رہے گی تشدد کی بالادستی کے باوجود نہ تیرے فضائل کو بیان کرنے سے زبان رکے گی اور نہ لکھنے سے قلم میں کوتاہی ہو گی اور اللہ کے فضل و کرم سے آج تک نہ زبان نے اپنے مشن میں کوتاہی کی ہے اور نہ قلم میں سکتہ واقع ہوا ہے۔ چودہ جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنا معمولی کام نہ

تھا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۷ء تک ۲۲ برس میں یہ کام مکمل ہوا۔ اس کے علاوہ اسی دوران میں بیسیوں کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اللہ آپ لوگوں کو استفادہ کی توفیق بخشے یہ اللہ کا فضل ہے جس کے شکر سے زبان قاصر ہے۔

حسینؑ نے میدان کربلا میں تشدد کے خلاف جہاد کیا کہ آخر تشدد کی تلوار کند گئی اور حسینیت کا پرچم آج تک فضائے عالم میں لہراتا نظر آ رہا ہے۔

حسینؑ نے عظمت انسانی کا ایسا تابناک منظر پیش کیا کہ طاغوتیت لرز گئی اور یزیدیت کانپ اٹھی اور قصر تشدد میں ایسا زلزلہ آیا کہ اس کی بنیادیں اکھڑ گئیں۔ حتیٰ کہ آج تک ایسے لوگوں کا نام ننگ انسانیت شمار ہوتا ہے۔ حسین انسانیت کے انقلاب میں ایک رہبر اعظم ہے جس نے ظلم کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی، استبداد کی چکی میں پسی ہوئی اور طاغونیت کے قدموں سے مسلی ہوئی انسانیت کو آزادی کا سانس لینے کی راہ بتائی اور ظلم و تشدد کے کوہ گراں سے ٹکرا جانے کی ہمت دلائی اور نتیجہ یہ نکلا کیا کہ باہمت انسانوں کی پامردی سے ستم وجور کا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو سکتا ہے اور بربریت و طاغوتیت کے طوفان کا منہ موڑا جا سکتا ہے۔

بشرطیکہ پائے استقلال میں لغزش نہ آئے۔

حسینؑ نے فطری تقاضوں پر بھی فتح مبین حاصل کی۔

دیکھیئے ہر دشمن کے دشمن کو غم پسند ہوتا ہے اور خوشی پسند نہیں ہوتی ہے فطری انقلاب ہے کہ حسینؑ کے دشمن کو حسینیوں کا غم پسند نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دشمن سمجھتا ہے کہ ان کا گریہ و بکا، اور ماتم و نوحہ اگرچہ ظاہرا غم ہے لیکن یہی غم درحقیقت یزیدیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔

ہر غم سے جی گھبراتا ہے لیکن غم حسین منانے کو جی چاہتا ہے۔

ہر غم دل کو کمزور کرتا ہے لیکن غم حسینؑ دل کو طاقتور بناتا ہے۔

ہر غم میں دل گھٹتا ہے لیکن غم حسینؑ سے دل بڑھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر غم کو دور کرنے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔

لیکن غم حسینؑ کو منانے کے لئے ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔

ہر غم سے انسان تھک جاتا ہے لیکن غم حسینؑ میں جی بھر کر رو لینے والے انسان کی ہر تھکان و کوفت دور ہو جاتی ہے۔ بس غم حسینؑ ایک زندہ معجزہ ہے۔

ہم جس قدر بھی غم کریں نہ حسینؑ کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ حسینؑ کی بہن زینبؑ کے احسان کا ہم بدلہ دے سکتے ہیں۔ بقول سے:

جب سجادؑ نے پھوپھی کو قبر میں اتارا تو فضہ نے عرض کی:

آقا اجازت ہو تو آخری زیارت کرلوں؟ چنانچہ اجازت حاصل کرنے کے بعد قبر میں اتری۔ چہرے سے دامنِ کفن کو الگ کیا تو چیخ نکل گئی کہا ہائے اس قدر رونے کو ترسی ہوئی تھی کہ اب بھی دامنِ کفن تر ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ اب تو روکنے والا کوئی نہیں ہے..........

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ.

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

گیارہویں مجلس

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ.

ہم ایام کو لوگوں میں۔ بدل بدل کر لاتے ہیں۔

یعنی انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں۔ مثلاً:

انفرادی طور پر کبھی افلاس،

کبھی دولت،

کبھی خوشی کبھی غمی،

کسی وقت تندرستی،

کسی وقت بیماری،

اس کے علاوہ بچپن جوانی اور ضعیفی کی تبدیلیاں۔ تا کہ انسان ان بدلتے ہوئے حالات سے یقین پیدا کرے کہ میرے اوپر ایک بالا طاقت موجود ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری پوری زندگی ہے۔ اسی لئے مولا امیرؑ نے فرمایا تھا:

عَرَفْتُ اللّٰهَ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَنَقْضِ الْهِمَمِ.

یعنی میں نے اللہ کو اپنے ارادوں اور عزائم کی شکست و ریخت سے پہچانا ہے۔

اجتماعی طور پر بھی حالات کا بدلنا سامنے ہے۔

کبھی ایک قوم کا غلبہ'

کبھی دوسری قوم کا غلبہ'

کبھی شریف حکمران'

کبھی کمینہ حکمران'

کبھی مومن کی حکومت'

کبھی کافر کی حکومت'

یہ سب فکر کو مہمیز کرنے کے لئے ہیں۔ اور عام انسانوں کے لئے درس عبرت و معرفت ہے۔

رات آتی ہے تو دن کو قدر ہوتی ہے۔ بدمعاش دنیا میں ہیں تو شرافت کا پتہ چلتا ہے۔ پس اگر کسی وقت کمینے حکمران نہ ہوں تو شرافت کی قیمت کیسے معلوم؟ اور اگر ہمیشہ ہی کمینوں کی حکومت ہو تو شریف زندہ کیسے رہیں؟

اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا۔

اللہ نے انبیاء کچھ غریب اور کچھ امیر بھیجے۔ ایک غریب نبی کا واقعہ سنیئے۔

نمرود تخت حکومت پر ہے اور ابراہیمؑ جیسا شریف النفس انسان اس کے ماتحت ہے۔ غربت کا یہ عالم کہ ایک دفعہ مہمان آیا اور گھر میں آٹا نہیں تھا۔ جناب سارہ نے عرض کی مہمان بھی ہے اور آٹا بھی نہیں۔ آپؑ نے بوری اٹھائی اور گھر سے یہ کہہ کر نکلے کہ دوست سے مانگ کر لاتا ہوں۔ بس جنگل میں پہنچ کر ریگ صحرا سے

بوری کو پر کیا اور خچر پر لاد کر واپس پلٹے۔ بوری کو گھر کے ایک کونے میں رکھ کر پھر باہر چلے گئے اور رات گئے تک نہ آئے۔ جب کافی دیر کے بعد واپس آئے تو سارہ نے کھانا پیش کیا۔ دریافت کیا یہ کہاں سے آیا؟ تو بی بی نے جواب دیا جو آٹا آپ دوست کی طرف سے لائے ہیں اس سے بہترین آٹا میں نے دیکھا ہی کبھی نہیں اور یہ اس سے تیار شدہ روٹیاں ہیں۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے شکر پروردگار ادا کیا اور عرض کیا: اے اللہ واقعی تو ایسا دوست ہے جو کبھی اپنے دوست کو مایوس نہیں کرتا۔

اللہ نے حکم دیا کہ اس بدمعاش انسان (نمرود) کے سامنے کلمۂ توحید بیان کرو۔ تو آپ فوراً چل دیئے اور نمرود کے بھرے دربار میں لا الہ الا اللہ کا پرچم لہرا دیا۔ آپ نے بآواز بلند فرمایا: نمرود! تو خدا نہیں ہے۔ بلکہ خدا وہ ہے جو تیرا اور سب مخلوق کا خالق ہے۔

نمرود نے اپنے دربار کے ارباب حل و عقد مشیران کار' ممبران اسمبلی اور ارکان عدلیہ سے سوال کیا کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہئے......؟ تو سب نے یک زبان سزائے موت کا نعرہ لگایا۔ دربار میں ابراہیمؑ اکیلا ہے' نہ کوئی سفارشی ہے نہ وکیل۔ پس سزائے موت سن کر پولیس کے ہمراہ جیل خانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ گئے تھے توحید پروردگار کا پیغام پہنچانے کے لئے اور پلٹے سزائے موت کے قیدی بن کر۔ لیکن چہرہ ہشاش بشاش' طبیعت مطمئن اور پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں۔ یہی سوچا ہو گا کہ اگر اس شخص نے سزائے موت سنا دی جس نے قبضہ میں موت ہے ہی نہیں تو کیا غم؟ اور جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے وہ اللہ ہے اگر موت دے تو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اگر زندگی بخشے تو کوئی گھٹا نہیں سکتا۔

بس آگ کا ڈھیر تیار ہونے تک کال کوٹھڑی میں رہے۔ جب آگ بھڑکا دی

گئی اور کال کوٹھڑی سے نکال کر ابراہیم کو آگ کی طرف لایا جا رہا تھا تو زمین و آسمان کی ہر مخلوق میں ایک تہلکہ مچ گیا اور شاید جبریل نے عرض کی۔ پروردگار تیرا ایک عبادت گزار آگ میں دھکیلا جا رہا ہے اور تو بچا سکنے کے باوجود اس کو بچاتا نہیں۔ گویا زبان بے زبانی پروردگار سے ارشاد ہوا۔ اے جبریل امتحان خلیلؑ کا ہے اور گھبراتے تم ہو؟ اگر چاہو تو جا کر میرے خلیلؑ کو اپنی نصرت کی پیش کش کرو۔ اور پھر اس کے عزم کا جائزہ لو چنانچہ ابھی تک آگ کے شعلے ابراہیمؑ کے جسم نازنین سے مس نہ ہوئے تھے البتہ قریب آگ کے آ رہے تھے اور گرمی بڑھتی جا رہی تھی لیکن زبان شکر پروردگار میں مصروف تھی۔ اچانک جبریلؑ نے پنکھ کر نیچے پر بچھا دیئے۔ تو بڑھتی ہوئی گرمی کا زور فوراً رک گیا ابراہیمؑ نے نیچے نگاہ کی تو جبریلؑ پر بچھائے ہوئے تھے۔ آپ نے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

کون ہو میرے امتحان میں خلل ڈالنے والے ہٹ جاؤ اور مجھے ذکر پروردگار کی لذت اٹھانے دو۔

حضرت جبریلؑ نے عرض کیا۔ میں آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔
کیا آپ کو مدد کی ضرورت نہیں؟ آپ نے فرمایا:

مجھے مدد کی ضرورت ہے لیکن تیری مدد کی نہیں۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک قول کے مطابق:

رعفہ بنت نمرود نے ایک بلند چبوترے سے جھک کر جو دیکھا کہ آگ کے شعلے بلند ہیں۔ لیکن ابراہیمؑ اسے باغ و بہار سمجھ کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اور آگ کے انگاروں پر مصلائے عبادت بچھا کر انگاروں کو تسبیح کے دانے قرار دیئے

ہوئے ذکر پروردگار میں رطب اللسان ہیں تو عرض کی اے آگ کے مصلے۔ پر بیٹھ کر اپنے خدا کا ذکر کرنے والے! کیا یہ آگ نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو آپؑ کو جلاتی کیوں نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا یہ آگ ہے اور میں انسان ہوں لیکن یہ تمہارے باپ کی قدرت میں نہیں ہے بلکہ اس پر میرے اللہ کا کنٹرول ہے۔ جو میرا، تمہارے باپ کا، اس آگ کا اور پورے جہان کا خالق ہے۔

رعفہ نے کہا:

واقعی تیرا اللہ سچا ہے اور میں اس کی الوہیت آپ نبوت پر ایمان لاتی ہوں۔
اس کے بعد رعفہ کو سزائے موت سنائی گئی لیکن ایک قول کے مطابق:
جبریلؑ نے پر مار کر اسے تختہ موت سے اٹھا لیا۔

یہ تھا ایک غریب نبی کا تذکرہ۔ جس نے نمرود جیسے سرکش حکمران کی حکومت میں بھی اپنا فریضہ تبلیغ ادا فرمایا۔ آیئے ایک امیر نبی کا واقعہ بھی سن لیجئے۔ کیونکہ اللہ نے امراء اور غرباء دونوں طبقوں کی رہنمائی کے لئے دونوں طرح کے نبیؑ بھیجے۔ غریب بھی اور امیر بھی۔ تاکہ اگر غربت ہو تو ابراہیمؑ جیسے نبی کی سیرت کو مشعل راہ قرار دیا جائے اور دولت و زر آ جائے تو امیر و رئیس نبی کی سیرت کو اپنایا جائے۔ بس دولت آئے تو انسان نمرود و فرعون بننے کی کوشش نہ کرے اور غربت آئے تو ابلیس کا کردار ادا نہ کرے۔

امیر نبی تھے حضرت سلیمان بن داؤد۔ انہوں نے دعا کی تھی اے اللہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے علاوہ اور کسی کو نصیب نہ ہو۔ پس انسانوں، جنوں، حیوانوں اور حشرات الارض کے علاوہ ہوا پر بھی حکومت مل گئی۔ آپ کا تخت ہوا میں صبح کو ایک ماہ کا راستہ طے کرتا تھا۔ اور شام کو بھی ایک ماہ کا سفر طے کرتا تھا۔ آپ

کے سر پر پرندوں میں سے ہر نوع کا ایک ایک فرد اپنی اپنی ڈیوٹی کے ماتحت پر پھیلا کر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سائبان کا نمونہ بن کر کھڑے رہتے تھے۔

ایک دن ایک پرندہ ہدہد غائب ہوا تو گود میں دھوپ کا نشان دیکھ کر آپ نے فرمایا:

یہ پرندہ جو غائب ہے اسے گرفتار کر کے لایا جائے' اگر اس نے کوئی معقول عذر پیش نہ کیا تو میں اسے سزا دوں گا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ہدہد پیش ہوا۔ آپ نے وجہِ غیبت دریافت کی تو کہنے لگا میں نے اس روئے زمین پر ایک زرخیز ملک دیکھا ہے جس کی حکمران' ایک عورت ہے اور یہ سلطنت یمن کے علاقہ میں ہے۔

آپ نے فرمایا:

اگر تیری بات میں صداقت ہے تو لو یہ میرا خط ہے اور اس کا جواب لاؤ۔

خط کا مضمون یہ تھا:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِنْ لَا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۔

یعنی یہ سلیمان کا خط ہے۔ جس کی ابتداء اللہ کے نام سے ہے' جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ کہ میرے آگے سرتابی نہ کرنا بلکہ مسلمان ہو کر فوراً میرے پاس پہنچو۔

ملکہ بلقیس اپنے مخصوص محل میں محو آرام تھی کہ قاصد سلیمان (ہدہد) وہاں پہنچا اور محل کے ایک روشندان سے گزر کر حضرت سلیمان کے مکتوب کو اس کے سینہ پر رکھ دیا اور واپس نتیجہ دیکھنے کے لئے روشندان میں بیٹھ گیا۔ اسی روشندان سے سورج کی کرنیں ملکہ کے چہرہ پر پڑیں تو اٹھ بیٹھی اور سینے پر پڑے ہوئے خط کو بغور پڑھا۔

سمجھ گئی یہ خط یہی پرندہ لایا ہے۔ پس ایک مخصوص اعلان کے ذریعے اپنے محل سرا میں فوراً میٹنگ بلوائی۔ جس میں فوجی آفیسرز' سویلین اہل کار' وزراء ارکانِ دولت اور ممبرانِ اسمبلی کو دعوت شرکت دی گئی۔

پس ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے خط کو سامنے رکھ کر ایک پرمغز تقریر کی اور حاضرین اجلاس سے رائے طلب کی۔ جس پر فوجی آفیسران بول اٹھے: اے ملکہ ہمارا ملک معمولی ملک نہیں ہے نہ دولت کی کمی ہے اور نہ فوج کمزور ہے ہم ملک و ملت کے تحفظ کے لئے کٹ مرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اپنے خون کا آخری قطرہ وقارِ ملک کی خاطر بہا دینے کو تیار ہیں۔ یہ چاق و چوبند وفادار فوج تیرے اشارۂ چشم کی محتاج ہے۔

ملکہ نے اپنی جوابی تقریر میں کہا:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً۔

دیکھو میری وفادار فوج کے جانباز جیالے نوجوانو!

میں تمہارے جذبات سے کھیلنا پسند نہیں کرتی۔ خون خرابہ کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں۔ آگ کا لگانا آسان ہے لیکن اسے بجھانا مشکل۔ اسی طرح جنگ چھیڑنا آسان ہے لیکن اس کے بھیانک نتائج کا بھگتنا مشکل۔ ماضی میں ہونے والی تاریخ جنگوں کا جائزہ لو۔ (جب بادشاہ فاتحانہ انداز میں کسی شہر میں داخل ہوں۔ شہر تہ و بالا ہو جایا کرتے ہیں' کسی شریف کی عزت محفوظ نہیں رہتی' جان و مال تباہ ہوتے ہیں اور عزت دار ذلیل ہو جایا کرتے ہیں۔

میں اعلان جنگ کرنے سے پہلے ان کو کچھ تحائف بھیجتی ہوں:

الی مُرسِلۃٌ اِلَیھم ھَدِیّۃ الایہ.

پھر دیکھیں گے کیا جواب آتا ہے۔ تمام اراکین مجلس نے عرض کی کہ الامر الیک. ہم آپ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

پس باختلاف روایات۔ کئی خچروں پر سونا لاد کر بطور ہدیہ بھیجنے کا پروگرام طے ہوا۔

اس کے علاوہ امتحان کے طور پر چند سوالات مرتب کر لئے گئے کہ اگر نبی ہوگا تو جوابات صحیح ہوں گے اور جواب نہ دے سکا تو ہم سمجھیں گے کہ ہم جیسا بادشاہ ہے۔ بس اعلان جنگ کو قبول کر لیں گے۔ لیکن اس کے نبی ہونے کی صورت میں ہم اس سے ہرگز نہ لڑیں گے بلکہ اسلام کو قبول کر کے سر تسلیم جھکا لیں گے۔ سوالات یہ تھے:

۱۔ سینکڑوں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں ہم عمر، ہم شکل، ہم لباس، بھیجے تاکہ کلام کئے بغیر ان میں سے نر و مادہ کی پہچان کرے۔

۲۔ ایک عصا دیا جس کی اصل و فرع کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اس کا پتہ بتا دے۔

۳۔ ایک درنا سفتہ میں سوراخ ڈال دے اور لوہے کا آلہ استعمال نہ ہو۔

۴۔ ایک پیچیدہ سوراخ والے موتی میں تاگہ ڈال دے۔

۵۔ ایک شیشی دی جو پانی سے بھر دے۔ جبکہ وہ پانی نہ آسمان کا ہو اور نہ زمین کا۔

ادھر ہدہد نے واپس آ کر حضرت سلیمان کو سب کچھ بتا دیا۔

پس تخت سلیمان اترا اور قوم جن کی پھرتی سے میلوں تک محلات تعمیر ہو گئے۔ ایک اصطبل تیار کرایا گیا جس میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگائی گئیں۔ گھوڑوں کے باندھنے کی جگہ کا فرش بھی سونے کا اور وہ نالیاں جن سے گھوڑوں کا پیشاب بہتا تھا وہ بھی سونے کی تیار کی گئیں۔

چنانچہ ملکہ بلقیس کے قاصدوں کی آمد سے پہلے سب کچھ تیار ہو چکا تھا۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے شایان شان تخت پر جلوہ گر تھے اور دربار شاہی کو شایان شان سجایا گیا تھا۔

جب وہ لوگ پہنچے اور دیکھا کہ حضرت سلیمان کے گھوڑے بھی سونے کے فرش پر پیشاب کر رہے ہیں تو انہوں نے ہدیہ کے طور پر لایا جانے والا سونا باہر پھینک دیا کہ ایسے بادشاہ کو یہ ہدیہ دینے میں ملکہ کی توہین ہے۔

اندر داخل دربار ہوئے تو آتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کو پانی کے لوٹے دو تاکہ ہاتھ منہ دھولیں۔ چنانچہ لڑکیوں نے اپنی سرشت کے مطابق اور لڑکوں نے اپنے مردانہ طور طریقے سے ہاتھ منہ دھویا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فوراً فرما دیا کہ یہ لڑکے ہیں اور ان کو الگ جگہ دو اور وہ لڑکیاں ہیں ان کو الگ کمرہ میں بٹھاؤ۔

عصا کو آسمان کی طرف پھینکا تو جب واپس زمین پر آیا جو کنارہ پہلے زمین بوس ہوا فرمایا:

یہ اصل ہے۔ کیونکہ اصل جو ہے وہ فرع کے مقابلہ میں بھاری ہوتا ہے اس کے بعد درنا سفتہ کو تخت پر رکھا تاکہ سوراخ کیا جائے جو لوہے کے آلہ سے نہ ہو۔ پس ایک دیمک نے اپنی خدمت پیش کی۔ اور سوراخ ہو گیا۔ پھر ترچھے اور ٹیڑھے سوراخ والے موتی میں ایک کیڑے نے منہ میں تاگہ ڈال کر خدمت انجام دے دی۔ پھر ایک گھوڑے کو میدان میں دوڑایا گیا اور آپ نے فرمایا:

اس کے پسینے سے خالی شیشی کو بھر دو اور ملکہ سے کہو یہ پانی نہ آسمان کا ہے

اور نہ زمین کا ہے۔

اتنی بڑی مملکت کا فرمانروا کہ ایک دفعہ تخت ہوا میں تھا اور زمین پر ایک چیونٹیوں کے بھرے اجلاس میں اسی جنس کے ایک مقرر نے تقریر کی:۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّمْلُ ٱدْخُلُوا۟ مَسَـٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَـٰنُ وَجُنُودُهُۥ (نمل)

اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ۔ کہیں سلیمان علیہ السلام اور اس کی فوجیں تمہیں روند نہ ڈالیں ۔ چیونٹی کی یہ تقریر حضرت سلیمان علیہ السلام نے سن لی جبکہ وہ تقریباً تین میل دور فضا میں تھے۔ پس فوراً اس تقریر کرنے والی چیونٹی کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جس نے حکومت کے خلاف زبان کشائی کی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین فرما لیجئے کہ ہمارے کان پاس بیٹھی ہوئی چیونٹی کی آواز نہیں سن سکتے لیکن نبیؑ تین میل دور ایک چیونٹی کی پوری تقریر سن رہا تھا جس کو قرآن مجید نے اپنے انداز میں نقل کیا۔ حالانکہ ہم لوگ تین میل دور تو بجائے خود ایک فرلانگ دور سے اپنے جیسے آدمی کی آواز سن اور سمجھ نہیں سکتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی قوت سماعت ہماری قوت سماعت سے الگ ہے۔ پس یہ کہنا کہ اپنے اعضاء و جوارح کی طاقت میں وہ ہم جیسا ہے یا ہم اس جیسے ہیں' احمقانہ قول ہے:

اور علماء تو بجائے خود کوئی بھی انبیاء کو اپنے جیسا نہیں مانتا۔

پس نبی سلیمان علیہ السلام نے گرفتاری کے لئے جس نمائندہ کو بھیجا تھا وہ یقیناً نبی نہیں تھا اور ادھر تقریر کرنے والی چیونٹی کا لباس یا ہیئت دوسری چیونٹیوں سے جدا نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ

نبی تو بجائے خود نبی کا نائب بھی عام بندوں جیسا نہیں ہوا کرتا۔ پس اُس نے نہ تو دوسری چیونٹیوں سے پوچھا کہ یہ تقریر کس نے کی تھی؟ اور نہ اس کی کوئی اور خاص علامت تھی۔ پس آتے ہی اس کو گرفتار کر لیا جس نے تقریر کی تھی اور اس نے بھی یہ نہ کہا کہ میں نہیں کوئی اور تھی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کے نائب کا علم بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

جب یہ چیونٹی حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آئی تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ پر اٹھا لیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تو نے یہ بیان جاری کیا تھا۔ کہنے لگی۔ جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: میرا تخت ہوا میں تھا تم لوگ زمین پر تھے روندنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر میں ایک نبی ہوں اور نبی ظالم نہیں ہوا کرتا۔ بتاؤ تم نے غلط بیانی کر کے اپنی کمزور قوم کو میرے ظلم سے خوفزدہ کیوں کیا؟ اپنی قوم میں تیری یہ تقریر حکومت وقت کے خلاف کیا کھلی ہوئی بغاوت نہیں؟ چیونٹی نے عرض کیا: حضور! میری قوم بے عقل ہے وہ صرف جینے اور مرنے کو ہی سمجھتی ہے اس کے علاوہ منطقی دلائل کو وہ نہیں سمجھ سکتی۔ یہ سب عبادت پروردگار میں مصروف تھیں میں نے ان کو آپ کے تخت کی آمد سے خوفزدہ کیا ہے تاکہ آپ دیکھ کر کہیں خدا یا خدا کا شریک نہ سمجھ لیں۔ پس میں نے اس طریقہ کار اور طرز بیان سے ان کے دین کی حفاظت کی ہے تاکہ مشرک نہ ہو جائیں۔

یہ امیر نبی تھے لیکن اپنی گذر اوقات بیت المال سے نہیں بلکہ دستکاری کی آمدنی سے کرتے تھے۔ جس طرح کہ حضرتِ امیر علیہ السلام اپنی گذر بسر مزدوری کرکے کیا کرتے تھے۔

امیر اور غریب انبیاء پر موت کی آمد مختلف ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب ملک الموت آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کیا کوئی دوست بھی دوست کی موت چاہتا ہے پس جب ملک الموت واپس گیا تو اللہ نے فرمایا:

ان سے کہو کیا کوئی دوست بھی دوست کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے؟ پس ابراہیم علیہ السلام نے موت کو قبول کر لیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس ملک الموت آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ کہاں سے میری روح کو قبض کرو گے؟ تو اس نے کہا۔ ہاتھوں سے۔ آپ نے فرمایا:

ان ہاتھوں سے میں نے تورات کو اٹھایا ہے۔ ملک الموت نے کہا: پاؤں سے۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

انہی کے ذریعے میں کوہِ طور پر چل کر جاتا رہا ہوں۔

اس نے کہا:

پھر آنکھوں سے۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

میں نے انہی آنکھوں سے طور کا منظر دیکھا ہے۔

اس نے کہا:

زبان سے۔

تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

اسی زبان سے میں نے اللہ سے کلام کیا ہے۔

پس ملک الموت واپس پلٹا۔ اللہ نے فرمایا:

جب خود موت کو مانگے گا تب روح قبض کرنا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے دیکھا ایک آدمی قبر کھود رہا تھا (درحقیقت یہ وہی موت کا فرشتہ تھا) پس موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ کیا کر رہے ہو.........؟ جواب دیا ایک مومن کی قبر کھود رہا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

میں تیری امداد کرتا ہوں۔ بتاؤ اس کا قد کتنا ہے؟ اس نے کہا:

آپ کے قد کے برابر۔

پس آپ کے اپنے قد و قامت کو ناپ کر قبر تیار کر دی۔

اور پھر خود قبر میں اترے اور لیٹے تاکہ پتہ چلے کہ قبر ٹھیک تیار ہوئی یا نہیں؟

ادھر موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں لیٹنا تھا کہ سامنے بہشت کے دروازے کھول دیئے گئے۔ پس عرض کی اے پروردگار میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری روح قبض ہو جائے تاکہ یہاں سے مجھے واپس نہ جانا پڑے۔ پس فوراً ملک الموت نے روح قبض کر لی۔

اب آیئے امیر اور سلطان نبی کی موت کا منظر دیکھئے۔ حضرت سلیمان بالاخانہ پر چڑھے تاکہ اپنے ماتحت ملازمین کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے اور حکم دیا کہ کوئی بھی اوپر نہ آئے۔ اچانک دیکھا کہ ایک خوش شکل خوش لباس شخص سامنے آ گیا۔ آپ نے فرمایا:

میرے حکم کے بغیر یہاں کیوں آیا ہے؟ اس نے جواب دیا میں

جب کسی کے پاس جایا کرتا ہوں تو اجازت کے بغیر ہی جاتا ہوں۔

آپ نے پوچھا۔ کیا تو ملک الموت ہے؟ عرض کی۔ جی ہاں۔

آپ نے فرمایا: مجھے اترنے دو اترنے دو تاکہ وصیت کرلوں۔

ملک الموت نے کہا:

اتنی فرصت نہیں۔

کہا یہاں لیٹنے دو۔

جواب دیا فرصت نہیں۔

تو سلیمان علیہ السلام نے کہا:

پھر کیسے روح قبض کرو گے؟ جواب دیا:

آپ عصا کے سہارے کھڑے رہیں اور میں قفس عنصری سے روح کو کھینچ لوں گا اور چلا جاؤں گا۔

پس اے مومنو اگر غریب ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کو دیکھو اگر امیر ہو تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کرو۔ یہ سب معرفت ہی سے ہو سکتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے ایک سائل نے ۱۰۰۰ روپے کی خواہش کی کہ مقروض ہوں۔ آپ نے فرمایا:

تین سوال کرتا ہوں اگر جوابات صحیح ہوں گے تو دوں گا ورنہ جس قدر سوال حل کرو گے۔ اسی کے مناسبت سے دوں گا۔ کیونکہ میرے نانا کا فرمان ہے:

المعروف بقدر المعرفة.

یعنی کسی پر اتنا احسان کرو جس قدر وہ معرفت رکھتا ہو۔

اس نے عرض کی آپ سوال کریں۔ اگر جواب آیا تو عرض کروں گا ورنہ

آپ سے سیکھ لوں گا۔

آپ نے پوچھا:

سب سے بڑی عبادت کونسی ہے؟ جواب دیا اللہ کی معرفت۔

آپ نے پوچھا:

مصیبت کے وقت سہارا کیا ہوتا ہے؟ جواب دیا توکل برخدا۔

آپ نے پوچھا:

انسان کی زینت کیا ہے؟ اس نے عرض کی۔ العلم مع العمل۔ یعنی علم عمل کے ساتھ کیونکہ عمل کے بغیر علم ایسا ہے جس طرح درختِ بے ثمر...... اور معصوم سے پوچھا گیا انبیاء و اولیاء کے بعد جنت کے بلند طبقہ میں کون ہوگا؟ تو فرمایا:

ہماری امت کے علماء (جن کا عمل علم کے مطابق ہو)

پھر پوچھا گیا:

کہ فرعون شداد و نمرود کے بعد جہنم کے نچلے درجہ میں کون ہوگا۔

تو فرمایا:

ہماری امت کے علماء (جن کا عمل اپنے علم کے مطابق نہ ہوگا۔)

دیکھئے علم ایک ایسا مظروف ہے جو ہر ظرف میں آ کر اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اگر شریف ظرف میں ہو تو شرافت کو بڑھاتا ہے اور کمینے ظرف میں آئے تو اس کی کمینگی میں اضافہ کرتا ہے۔

کماء المزن یعنی بارش کے پانی کی سی اس کی مثال ہے۔

بارش کا پانی اگر باغ پر آئے تو اس کی خوشبو مہکتی ہے۔

اگر بدبودار پر آئے تو اس کی بدبو میں اضافہ ہوتا ہے۔

اگر صدف کے منہ میں ہو تو موتی بنتا ہے اور اگر سانپ کے منہ میں آئے تو زہر بنتا ہے۔

پس علم بھی شریف ظرف میں آئے تو ایمان والوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔

اور اگر کمینی فطرت کے لوگوں میں آئے تو گمراہی پھیلاتا ہے۔

بہر صورت عمل علم کی زینت اور علم انسان کی زینت ہے۔

آپ نے پوچھا اگر علم نہیں تو پھر انسان کی زینت کیا ہے؟ اس نے عرض کی:

الغناء مع السخا.

دولت مندی ہو اور سخاوت ہو۔

یعنی راہ خدا میں خرچ کرے بیہودگیوں میں نہ ضائع کرے۔

آپ نے پوچھا اگر مال و دولت بھی نہ ہو تو زینت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا **الفقر مع الصبر** یعنی غربت ہو تو صبر کرے۔ یعنی امیر ہو تو فرعونیت کا مظاہرہ نہ کرے اور غریب ہو تو شکوۂ پروردگار نہ کرے۔

آپ نے فرمایا:

اگر صبر بھی نہ ہو تو پھر اس کی زینت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا پھر اس کی زینت موت ہے کہ پتھر گرے اور اس کو زمین دوز کر دے۔

آپ نے اسے مطلوبہ ایک ہزار بھی دیا اور اپنی مزید انعام دے کر رخصت فرمایا۔

حسینؑ فطرۃً پیاس رکھتے تھے۔ جس طرح کہ زینبؑ خاتون عام حیا کے علاوہ مخصوص طور پر صاحب حیا تھیں۔ بعض اوقات حضرت پیغمبرؐ تشریف لاتے اور فاطمہ کو غمگین دیکھ کر سوال کرتے کہ تیری شکل غمناک کیوں ہے؟ ایک مرتبہ تشریف لائے اور سوال کیا تو بی بی نے عرض کی۔ میرے شکم میں موجود بچہ مجھے غمگین کرتا ہے۔ جب میں وضو کے لئے پانی سامنے رکھتی ہوں اور چلو

میں لیتی ہوں تو اندر سے آواز آتی ہے۔

آنا عطشان.

اماں میں پیاسا ہوں۔

بعض دفعہ آواز آتی ہے:

انا عریان.

یعنی میرا جسم لباس سے محروم ہے۔

اور بعض اوقات آواز آتی ہے:

انا سحقان.

میری ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

حضورؐ نے فرمایا:

نہ خود رو نہ مجھے رُلا۔

پس بی بی کے اصرار پر فرمایا:

تیرا یہ بچہ بے جرم و بے خطا پیاسا مارا جائے گا اور اس کی تکفین و تدفین تک نہ ہو گی۔

بی بی نے عرض کیا: ایسا کرنے والے کون ہوں گے؟ فرمایا:

میری امت کے لوگ۔

بی بی نے عرض کیا: کیا آپ سفارش نہ کریں گے؟ فرمایا:

میں نہ ہوں گا۔

عرض کیا علی ہوں گے؟ فرمایا:

وہ بھی نہ ہونگے۔

حسنؑ بھی نہ ہوگا۔

عرض کیا۔ پھر میں برقعہ سر پر پہنکر خود چلی جاؤں گی اور کہوں گی: لوگو!

میں تمہارے نبی کی بیٹی ہوں۔ میرا خیال کرو۔ میرے فرزند کو نہ مارو۔ آپ نے فرمایا: زہرا۔ اس وقت تم بھی نہ ہوگی۔ صرف بہنیں ہوں گی جو مدد نہ کرسکیں گی۔

بی بی نے عرض کیا: پھر دفن کون کرے گا؟ فرمایا:

گرم ریت پر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

گیارہویں کے دن بی بی نے فضہ کو بھیجا کہ عمر بن سعد سے کہو تم نے اپنی لاشوں کو دفن کر لیا۔ ہمیں بھی اجازت دے دو کہ ہم اور نہیں تو حسینؑ کی لاش کو تو دفن کرلیں۔ فضہ روتی ہوئی واپس پلٹی اور عرض کیا۔ بی بی وہ ظالم کہتا ہے ہمیں حکم ملا ہے کہ صرف مسلمانوں کی لاشوں کو دفن کیا جائے۔ بی بی نے مدینہ کی طرف منہ کرکے ضرور فریاد کی ہوگی۔ نانا! آج تیری امت تیرے حسینؑ کو مسلمان بھی نہیں سمجھتی۔

بہرکیف آخر میں بی بی نے عرض کیا کہ میرے حسینؑ کا پرسہ کون دے گا۔

تو آپ نے فرمایا:

خدا ایک ایسا گروہ پیدا کرے گا جو تیری اولاد کا ماتم کریں گے۔ ان کے مرد مردوں پر نوحہ کریں گے اور ان کی مستورات پردہ داروں کا غم کریں گی۔ شیعو! تم زہراء کی دعاؤں کا نتیجہ ہو۔ بے شک ماتم کرو سینہ پر ہاتھ مارو۔ ہائے حسین کہو۔

پس زہراء نے عرض کیا بابا جان!

اگر یہ لوگ میرے بیٹے کا فرش عزاء بچھائیں گے تو میں بھی وعدہ کرتی

ہوں کہ جنت میں اس وقت تک داخل نہ ہوں گی جب تک یہ داخل جنت نہ ہوں اور یقین کیجئے بی بی خود غم حسین میں شریک ہوتی ہے۔ چنانچہ نجف کی ایک عزادار بی بی جس کے پاس عزاداری کا خرچہ نہ تھا۔ محرم کا چاند نمودار ہوا تو اس نے فرش عزا بچھایا لیکن نذر نیاز نہ کر سکنے کے باعث لوگ نہ آئے ایک قول کے مطابق:

اچانک ایک مستور نے دستک دی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوگئی اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور اختتام مجلس تک روتی رہی اور اس کے بعد چلی گئی۔

پھر دوسرے دن۔

پھر تیسرے دن۔

بہرصورت وہ دس روز تک شریک مجلس ہوتی رہی۔ جب آخری مجلس سے اٹھ کر جانے لگی تو عزادار خاتون نے ایک گٹھڑی باندھی اور دروازہ پر جا کر اسے نذرانہ کے طور پر پیش کی تو اس کی ایک چیخ نکلی اور کربلا کی طرف منہ کرکے کہنے لگی۔ حسین آج تیری عزادار تیری اماں کو نذرانہ پیش کر رہی ہے۔ اس عزادار نے جب پہچانا تو قدموں میں گر پڑی۔ اور عرض کیا بی بی میں نے پہچانا نہیں تھا۔ اب بروز محشر میری سفارش فرمانا۔

ایک دوسری عزادار نجف کا ذکر سننے میں آتا ہے کہ ہر روز اپنے بیٹے کی قبر پر وادئ سلام میں جایا کرتی تھی لیکن جب محرم کا چاند نمودار ہوا تو اس نے اپنے بیٹے کی قبر پر جانا موقوف کرکے غم حسین میں مصروف ہوگئی۔ جب دسویں کے دن ماتم حسین سے فارغ ہوئی تو اپنے بیٹے کی قبر پر پہنچی۔ دیکھا تو قبر پر ایک سیاہ پوش مستور رو رہی ہے کہنے لگی۔ بی بی یہ تو میرے بیٹے کی قبر ہے۔ تمہارے عزیز کی قبر کوئی اور ہوگی۔ تو اس کی ایک چیخ نکلی اور کہا۔ تو نے نہیں پہچانا؟ میں حسین کی اماں ہوں۔ تو

نے دس دن میرے بیٹے کا غم کیا ہے اور میں تیرے بیٹے کی قبر پر حاضری دیتی رہی ہوں۔

ہم جس قدر بھی روتے رہیں ہم سے نہ زینب کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ حسینؑ کا حق۔

اور حسینؑ کی عزادار تھی حسین کی بہن۔ ایک قول کے مطابق:

جب سجادؑ نے قبر میں اتارا تو فضہ نے عرض کیا۔ میرے آقا سجادؑ!

میری مدت کی ساتھی مجھ سے جدا ہوئی ہے اگر اجازت ہو تو قبر میں اتر کر آخری دیدار کر لوں۔ سجادؑ نے اجازت دی۔ وہ اتری' چہرہ سے کفن کا دامن ہٹایا تو چیخ نکلی اور روتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ حضرت سجاد نے فرمایا:

اماں فضہ کیا دیکھا ہے؟ تو عرض کیا:

خدا جانے تیری پھوپھی رونے کے لئے اس قدر ترس رہی تھی کہ کفن کا دامن بھی آنسوؤں سے تر ہے اور لب مل رہے ہیں میں نے کان لگا کر سنا تو آواز آئی:

''اب تو مجھے حسین کے رونے سے کوئی نہ روکے گا؟''

وَسَیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون

❀……❀……❀

بارھویں مجلس

قَد جَاءَکُم مِنَ اللّٰہِ نُورٌ وَ کِتَابٌ مُبِین

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب دونوں پہنچ چکے ہیں۔

یعنی وہ نور (روشنی) جس کے ذریعے سے کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کا بھی اللہ نے خود انتظام فرمایا ہے۔ پس جب تک کتاب رہے گی ساتھ ساتھ نور بھی رہے گا اور اسی مقصد کی دوسری تعبیر حدیث ثقلین ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت یعنی اہل بیتؑ۔ کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ پس تم ان دونوں سے تمسک کرو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔

چنانچہ محکمات و متشابہات قرآنیہ کے متعلق معصومؑ سے دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اللہ نے قرآن میں متشابہات بھیج کہ امت کو ہمیشہ کے لئے اہل بیتؑ کا محتاج کر دیا۔ کوئی شخص متشابہات کی موجودگی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے

کتاب اللہ کافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں لوگ آل محمدؐ کے محتاج ہوتے رہے اور آل محمدؐ کے کسی فرد نے کبھی اپنے زمانے کے کسی دوسرے عالم سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور نہ کسی سے درس حاصل کیا۔

حضرت امیر علیہ السلام سے اپنے زمانے کے چھوٹے سے بڑے تک ہر ایک نے مسائل دریافت کئے لیکن کسی بڑی یا چھوٹی کتاب میں ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسی نہ ملے گی کہ علیؑ نے کبھی کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا ہو۔ پس تمام کا علیؑ کی طرف رجوع کرنا اور علیؑ کا کسی کی طرف رجوع نہ کرنا ان کی عظمت علمی کی دلیل ہے۔

اور قرآن مجید میں اس امر کی وضاحت ہے کہ متشابہات کی تاویل خدا جانتا ہے اور راسخون فی العلم جانتے ہیں۔ یعنی یہ علم میں راسخ ہیں۔ نہ کہ علم ان میں راسخ ہے۔

علم کو ان کا ظرف قرار دیا کہ یہ علم میں راسخ ہیں۔ یعنی ان کا وجود ہی ظرف علم میں ہے جب سے ہیں علم میں ہیں۔ ایسا نہیں کہ علم ان میں راسخ ہے۔ کہ یہ ظرف ہوں اور علم ان کا مظروف ہو۔ تا کہ یہ کہنا پڑے کہ یہ بطور ظرف تھے اور بعد میں ان میں علم داخل ہوا یا کسی نے کچھ پڑھایا اور انہیں علم آیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانہ کا عالم ان کے علمی مقام کے سامنے سرنگوں نظر آیا۔

چنانچہ امام محمد تقی علیہ السلام کا بچپنے میں علمی مقام یہ تھا کہ ایک دفعہ مامون شکار کو نکلا تو ایک مقام پر بچے کھیل رہے تھے۔ مامون کی سواری کو دیکھ کر سب بچے

دوڑ گئے لیکن امام اسی مقام پر کھڑے رہے مامون نے قریب آ کر پوچھا تم کون ہو؟ تو امام نے فرمایا:

کہ میں امام رضا کا فرزند محمد تقی ہوں۔ مامون نے پوچھا جب میرے جلال شاہی کو دیکھ کر سب بچے دوڑ گئے تو تم کیوں نہ دوڑے۔ آپ نے نہایت اطمینان سے پرسکون ہو کر جواب دیا کہ راستہ کشادہ تھا اور مجھے آپ کے ظلم کا ڈر نہیں تھا اس لئے بھاگنے کی ضرورت میں نے محسوس ہی نہیں کی۔

کچھ دیر کے بعد جب مامون شکار سے واپس پلٹا تو ابھی لڑکے وہاں موجود تھے۔ وہ سب دوڑ گئے اور امام کھڑے رہے۔ اس کو روک کر اس نے دریافت کیا کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ امام نے فرمایا: بادشاہوں کی عادت ہے شکار کرتے ہیں اور بازوں کو ہوا میں چھوڑتے ہیں اور ان کے باز فضائے بسیط سے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں اور بادشاہ مٹھی میں بند کر کے اللہ کے اولیاء کا امتحان لیتے ہیں۔

امام کے علمی وقار سے متاثر ہو کر خلیفہ نے اپنی بیٹی ام الفضل کا نکاح امام محمد تقیؑ سے کرنے کا ارادہ کیا تو عباسیوں نے اعتراض کیا۔ پس اس دور کے سب سے بڑے قاضی یحیٰی ابن اکثم سے خواہش کی کہ امام لاجواب ہوں اور مامون اپنے رادہ سے باز آجائے۔ چنانچہ مامون کے بھرے دربار میں یحیٰی ابن اکثم نے امام سے فرمایا: کہ محرم حالت احرام میں اگر شتر مرغ کا انڈا توڑ دے تو اس کا کفارہ کیا ہو گا؟

آپ نے فرمایا۔ اتنا بڑا علم کا دعویدار ہو کر اس قدر مہمل سوال کیا ہے تو نے؟ تفصیل سے بیان کرو کہ محرم نے حرم کے حدود کے اندر یہ غلطی کی ہے یا حرم

سے باہر؟ اور غلطی کرنے والا آزاد تھا یا غلام؟ نیز غلطی اس نے عمداً کی تھی یا سہواً۔ نیز اس سے پہلے بھی اس قسم کی غلطی وہ کر چکا تھا یا یہ پہلی غلطی تھی؟ نیز یہ احرام اس کا حج کا تھا یا عمرہ کا؟ وغیرہ۔

یہ تفصیلات سنتے ہی یحییٰ ابن اکثم شرمندہ اور سرافگندہ ہوا تو امام نے ترتیب وار ہر شق کا الگ الگ کفارہ بیان فرمایا۔اس کے بعد امام نے فرمایا:

اگر اجازت ہو تو میں بھی ایک سوال کر لوں؟ یہ بتاؤ کہ وہ کونسی عورت ہے جو ایک ہی دن میں' ایک ہی شخص پر چار دفعہ حرام ہے؟اور چار دفعہ وقفہ وقفہ کے بعد حلال ہے؟ یحییٰ بن اکثم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

تو مامون کے کہنے پر امام نے خود بیان فرمایا:

ایک عورت کسی کی کنیز ہے تو دوسرے شخص پر وہ حرام ہے جب اس نے خرید کر لی تو اس پر حلال ہو گئی پھر اس کو اسی شخص نے آزاد کر دیا تو اس پر حرام ہو گئی لیکن بعد میں اس سے نکاح کر لیا تو حلال ہو گئی۔ پھر اس نے اس سے ظہار کر لیا تو حرام ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد اس نے ظہار کا کفارہ دے دیا تو وہ پھر حلال ہو گئی۔اس کے بعد طلاق رجعی دے دی تو حرام ہو گئی اور رجوع کر لیا تو حلال ہو گئی۔

جب مامون عباسی مقام مرو میں تھا (مرو ایک نہایت ٹھنڈی اور صحت افزاء اور پرسکون جگہ تھی جہاں موسم گرما گذارنے کے لئے وہ گیا ہوا تھا۔ غالباً آج کل وہ علاقہ رُوس کے قبضہ میں ہے) امام رضا علیہ السلام بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ چونکہ

مامون نے امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا اعلان کیا ہوا تھا اور عباسی خاندان کے تمام لوگ مامون سے اس بارے میں ناراض تھے۔ پس وہ اس ولی عہدی کے عہد کو ختم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اطراف عالم سے مختلف مذاہب کے علماء کو مرو میں آنے کی دعوت دی تاکہ وہ آ کر علمی موضوعات پر امام رضا علیہ السلام سے گفتگو کریں۔ پس جب وہ لوگ امام رضا کو عاجز کر دیں گے تو ولی عہدی کا عہد اس بہانہ سے توڑ دیا جائے گا کہ معاذ اللہ ان کے علم میں نقص ہے۔

چنانچہ اطراف سے وقت مقررہ وقت پر مختلف مذاہب کے علماء پہنچ گئے۔

☆ یہودی ☆ عیسائی۔

☆ ازرتشتی (آتش پرست) ☆ دھریے۔

☆ لا مذہب

(لا مذہب) پس دربار سجایا جانے لگا۔ اور ملک کے تمام دانشور لوگوں کو اطلاعات بھیج دی گئیں تاکہ مقررہ تاریخ پر وقت مقررہ پر دربار میں علمی بحث سننے کے لئے آئیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کا ایک غلام نہایت کرب و اضطراب سے ہانپتا کانپتا ہوا بارگاہ امامت میں حاضر ہوا تو آپ نے وجہ اضطراب پوچھی۔ کہنے لگا: مامون نے مختلف غیر اسلامی مذاہب کے علماء کو آپ سے بحث کرنے کے لئے بلوایا ہوا ہے۔ اور وہ کل آپ سے مناظرہ کریں گے آپ نے فرمایا:

''پھر اضطراب اور پریشانی کی کونسی بات ہے؟''

اس نے عرض کیا: کہ آپ کو اطلاع دی جاتی تاکہ آپ اس کے

لئے تیار ہو جاتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا:

امام کا علم نقد ہوتا ہے۔ وہ کسی مطالعہ کتب بینی یا صلاح و مشورہ کا محتاج نہیں۔ یہود و نصاریٰ و زرتشتی و دھریئے۔

آپ نے فرمایا:

تم نہ گھبراؤ میں اس کا بیٹا ہوں جس نے مسجد کوفہ کے چھلکتے ہوئے مجمع میں بیانگ دہل اعلان فرمایا تھا کہ اگر تکیہ لگا دیا جائے اور اطمینان سے بیٹھنے کا موقع دستیاب ہو تو بے شک تورات و زبور اور انجیل و فرقان والے سب لوگ اپنی اپنی کتابیں اٹھا کر لائیں۔ میں ہر صاحب کتاب سے اس کی زبان اور اسی کی کتاب سے مسائل کو حل کروں گا کہ وہ کتابیں خود میری صداقت کی گواہی دیں گی۔

آپ کا غلام غالباً ہرثمہ بن اعین ہوگا۔ خاموش ہو گیا اور مطمئن ہو گیا۔

دوسرے روز علیؑ الصبح مامون کا غلام شاہی پیغام لایا کہ دربار میں اتفاق سے غیر ملکی اور غیر اسلامی علماء حاضر ہیں جو آپ سے تبادلۂ خیالات کے خواہش مند ہیں۔ آپ بنفس نفیس آنے کے اگر زحمت نہ اٹھائیں تو میں خود ان کو ساتھ لے کر آپ کے در دولت پر حاضر ہوں گا۔

آپ نے فرمایا:

میں کمزور نہیں ہوں کہ دشمن اسلام میرے گھر پر آ کر مجھ سے بات کرے۔ مجھے وقت بتا دیا جائے میں خود حاضر دربار ہو کر دشمنان اسلام پر اسلامی حقائق واضح کر کے انہیں قائل کروں گا۔

چنانچہ آپ مقررہ وقت پر تیار ہو کر نکلے۔ غسل کی تجدید فرمائی اور لباس پیغمبرؐ زیب دوش۔ عمامۂ رسول۔ زیب سر۔ نعلینِ پیغمبرؐ زیب پا اور عصائے پیغمبرؐ ہاتھ میں لے کر چلے۔ گویا آج امام رضاؑ محمد مصطفیٰؐ نظر آ رہے تھے۔

مجھے امام رضا علیہ السلام کے شبیہ پیغمبرؐ ہونے کی ایک روایت یاد آ رہی ہے کہ جب امام عالی مقام نیشاپور میں وارد ہوئے تھے ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک مقام پر حضرت پیغمبرؐ کی آمد کا اعلان ہوا تو میں بھی دوڑ کر وہاں پہنچا دیکھا ایک بہت بڑی جلسہ گاہ ہے اور لوگ کھچا کھچ اس میں جمع ہیں۔ اور کافی تعداد میں اور بھی پہنچ رہے ہیں۔ پس میں مجمع کو چیرتا ہوا جلسہ کے سٹیج کے قریب جا پہنچا دیکھا تو حضرت پیغمبرؐ اپنے مخصوص انداز میں جلوہ گر ہیں اور سامنے ایک طشت ہے جس میں کھجوریں رکھی ہیں۔ میں نے جرأت کر کے آپ سے کھجوریں طلب کیں تو آپ نے مٹھی بھر کر میرے دامن میں ڈال دی۔ میں نے گنے تو اٹھارہ دانے تھے۔ پس خواب سے بیدار ہوا اور سوچ ہی رہا تھا کہ شیطان تو بشکل معصوم آ نہیں سکتا خدا جانے اس کی تعبیر کیا ہوگی؟

چنانچہ صبح سویرے ایک منادی کی آواز کان میں آئی کہ آج امام رضا علیہ السلام وارد نیشاپور ہوں گے اور فلاں جگہ ایک جلسہ عام سے خطاب فرمائیں گے (اور یہ اسی جگہ کا حوالہ تھا جہاں رات کو خواب میں حضرت پیغمبرؐ کو میں نے دیکھا تھا۔) میں نے سمجھا کہ یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔ پس وقت سے پہلے میں پہنچ گیا اور سٹیج کے قریب بیٹھا۔ امام تشریف لائے لوگوں نے استقبال کیا۔ میں نے امام کے سامنے بھی ایک طبق دیکھا جس پر رومال تھا اور اس میں کھجوریں تھیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح رات کو خواب میں دیکھا تھا اور امامؑ بھی اسی لباس میں ملبوس تھے۔

جو رات کو میں نے پیغمبرؐ کے جسم پر دیکھا تھا اور شکل و شباہت نیز قد و قامت میں بھی پوری مشابہت تھی۔ پس میں نے جرأت کر کے کھجوریں مانگ لیں اور امام نے اسی طرح مٹھی بھر کر میرے دامن میں ڈال دی۔ جب گنے تو اٹھارہ دانے تھے میں نے عرض کیا حضورؑ! کچھ اور دیں تو آپ نے فرمایا میرے نانا نے جو کچھ دیا ہے وہی ملے گا۔

وہ بات تو یاد ہے نا۔ امام رضا دربار مامون کی طرف چلے۔ ادھر دربار میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور حکم تھا کہ جب امام رضا علیہ السلام وارد دربار ہوں تو کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نہ ان کے لئے راستہ خالی کیا جائے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

امام عالی مقام جب دربار شاہی کے دروازہ پر پہنچے تو جبین مبین سے نور کی لائٹ نکلی۔ جو درباری روشنیوں پر چھا گئی اور جسم اطہر سے اس قدر خوشبو مہکی کہ دربار کی فضا بدل گئی۔ فوراً لوگوں نے گردنیں موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو امام رضا بشکل محمد مصطفیٰؐ نظر آئے۔ بے تحاشا لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور غیبی طاقت نے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹا کر دروازہ سے تخت تک راستہ صاف کر دیا اور امام لوگوں کو سلام لیتے ہوئے خراماں خراماں آگے بڑھتے چلے گئے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

خود مامون تخت سے اٹھا اور نیچے اتر کر امام عالی مقام کو السلام علیک یا ابن رسول اللہ کہہ کر استقبال کیا پس امام آگے آگے اور مامون پیچھے اور مامون نے

امام کو اپنے تخت پر جگہ دی۔ پس امام تخت پر جلوہ گر ہو گئے اور مجمع پر ایک سکوت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ غیر ملکی اور غیر اسلامی علماء خود بخود اس قدر متاثر ہوئے کہ کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکی۔

کچھ دیر بعد مہر خاموشی ٹوٹی اور مامون نے پہل کرتے ہوئے غیر ملکی علماء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ فرزند رسول ہیں۔ آپ لوگوں کو ان کے ساتھ بات چیت کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر مرعوب تھے کہ ایک سکتہ طاری تھا۔ پس سر ہلا کر معذرت خواہ ہوئے۔

صرف یہودی عالم بولا! ہم اس شخص سے ہم کلام ہو سکتے۔ مامون نے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ:

یہ شخص عرب ہیں اور ہم عربی سے نابلد ہیں۔ یہ ہماری زبان نہ سمجھیں گے۔ اور ہم ان کی بولی نہ سمجھیں گے۔ پھر بات کیسے ہو سکے گی؟ امام عالی مقام نے یہودی کو مخاطب کر کے فرمایا اور یہودی عالم! تو اپنی جہالت کا بے شک اعتراف کر لیکن میری طرف جہالت کو منسوب نہ کر۔

اس نے عرض کی آپ عبرانی زبان میں مجھ سے بات کر سکیں گے؟ آپ نے فرمایا: بے شک

اس نے پوچھا آپ تورات کی زبان سے بات کیسے کریں گے۔ جبکہ آپ نے پڑھی نہیں؟ امام نے فرمایا:

میں تورات کو جانتا ہوں۔ اور امام دنیا میں پڑھنے کا محتاج نہیں ہوا کرتا وہ پڑھ کر آتا ہے۔

آپ نے فرمایا:

دس علماء یہود یہاں موجود ہیں۔ میرے ساتھ کس نے گفتگو کرنی ہے؟ اس نے عرض کی میں ہی گفتگو کے لئے حاضر ہوں۔

آپ نے فرمایا:

پہلے یہ بتاؤ کہ تورات کی قرائتیں کتنی ہیں؟ اور تو کس قاری کی قرأت سے بات کرے گا؟ اس نے عرض کی جناب عالی! میں قاریوں اور قرأتوں سے واقف نہیں۔ بس جو قرأت یاد ہے اسی سے بات کروں گا۔

آپ نے پوچھا:

تجھے تورات یاد ہے یا دیکھ کر پڑھے گا؟

عرض کی حضور!

میں حافظ تورات نہیں ہوں۔ ناظرہ پڑھی ہے۔

آپ نے فرمایا:

تم تورات کا فلاں پارہ' فلاں صفحہ' فلاں رکوع پر نظر رکھو اور میں تمہارے سامنے تمہاری ہی قرأت سے تلاوت کو زبانی شروع کرتا ہوں۔

چنانچہ آپ نے وہاں سے پورا ایک رکوع پڑھا تو دریافت فرمایا جو کچھ میں نے پڑھا ہے درست ہے؟

تمام یہودی علماء عش عش کر اٹھے اور عرض کی بے شک آپ نے درست تلاوت کی ہے؟

آپ نے فرمایا:

تمہیں اسی تورات کی قسم اور اس تورات کو لانے والے نبی موسیٰ کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کیا اسی رکوع میں میرا حلیہ نہیں بیان کیا گیا کہ آخری نبی کے آٹھویں قائم مقام کا حلیہ یہ ہوگا۔

یہ سن کر یہودی سارے کے سارے دم بخود ہو گئے اور انہوں نے چپ سادھ کر عملی طور پر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔

پس آپ نصرانی اور زرتشتی علماء کی طرف متوجہ ہوئے تو سب نے وعدۂ فردا پر بات کو ٹال دیا۔ مجمع پر بھی سکتہ طاری تھا۔ مامون خود حیرت کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا کہ دہریہ (لامذہب) عالم بول اٹھا۔ اے بادشاہِ وقت! یہ لوگ اہل کتاب ہیں اور اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں ایک عقلی سطح پر سوال کرتا ہوں۔ اگر مجھے مطمئن کر دیا گیا تو میں ضد کرکے بات کو نہ ٹالوں گا۔ بلکہ کلمۂ اسلام فوراً زبان پر جاری کرلوں گا۔ امام عالی مقام نے فرمایا جو چاہو پوچھو!

اس نے عرض کی آپ لوگ اللہ کو علیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر مانتے ہیں اور میں اس دعویٰ کو چیلنج کرتا ہوں۔

آپ نے فرمایا:

جو کچھ تیرے پاس اس دعویٰ کے خلاف مواد ہے پیش کر اور جواب لے۔

اس نے عرض کی کہ اگر اللہ ہر شی پر قادر ہے تو کیا آسمانوں اور زمینوں سمیت پورے عالم کو مرغی کے انڈے میں داخل کرسکتا ہے؟ اگر نہیں کرسکتا تو قادر نہیں اور اگر کرسکتا ہے۔ تو اس کی دلیل یا مثال پیش کیجئے!

آپ نے فرمایا:

تم ایک دفعہ شش جہت کی طرف نگاہ کرو اس نے ہر طرف دیکھا۔

آپ نے فرمایا:

کیا دیکھا؟ اس نے عرض کی زمین و آسمان' شمال و جنوب' اور مشرق مغرب کو دیکھا۔

آپ نے فرمایا:

آنکھیں بند کر لو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے فرمایا:

جو کچھ تو نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا وہ سب کچھ آنکھ کی پتلی میں محفوظ ہے؟ یا مٹ چکا ہے؟ اس نے عرض کی کہ سب کچھ محفوظ ہے۔

آپ نے فرمایا:

جو اللہ رائی کے دانے کے برابر آنکھ کی پتلی میں چودہ طبق داخل کر کے محفوظ رکھ سکتا ہے اس کے لئے مرغی کے انڈے میں داخل کرنا کیا مشکل ہے؟

یہ ایک ایسا اقناعی جواب تھا جس کے سامنے وہ دھریہ سکتے میں آ گیا اور باذوق لوگوں نے خوب داد دی۔

بقول بعض علماء (شیخ مجتبیٰ لنکرانی قدہ) (نجف اشرف میں ہم نے ان سے مکاسب پڑھی تھی) آپ نے اس کے بعد ایک جلی جواب پیش کیا۔ فرمایا تم کیا کاروبار کرتے ہو؟ اس نے عرض کی درکھان ہوں۔ لکڑی کا کاروبار کرتا ہوں اور اس کام میں مجھے پوری مہارت حاصل ہے آپ نے فرمایا:

یہ دیکھو میرے ہاتھ میں کیا ہے کہا چھڑی ہے۔

آپ نے فرمایا:

یہ چھڑی کس شئے کی ہے؟ کہا لکڑی کی ہے۔

آپ نے فرمایا:

یہ لکڑی ہے اور تو کاریگر ہے۔ اس لکڑی سے مثلاً کیا مجھے ایک میز یا کرسی تیار کر کے آپ دے سکتے ہیں؟ اس نے عرض کی نہیں۔

آپ نے فرمایا:

کیوں؟

اس نے عرض کی۔ اس لکڑی سے یہ چیز تیار نہیں ہو سکتی۔

آپ نے فرمایا:

کیا تم کاریگر نہیں ہو؟ یا یہ لکڑی نہیں ہے؟ اس نے عرض کی حضور! یہ لکڑی ہے۔ اور میں کاریگر ہوں۔ لیکن لکڑی کا مادہ اس قدر ناقص ہے کہ اس سے یہ چیز نہیں نکل سکتی۔

آپ نے فرمایا:

پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مادہ ناقص ہو اور اس سے کوئی شئے نہ بن سکے تو اس میں کاریگر کی کاریگری متاثر نہیں ہوتی اور نہ کاریگر کے فن میں یہ بات عیب کا باعث ہے۔ اس نے عرض کی حضور! ایسا ہی فن۔

آپ نے فرمایا:

جس طرح مادہ کا نقص آپ کے فن کو داغدار نہیں کرتا اسی طرح اللہ تو ہر شئی پر قادر ہے۔ وہ تو آسمان زمین کو انڈے میں داخل کر سکتا ہے۔ البتہ انڈے میں

مادہ کا نقص اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ انڈہ انڈہ نہ رہے گا۔ پس مادہ کا نقص اس کی قدرت کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

وہ دھریہ تڑپ اٹھا اور امام عالی مقام کے قدم بوس ہو کر اس نے فوراً پڑھا:

اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ واشھد ان محمد رسول اللّٰہ
واشھد ان علی رسول اللّٰہ۔

اس کے بعد وہ واپس اپنے وطن کو نہ پلٹا بلکہ امام کا تازیست غلام بن کر رہا۔

یہ تھا امام کا وہ کمال جو حاسدین کی آنکھوں کا خار بن گیا اور وہ امام کے قتل کے درپے ہو گئے ۔ چنانچہ زہر سے امام کو شہید کر دیا گیا۔

اسی امام کی ایک بہن ہے جس کا نام فاطمہ بنت موسیٰ اور مشہور ہے معصومہ قم۔

مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے قافلہ کے ہمراہ سفر کیا یا صرف ایک دایہ ہمراہ تھی۔ اگر دایہ ہمراہ تھی تو اونٹ حاصل کیا گیا اور دونوں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ بڑا کربناک اور اندوہناک سفر تھا لیکن بھائی کی محبت مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ بڑا کربناک اور اندوہناک سفر تھا لیکن بھائی کی ملاقات کے شوق نے یا حکومتی نمائندوں کے جوروستم نے بی بی کو ایران کے سفر کی دعوت دی۔

پس باری باری سے کسی وقت خود سوار دایہ کے ہاتھ میں مہار۔ اور کسی وقت دایہ سوار اور بی بی کے ہاتھ میں مہار۔ چنانچہ عرب کا ریگستان ختم ہوا اور ایران کا پہاڑی سنگلاخ سفر شروع ہوا۔ کہتے ہیں اونٹ راستے میں مر گیا اور بی بی نے

پیدل چلنا شروع کیا۔ پہاڑی سفر تھا ہاتھ پاؤں اور زانو زخمی ہو گئے اس زمانہ میں سڑکیں نہ تھیں خدا جانے ان پہاڑوں سے کیسے گزری ہونگی۔ پھر چودہ سو میل کی حد بندی مجلس پڑھنے والوں کا اندازہ ہے۔ بہر کیف طے منازل کے بعد قم کے قریب پہنچیں۔

دایہ سے فرمایا:

دایہ سے فرمایا: میں تھک چکی ہوں ۔ اگر اس راستے سے کوئی ایرانی گزرے تو اس سے دریافت کرنا کہ امام رضاؑ کا مقام کہاں ہے۔ چنانچہ ایک ایرانی کو آتے دیکھا تو راستہ سے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔اور دایہ نے سوال کیا ۔ اے ایرانی کیا تم مدینہ والے امام رضا کو جانتے ہو؟ وہ چونکہ مومن تھا اس نے ہاں میں جواب دیا اور کہا کہ وہ تو میرا امام ہے۔تم کیوں پوچھتی ہو؟

دایہ نے جواب دیا یہ جو میرے ساتھ پردہ دار ہے اسی امام کی بہن ہے اور بھائی کو ملنے چلی ہے۔ کیا بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے اس نے غالباً جواب دیا۔ یہاں سے خراسان ۶ سو میل کا فاصلہ ہے۔

بی بی نے سنا تو سرد آہ بھری اور فرمایا کافی سفر کر چکی ہوں اب طبیعت میں تاب سفر نہیں۔ دایہ ذرا اس سے پوچھا کہ یہاں سے قم کتنا دور ہے؟ دایہ نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دس فرسخ دور ہے۔ اس نے شاید دریافت کیا ہو کہ قم کا کیوں پوچھتی ہو؟ تو بی بی نے فرمایا۔ دایہ کہو وہاں مومنوں کی آبادی ہے اور بوقت وداع مجھے بھائی نے فرمایا تھا کہ اگر میرے ملنے کے لئے آنا ہو تو قم کا پوچھ لینا۔ وہ ہمارے شیعوں کی آبادی ہے۔

لیکن اب میں نہیں چل سکتی۔ یہ قریب والی بستی کونسی ہے؟ اس نے عرض

کی یہ سادہ ہے۔ بی بی نے پوچھا۔ یہاں کوئی ہمارا ہے تو اس نے عرض کی سارے لوگ مومن و موالی ہیں۔ بی بی نے فرمایا آج رات ہم یہاں آرام کریں گے۔ اور صبح کو قم کا سفر اختیار کریں گے۔

چنانچہ ایک خالی مکان آرام کے لئے دیا گیا لیکن بی بی کو ساری رات امام رضا علیہ السلام کی یاد نے سونے نہ دیا۔ جب رات ڈھلی تو بخار ہو گیا۔ دایہ سے فرمایا مجھے اب بخار ہے۔ اور شاید کل بھی سفر نہ کر سکوں گی۔ صبح سویرے کوئی مزدور تلاش کرنا جو ہماری خبر قم تک پہنچا دے تاکہ وہ خود آ کر ہمیں لے جائیں۔

صبح کو ایک مزدور آیا۔ بی بی نے فرمایا۔ اے عبد خدا میں عالم مسافرت و غربت میں ہوں۔ مجھ سے اجرت کا مطالبہ نہ کرنا۔ اگر غریب سید زادی پر احسان کر سکتا ہے۔ تو قم والوں کو ہماری اطلاع دے دے ان سے کہو امام زادی کافی سفر کر کے تھک چکی ہے اور چلنے کے قابل نہیں۔ خود آ کر مجھے لے جاؤ۔ اس محنت کی مزدوری تجھے میرا نانا رسول اور میری اماں زہراء دے گی اس ایرانی مزدور نے رو کر عرض کی اے بی بی۔ میں اجرت کی خواہش لے کر حاضر نہیں ہوا بلکہ خوشنودی خدا و رسول کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ فرمائیں کس شخص کو اطلاع دینی ہے بی بی نے موسیٰ بن خزاع کا نام لیا اور وہ روانہ ہوا موسیٰ بن خزرج کو جب اطلاع پہنچی تو اس نے ہر گلی و کوچہ اور ہر در پر صدا بلند کی۔ کہ اے قم والو تم ترستے تھے کہ کبھی ہمیں بھی اپنے امام کی خدمت کا موقعہ ملے گا؟ تو امام نہیں لیکن امام زادی فاطمہ بنت موسیٰ لمبے سفر سے تھک کر سادہ تک پہنچی ہے۔ چلو امام زادی کو لے آؤ۔ ان کی خدمت میں خدا اور رسول کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرو۔

چنانچہ اہل قم زن و مرد جوق در جوق روانہ ہو کر سادہ میں پہنچے تو عورتیں

حویلی میں داخل ہوئیں۔ جہاں امام زادی بستر علالت پر محو آرام تھی۔ انہوں نے پہنچ کر امام زادی کو سلام کیا۔ کسی نے ہاتھوں پر بوسہ دیا کسی نے سر کے پریشان بالوں کو چوما۔ کسی نے قدموں پر منہ رکھا آہ و فغاں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بی بی نے فرمایا ہو گا موالیو! تمہارے پردے سلامت رہیں آباد رہو۔ ہمیں تو نانا کی امت نے اجاڑ دیا۔ انہوں نے عرض کی ہو گی۔ اے شہزادی! تیرے تو اٹھارہ بھائی تھے کاش کوئی ایک تو ہمراہ ہوتا۔

بہر کیف تیاری ہوئی ایک محمل امام زادی معصومہؑ قم کے لئے مخصوص کیا گیا۔ موسیٰ بن خزرج نے اعلان کیا کہ تم تمام مرد آگے نکل جاؤ اور خبردار بی بی کے محمل پر کسی غیر مرد کی نگاہ نہ جائے۔ بی بی کے محمل کے ارد گرد مستورات کے محمل ہوں۔ چنانچہ اس سے پہلے کسی شہنشاہ کا بھی اس قدر والہانہ استقبال نہ ہوا ہو گا جو بی بی کے لئے ہوا۔

لیکن مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہر بہن کی اپنی قسمت۔ اے معصومہؑ قم! تجھے اپنے بھائی سے زندگی میں ملاقات تو نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن اہل قم نے تیرا شایان شان ایسا استقبال کیا کہ سفر کے زخم ڈھل گئے۔

ہائے زینب!

بھائیوں کے بعد شامیوں نے تیرا کیا استقبال کیا؟ پہلے سوار ہو کر آ رہی تھیں شام کے قریب پہنچ کر حکم ملا کہ دربار تک کا سفر پیدل عبور کرنا ہے۔

معصومہؑ قم جب شہر قم میں داخل ہوئیں تو کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر عورتوں نے استقبال کیا ہو گا لیکن جھولیوں میں پھول اور ہاتھوں میں خاک شفاء کی تسبیح اور زبان پر ورد درود جاری تھا۔ لیکن جب مسافرہ شام وارد شام ہوئیں تو

عورتیں چھتوں پر تھیں لیکن جھولیوں میں پتھر اور ہاتھوں میں بھی پتھر اور زبان پر یہ نجس کلمہ جاری تھا کہ دیکھو وہ باغی کی بہن آ گئی۔ اتنے پتھر برسائے گئے کہ بی بی کو کہنا پڑا۔ شام والیو!

پتھروں کی برسات کم کرو۔ میرے بھائی کے یتیم بچے زخمی ہو گئے۔

پس معصومہؑ قم اپنی منزل پر پہنچیں جو موسیٰ بن خزرج نے بی بی کے لئے خالی کرائی تھی۔ اٹھارہ دن بمطابق بحار الانوار جلد نمبر۱۴ بیمار رہیں اور بیماری روز بروز بڑھتی گئی آخر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا دشوار ہو گیا۔

بی بی نے فرمایا:

دایہ میرے بھائی کے ملنے کی امیدیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور تاب طبیعت نہیں رہی۔ اب میں موت کے انتظار میں ہوں۔ اور تاب طبیعت نہیں رہی۔ اب میں موت کے انتظار میں ہوں۔ میں جب مر جاؤں تو موسیٰ بن خزارج کو اطلاع دے دینا چنانچہ اشاروں سے نماز ادا کی اور بستر پر سو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دایہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ پاؤں دراز کئے اور اوپر چادر ڈال دی اور خود رونے بیٹھ گئی۔

ادھر سے غالباً نماز صبح کے بعد جب موسیٰ بن خزرج سے گزرا تو دایہ کی آہ و بکا سن کر رک گیا۔ دستک دے کر عرض کی۔ میری مخدومہ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟ دایہ نے عرض کی تم تکلیف کا پوچھتے ہو بی بی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ سنا تھا کہ موسیٰ بن کزرج نے عمامہ اتارا اور گریبان چاک کیا اور روتا ہوا گلیوں' کوچوں میں یہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔ قم والو! آج مصیبت کا دن ہے تمہاری مہمان امام زادی

(معصومہ قم) کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ سنتے ہی عورتوں نے بچوں کو چھوڑ کر پریشان حال وگریبان چاک امام زادی کی حویلی کی طرف پیٹتی ہوئی دوڑیں۔ دیکھا تو امام زادی انتقال فرما چکی تھیں۔ صدائے گریہ اس قدر بلند ہوئی کہ ادھر صف ملائکہ میں صف ماتم بچھ گئی ہو گی اور حوران جنت سے بھی صدائے ماتم بلند ہوئی ہو گی۔

پس تجہیز و تکفین کا انتظام ہوا۔ عورتوں نے غسل مکمل کیا اور کفن پہنایا مردوں نے قبر تیار کی اور جنازہ اٹھایا۔ جب نماز جنازہ پڑھی گئی تو موسیٰ بن خزرج نے ایک دفعہ قبر کو دیکھا اور پھر جنازہ کو دیکھا۔ پس چیخ نکلی اور ہائے ہائے کی آواز بلند ہوئی۔ اہل قم نے پوچھا! اے موسیٰ علیہ السلام اس کی کیا وجہ ہے تو جواب دیا روتا اس لئے ہوں کہ میت کے پانچ کام ضروری ہوا کرتے ہیں۔ چار ہو گئے اور پانچواں کرنے والا کوئی نہیں۔

غسل عورتوں کے ذمہ تھا وہ ہو گیا۔ کفن بھی عورتوں نے پہنا دیا۔ قبر مردوں کے ذمہ تھی تیار ہو گئی۔ اور جنازہ بھی مردوں نے پڑھ لیا۔ اب پانچواں کام باقی ہے۔ دفن کرنا اور شریعت پیغمبر کا حکم ہے کہ عورت کو قبر میں اتارنے کے لئے اس کا محرم ہونا چاہئے یا بھائی ہو یا باپ ہم ہاتھ نہیں لگا سکتے اور عورتیں دفن نہیں کر سکتیں۔ یہ وہ بی بی ہے جس کی اماں کا جنازہ رات کو اٹھا تھا۔ امام رضا کی بہن ہے موسیٰ کاظم کی بیٹی ہے رسول کی نواسی اور زہراء کی پوتی ہے۔ روتا اس لئے ہوں اس کو دفن کون کرے گا؟ قم کے عالم دین ضعیف العمر کو لایا گیا تو انہوں نے فتویٰ دینے کی جرأت نہ کی بلکہ یہی کہا کہ استغاثہ کی صدائیں بلند کرو چنانچہ اہل قم نے استغاثہ کیا تو ابھی تک استغاثہ ختم نہیں ہوا تھا کہ خراسان کی جانب سے گرد اٹھی اور گرد چھٹی تو ایک گھوڑا سوار نظر آیا جس کے سر پر سبز عمامہ تھا اور آنکھیں پرنم تھیں۔

پس گھوڑے سے اترا۔ عمامہ کو ''کوچ'' میں رکھا۔ گریبان کھولا۔ آستین الٹیں اور نعلین اتار کر معصومہ کی میت کی طرف روانہ ہوا اور اہل قم کو معلوم ہو گیا کہ یہ معصومہ کا وارث ہے۔

یہاں تک روایت کا تعلق ہے لیکن مجلس خواں مقام کی مناسبت اور زبان درایت سے بیان کرتے ہیں کہ روح کو روح سے تعلق ہے جب امامؑ نے قدم بڑھایا اور مشام عصمت میں خوشبو پہنچی تو معصومہؑ کی میت تڑپی اور جوں جوں قریب ہوتے گئے اضطراب بڑھتا رہا۔ پس سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔ قم والو! تم گردنیں جھکا لو میں بہن سے بات کرتا ہوں۔ پس امامؑ نے سرہانے کی طرف سے بند کفن کھولا اور پیشانی پر بوسہ دے کر کہا۔ آنکھیں کھولو میں رضا ہوں۔ پس میت تڑپی اور بند کفن کھلے پس دونوں ہاتھ بلند کر کے بھائی کی گردن میں ڈال کر کہا۔ اس وقت آئے ہو جب میں ختم ہو گئی.......... ہائے میرے زخمی ہاتھوں کو دیکھو میرے زخمی پاؤں کو دیکھو آپ کی خاطر میں نے کتنے مصائب جھیلے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن

تیرہویں مجلس

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ

(اس دن کو یاد رکھو) جس دن ہم تمام لوگوں کو امام کے ساتھ بلائیں گے

اس جگہ اللہ نے دو چیزوں کا خصوصی تذکرہ فرمایا ہے قیامت اور امامت یعنی قیامت کو نہ بھولو اور امامت کو معمولی نہ سمجھو۔ کیونکہ ہر تاریخ کو انسان بھلا سکتا ہے لیکن پیشی کی تاریخ نہیں بھلائی جا سکتی۔ پس قیامت کو اس لیے یاد رکھو کہ تمہاری پیشی کا دن ہے۔ اور امامت کو اس لیے نظر انداز نہ کرو کہ اس دن پیشی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ اگر امام اچھا نہ ہوگا۔ پس نیک بخت وہ انسان جس کا امام کامیاب اور بدنصیب وہ انسان جس کا امام ناکام۔

دیکھیے جو بھی دنیا میں آیا اس نے یہاں سے جانا ضروری ہے۔ آنا اختیاری ہے نہ جانا جب جس کو جہاں، جس خاندان میں، جس شکل وصورت میں وہ بھیجے اسے آنا پڑتا ہے۔ نہ مجال انکار۔ اور جب جسے جہاں، جس حالت میں، گھر میں یا سفر میں، بچپنے میں، جوانی میں یا بڑھاپے میں۔ بیمار کر کے یا تندرستی کی حالت میں

وہ بلالے اسے بلا عذر جانا پڑتا ہے۔ نہ آنے والا آج یا کل کی مہلت مانگ سکتا ہے اور نہ مرنے والا کل یا پرسوں تک کی چھٹی لے سکتا ہے۔

پیدا ہونے اور مرنے میں مجبور ہے لیکن درمیان میں بااختیار ہے کوئی مجبوری نہیں۔ خواہ نیک ہو کر زندگی گزارے یا بد ہو کر رہے۔ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ اور مرنے کے بعد پھر وہ اُٹھائے گا اور وہ بھی انسان کی مرضی سے نہیں بلکہ میری مرضی سے۔ جس طرح پیدا ہونا بے اختیاری کا اور مرنا مجبوری کا۔ اسی طرح وہ جب اُٹھائے گا تو اُٹھنا بھی مجبوری کا ہوگا پس اس دن حساب لے گا کہ اس عطا شدہ زندگی کو تو نے کہاں خرچ کیا؟ کیونکہ یہ تیرے اختیار میں تھا۔ پس جن امور میں تو بے اختیار ہے وہ نہ پوچھے گا لیکن جہاں اس نے اختیار دیا ہے اس کے متعلق سوال کرے گا۔

پس انسان کو زندگی کا ہر لمحہ سوچ سوچ کر گزارنا چاہئے۔ اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہئے۔

اس لئے احمق ہے وہ انسان جو پل کو گھر سمجھے کیونکہ پل ٹھہرنے کے لیے نہیں بلکہ گذرنے کے لیے ہے اور یہ دنیا قیام گاہ نہیں ہے عبوری گزرگاہ ہے۔ پہلے کافی لوگ گزر گئے آج ہم گزر رہے ہیں۔ ہمارے بعد اور آئیں گے اور یہاں سے گزریں گے۔ پس کسی کو گرتے دیکھ کر خوش نہ ہو بلکہ اپنے قدم درست رکھو۔

اور ارشاد ہے:

نالائق ہے وہ انسان جو کمرۂ امتحان کو تفریح گاہ سمجھے اور ہنس کھیل کر وقت ضائع کر دے۔ یہ دنیا ایک کمرۂ امتحان ہے اس میں سوچ سمجھ کر اپنے اوپر عائد شدہ سوالات کا جواب تیار کرو۔ اگر انسان نیکی کا ارادہ کرے تو ایک نیکی لکھی جاتی ہے

اور جب عمل کرے تو دس نیکیاں' اور دوسری طرف برائی کا ارادہ کرے تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور برائی کرے تو سات گھنٹے یا سات دن تک نہیں لکھا جائے گا کہ شاید توبہ کر لے اور اگر لکھی بھی جائے گی تو صرف ایک ہی لکھی جائے گی۔

دیکھئے کمرۂ امتحان میں انسان کا قلم آزاد ہے جو چاہے لکھے۔ اگر غلط لکھ لے تو اس کو کاٹنے کا بھی اختیار ہے۔ نہ قانون روکتا ہے اور نہ نگران اس کے ہاتھ کو پکڑ سکتا ہے۔ اگر خود اپنے ہاتھ سے غلطی کو کاٹے گا تو اس کے نمبر نہ کٹیں گے لیکن اگر غلطی کو قلم زد خود نہ کرے تو پرچہ دیکھنے والا غلطی نہ کاٹے گا۔ اس کے نمبر کاٹے گا اور غلطی کو وہی کاٹ سکتا ہے جو اپنے سابق لکھے ہوئے کو دوبارہ پڑھے۔

انسان بھی اس زندگی کے دوران جن جن غلطیوں کو کاٹنا چاہے بخوبی توبہ کی قلم سے اسے کاٹ سکتا ہے اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ثانی کرے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ پرچہ کو پڑھ کر آسان سوالات کا حل پہلے کر لینا چاہئے تاکہ اگر وقت ختم ہو جائے تو پاس ہونے کے نمبر تو مل جائیں گے ایسا نہ ہو کہ شروع سے ہی مشکل سوالات میں الجھ جائے اور وقت گزر جائے۔

دنیاوی امتحانات میں اگر کوئی کسی کی نقل کرے تو خلاف قانون ہے۔ لیکن زندگی کے اس امتحان میں نقل کرنا بھی ثواب ہے۔ لیکن نقل اس کی کرے جس کے کامیاب ہونے کا یقین ہو۔ ایسے کی نقل نہ کرے جس کے ناکام ہونے کا یقین ہو۔ پس اگر حیدری ہے تو نقل ابوذر کی کرے اور حسینی ہے تو نقل حر کی کرے۔ ایسا نہ ہو کہ حیدری کہلاتے ہوئے امیر شام کے کردار کی نقل کرے یا حسینی کہلا کر یزیدی افعال کی نقل کرے۔

دیکھئے کربلا میں شرکائے امتحان ۷۲ تھے۔ کئی وہ تھے جنہوں نے شروع

سے ہی اس امتحانی پرچہ کو صحیح حل کیا اور حر وہ ہے جس نے پرچہ غلط حل کیا اور کمرۂ امتحان بند ہونے سے پہلے غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر اس نے تمام غلطیوں پر توبہ کا قلم پھیر دیا۔ اور حبیب بن مظاہر کی طرح کامیابی کی سند لے لی۔

جب ایک انسان کا دامن نجس ہو اور سامنے دریا بہہ رہا ہو تو اس کو فکر کی کیا ضرورت؟ اس کا کام ہے دامن کو دریا میں غوطہ دینا۔ اور دریا کا کام ہے اسے پاک کرنا۔ یہ دامن کو دریا میں ڈالنے سے بخل نہ کرے تو دریا اس کو پاک کرنے میں بخل نہ کرے گا۔

اے مومن!

تیرا وسیلہ حسینؑ ہے اور بخشش خدا کا سمندر تیرے سامنے موجزن ہے اپنے گنہگار دامن کو توبہ کے ذریعے سے حسینؑ کے وسیلہ سے دریائے مغفرت پروردگار میں داخل کرنے سے بخل نہ کرو۔ وہ بخشنے سے بخل نہ کرے گا۔

اللہ چاہتا ہے کہ میں نے کرامت کا تاج تیرے سر پر رکھا ہے تو میری بارگاہ میں اسی تاج کے ساتھ حاضر ہو۔ اس کو پاؤں میں روندنے کی کوشش نہ کر۔ خداوند کریم نے انسان کی حسین تخلیق پر خود ناز کیا ہے چنانچہ تین وزیتون وطور سینین اور بلد امین کی قسم کھا کر فرمایا۔ ہم نے انسان کو بہت اچھی وضع وشکل سے خلق کیا ہے۔ ایک مقام پر انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

تَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ

ایک مقام حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا:

مَالِبَنِیْ اٰدَمَ وَالْفَخْرَ اَوَّلُہٗ نُطْفَۃٌ وَآخِرُہٗ جِیْفَۃٌ

انسان بنی آدم کا فخر سے کیا واسطہ جس کی ابتداء نطفہ ہے اور انتہا مردہ

ہے۔ پس اے انسان اپنی موجودہ حالت پر ناز نہ کر بلکہ اس کے کرم پر ناز کر۔ اپنی جوانی پر گھمنڈ نہ کر بلکہ اس کی مہربانی کا شکر ادا کر جس نے ایک گندے پانی کی حیثیت سے نکال کر تجھے اشرف المخلوقات کی خلعت عطا فرمائی۔

نجس قطرہ کو مناسب ماحول میں اپنے ید قدرت سے اس کی تربیت فرمائی۔ قطرہ سے خون بستہ پھر گوشت کا لوتھڑا پھر اس میں ہڈیوں پٹھوں رگوں اور خون کی نالیوں کا جال بچھایا پھر تمام اعضاء اپنی اپنی جگہ پر فٹ کئے اور ہر ایک عضو کا دوسرے سے کنکشن درست کیا اور اوپر چمڑے کا غلاف چڑھا دیا تاکہ ساری مشینری محفوظ رہے۔

اور چار ماہ تک پوری فٹنگ کے بعد جب تک روح کا کنکشن آن نہ کیا نہ ماں کو خبر تھی کہ کیا ہے اور نہ باپ کو پتہ تھا کہ کیا ہے؟ جب روح کا کنکشن آن ہوا تو ماں سمجھی کہ خدائی دستر خوان پر آنے والا مہمان خصوصی عنقریب میری گود کی بھی زینت بنے گا پس خوشیوں کی لہر دوڑ گئی ابھی تک اس مہمان کی شکل کسی نے نہیں دیکھی۔ نہ نر یا مادہ کا پتہ ہے نہ یہ خبر ہے کہ وفادار ہوگا یا بے وفا؟ مومن ہوگا یا کافر؟ نیک ہوگا یا بد؟ خوبصورت ہے یا بدصورت؟ لیکن تمام احباب اس کی آمد کے منتظر اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کوئی جھولا تیار کر رہا ہے۔ کوئی پوشاک بنا رہا ہے غرضیکہ اے انسان تیری آمد سے پہلے یہ استقبالیہ پارٹی تیری خوش آمدید کے لیے چشم براہ ہے۔ دیکھے اور آزمائے بغیر ان کے دلوں میں تیری محبت ڈالنے والا کون ہے؟

اے انسان تیرے جسم کے اعضاء کو جس مستحسن ترتیب سے میں نے جوڑا ہے۔ کوئی ہے دنیا کا دانشمند جو میری اس فٹنگ میں کوئی عیب نکال سکے۔ اگر پاؤں

میں کانٹا چبھے تو زبان سے ہائے نکلتا ہے آنکھ سے آنسو نکلتا ہے اور ہاتھ فوراً مقام ''حادثہ'' پر پہنچتا ہے۔ بتاؤ تکلیف تو وہاں تھی ان اعضاء کو کیسے پتہ چلا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہر عضو سے دوسرے عضو تک لطیف سا کنکشن ہے کہ ایک عضو کی تکلیف تمام اعضاء کو بے چین کر دیتی ہے۔

غالباً اسی نسبت سے معصومؑ نے فرمایا کہ تم تمام مومنین جسم واحد کی طرح ہو جاؤ۔ کہ جس طرح جسم کے ایک عضو کی تکلیف سب اعضاء کو متاثر کرتی ہے اسی طرح دنیا کے کسی حصہ میں مومنوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو دنیا کے تمام مومنوں کو تڑپ جانا چاہیے۔ اے انسان شکم مادر میں تیری غذا ماں کا خون تھا جب ماں کی گود کی زینت بنا تو تیری غذا کا وہ راستہ بند کر دیا گیا اور منہ کو تیری غذا کا راستہ بنایا اور ماں کا سینہ تیری غذا کا خزینہ بن گیا۔ شکم مادر میں منہ کے ذریعے غذا نہیں دی گئی کیونکہ وہ غذا زبان سے مس ہونے کے قابل نہ تھی۔ پس جب تک تو خدائی دسترخوان پر تھا تو تیری زبان کو اس نے نجس نہ ہونے دیا بلکہ غذا کا راستہ بدل دیا اب دنیا میں اس زبان کو نجس نہ کر کیونکہ یہ زبان ذکر خدا اور ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کے لیے ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ شیعہ کوے کی طرح لالچی نہیں ہوتا اور کتے کی طرح بھونکتا نہیں ہے یعنی منشائے خدا و رسول و آئمہ کے خلاف زبان کو استعمال کرنا۔ بولنا نہیں بلکہ بھونکنے کے مشابہ ہے۔

شکم مادر میں تو بیمار تھا تو اللہ نے علاج کیا۔ بھوکا تھا تو اللہ نے رزق پہنچایا اور تیری تمام ضروریات کا کفیل وہی رہا۔ اب تیرے جوان و طاقتور ہونے کے بعد اس کی قدرت سے تو بعید نہیں ہے کیونکہ روح کا وہ کنکشن جس کے آن ہونے سے تجھے زندگی ملی۔ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہے اگر چاہے تو آن رہنے دے اور

چاہے تو آف کر دے بچپنے میں، جوانی میں، بڑھاپے میں، سفر میں، گھر میں بیمار کر کے یا تندرستی کی حالت میں جب چاہے وہ اس زندگی کے بٹن کو آف کر سکتا ہے لہٰذا اس کا شکر ادا کرو اور اس کی گرفت سے ڈرو۔

یہ انسان کس قدر جفا کار ہے۔ کہ ہر ایک کو خوشی سے سلام کرتا ہے سپاہی کو سلام، افسر کو سلام، دوست کو سلام، بزرگ کو سلام، ساتھی کو سلام بلکہ ہر ایک کو سلام لیکن اگر سلام نہیں کرتا تو اس مہربان خالق کو جس نے سب کچھ مفت عطا فرمایا ہے۔ سجدہ میں جا کر سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہٖ کہہ دینے سے اس کا حق عبودیت تو پورا نہیں ہوتا یہ تو صرف سلام ہے اور اقرار ہے کہ میں تیرا عبد ہوں اور تو معبود ہے۔

ہمارے عبادت کرنے سے اللہ کی شان میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کو ملائکہ کا سجدہ بڑھاتا نہیں اور ابلیس کا انکار گھٹاتا نہیں۔ ابراہیم و موسیٰ کا سجدہ فائدہ نہیں دیتا اور نمرود و فرعون کی سرکشی نقصان نہیں پہنچاتی۔ پس وہ عبادت سے بڑھتا نہیں اور نافرمانی سے گھٹتا نہیں۔ کیونکہ جو گھٹے یا بڑھے وہ خدا نہیں۔

دیکھیے جو بیٹا باپ کو ابا نہ کہے تو اس میں باپ کو کوئی نقصان نہیں بلکہ نقصان اسی بیٹے کا ہے۔ جو باپ کو ابا نہیں کہتا۔ کیونکہ دنیا اس کو حرامی کہے گی۔ اسی طرح اللہ چاہتا ہے کہ میرے بندے دنیا میں مجھے یاد کر کے میرے بندے کہلائیں اور نافرمانی کر کے اور میرے حکم کے سامنے سرتابی کر کے شیطان کے بندے نہ کہلائیں۔

ایک ہوٹل کے سامنے سے انسان گزر رہا ہو تو ہوٹل والا کتنی لجاجت اور خوشامد سے مدعو کرتا ہے۔ پھر ہوٹل کے ملازمین میز کرسی جگ گلاس، بجلی کا پنکھا سب طرح کی تواضع کر کے چائے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے مالک کو صرف ایک

روپیہ وصول ہوتا ہے اور اگر وہ ایک روپیہ بھی معاف کر دے تو دل میں خوشی پیدا ہوتی ہے لیکن یاد رکھو! اس نے ایک روپیہ معاف کر کے اگر یہ شخص باضمیر ہے تو اس کا ضمیر خرید لیا ہے۔ اب جب بھی یہاں سے گزرے گا تو خود بھی اس کا پکا گاہک بن جائے گا اور دوستوں اور احباب کو بھی اس ہوٹل سے روشناس کرائے گا اور آتے جاتے اس کو سلام بھی کرے گا۔ تو اگر اللہ کہے! اے میرے بندے جس نے تجھے صرف ایک روپیہ معاف کیا ہے اس کو تو آتے جاتے سلام کرتا ہے۔ لیکن میں اللہ جس نے تجھے ہر شئے معاف کی ہے کبھی تو پیشانی زمین پر رکھ کر کہہ دیا کر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ۔

دیکھئے کراچی کا ٹکٹ جیب میں ہو اور اسٹیشن پر دو گاڑیاں بیک وقت تیار ہوں۔ ایک کا رخ کراچی کی طرف اور دوسری پشاور جانے ولی ہو تو یہ نہ کہو کہ جس گاڑی پر سوار ہوں گا وہی کراچی لے جائے گی بلکہ اسی گاڑی پر بیٹھنا ہوگا جو کراچی کی طرف جا رہی ہو ورنہ اگر اسی ٹکٹ کے سہارے پشاور والی گاڑی پر بیٹھے حالانکہ اس کو اسٹیشن کا عملہ چیکر اور سواریاں سب کہتے رہیں کہ غلطی کر رہے ہو۔ لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہے کہ ٹکٹ بھی حکومت کی جاری کردہ اور گاڑی بھی حکومت کی۔ لہٰذا جس گاڑی پر بیٹھ جاؤں کراچی پہنچائے گی۔ تو یہ اس کی حماقت ہوگی کیونکہ اگر اس گاڑی پر سوار ہوگیا اور راستہ میں چیکنگ ہوگئی تو جرمانہ بھی پڑے گا۔ ہتک عزت بھی ہوگی پہلا ٹکٹ بھی ضائع اور کراچی جانے کے لیے گاڑی پھر وہی لینی پڑے گی جو کراچی جا رہی ہوگی۔ پس وقت بھی ضائع ہوگا اور منزل پر بھی لیٹ پہنچے گا۔

یہاں دنیا کے پلیٹ فارم سے بیک وقت دونوں گاڑیاں روانہ ہیں ایک کا رخ جنت کی طرف اور دوسری کا رخ جہنم کی طرف۔ جنت کی گاڑی کا ذمہ دار حسینؑ

اور جہنم کی گاڑی کا ٹھیکہ دار یزید۔ اب اگر ٹکٹ علیؑ ولی اللہ کا ہے تو پہچان کر حسینؑ والی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کرو۔ یہ نہ کہو ٹکٹ علیؑ ولی اللہ کا ہے پس جس گاڑی میں بیٹھو گے وہی جنت پہنچائے گی۔

بہرکیف قیامت کے دن اپنے امام کے ساتھ اُٹھنا ہوگا ہر کمزور کو سہارے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ سہارا ایسا مضبوط ہو جو سہارا لینے والے کا بوجھ برداشت کر سکے اگر آدمی کا سہارا ہے تو وہ آدمی خود بیمار نہ ہو۔ اگر دیوار کا سہارا ہے تو وہ گرنے والی نہ ہو اگر لکڑی عصا کا سہارا ہے تو وہ بوسیدہ نہ ہو۔ اگر سہارا کمزور ہوگا تو سہارا لینے والے کو بھی وہ لے ڈوبے گا۔

قیامت کے دن کے لیے امامت علیؑ وہ سہارا ہے جس میں کمزوری نہیں۔ وہ صرف گنہگاروں کا سہارا نہیں بلکہ معصومین کا بھی سہارا ہے امتیوں ہی کا سہارا نہیں بلکہ نبیوں کا بھی سہارا ہے چنانچہ فرمان پیغمبر ہے:

یا علیؑ من ادم الی عیسی تحت لوائی وانت حامل لوائی

یعنی آدم سے عیسیٰ تک تمام نبیوں کو میرے جھنڈے کے نیچے آنا پڑے گا اور تو میرے جھنڈے کو اُٹھانے والا ہوگا۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: جس شخص کے کانوں پر علیؑ کا نام آئے اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو تو اپنی ماں کا شکریہ ادا کرے کہ اس نے اس کے باپ کے حق میں خیانت نہیں کی۔ علیؑ کا نام بہت سے کانوں پر آتا ہے لیکن کلیجہ قسمت والوں کا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور علیؑ کا نام شیعوں کی مخصوص علامت ہے کیونکہ دوسرے جب علیؑ کا نام لیں تو وہ ڈر ڈر کر لیں گے اور شیعہ علیؑ کا نام ہنس ہنس کرے گا۔ اسی طرح دوسرا آدمی علیؑ کا نام

لے گا تو نادان سمجھ کر اور شیعہ علیؑ علیؑ کرے گا تو ایمان سمجھ کر۔

علیؑ وہ امام ہے جس پر امامت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ خلیفہ ہے جس پر خلافت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ ولی ہے جس پر ولایت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ متدین ہے جس پر دیانت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ امین ہے جس پر امانت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ ہمدم نبی ہے جس پر نبوت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ معاون رسول ہے جس پر رسالت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ سخی ہے جس پر سخاوت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ بہادر ہے جس پر شجاعت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ عارف ہے جس پر معرفت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ عابد ہے جس پر عبادت کو ناز ہے۔

اور علیؑ وہ موحد ہے جس پر وحدت کو ناز ہے۔

علیؑ وہ جنتی ہے جس پر جنت کو ناز ہے۔

تم بھی وہ شیعہ بنو جس پر شیعیت کو ناز ہو لیکن یاد رکھو سردار جس قدر عظیم ہو غلام کو اسی کی حیثیت سے رہنا پڑے گا۔ معمولی سردار کا غلام ہو تو اس سردار کی پوزیشن کے مطابق وضع اختیار کرے گا' اور بلند سردار کا نوکر ہو تو اسی سردار کی حیثیت کے مطابق وضع رکھے گا۔ تا کہ اس کا سردار جس بزم میں جائے یہ نوکر اس کے لیے شرم کا موجب نہ بنے۔

شیعو! تم علیؑ کی غلامی کا دعویٰ کرتے ہو تو پہلے سوچو کہ علیؑ کس قدر بلند

سردار ہے اور کس بزم کی زینت ہے .... ہاں ہاں علیؑ وہ سردار ہے جو بزم اولیاء کی زینت' علیؑ وہ سردار ہے جو بزم ملکوت کی زینت' علیؑ وہ سردار ہے جو بزم انبیاء کی زینت ہے جس کے پیچھے شیث سے مہدی تک تمام اولیاء ہوں اور جس کے تابع آدم سے لے کر عیسیٰ تک تمام انبیاء ہوں تم اگر غلام ہو تو کم از کم اس قدر اپنی وضع بناؤ کہ آدم و نوح کے دوش بدوش کھڑا ہونا پڑے تو تمہیں جگہ مل سکے۔

علیؑ کا شیعہ ہو اور بے نماز ہو۔ اس کا کوئی تک نہیں۔ خمس و زکوٰۃ کا پابند نہ ہو یہ کوئی جوڑ نہیں۔ آیئے حسینؑ سے درس لیجئے کہ آخری وقت میں ابو ثمامہ صداوی نے خواہش کی کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو آپ نے اسے دعا دی کہ خدا تجھے نمازیوں میں شمار کر کے اُٹھائے۔

زخموں سے چور تھے بدن پر تیروں کے بے حد زخم تھے چنانچہ استغاثہ کیا تو ایک تیر نے پیشانی کو بوسہ دیا پھر استغاثہ کیا تو تیر نے لب مبارک کو زخمی کیا پھر استغاثہ فرمایا تو تیر گلوئے نازنین پر لگا اور پھر استغاثہ کیا تو سہ شعبہ تیر سینے پر لگا اور اس کی نوکیں مڑی ہوئی تھیں وہ سامنے سے نہ کھینچا جا سکا پس پیچھے ہاتھ لے کر اس کو کھینچا اور گھوڑے پر سنبھل نہ سکے تو ایک ظالم نے پہلو میں نیزہ مارا کہ آپ گھوڑے سے گر پڑے بے شک اس موقعہ پر زہرا کی روح نے بڑھ کر گود میں لیا ہو گا تیروں پر کافی دیر تک رہے۔ پس زمین پر پہنچے تو آخری وداع کے لیے خیمہ کی طرف روانہ ہوئے فجعل ینوء وینکب یعنی بمشکل اُٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ نہ معلوم خیمہ کے در پر کیسے پہنچے؟

پھر پچھلی طرف پلٹ گئے اور بقولے آواز دی یا اختاہ اے بہن زینب! چنانچہ بہن اُٹھی اور بھائی سامنے نظر نہ آیا۔ پس واپس آ گئی۔ دوبارہ نحیف آواز سے

فرمایا یااختاہ تو دوبارہ درِخیمہ پر گئیں لیکن بھائی نظر نہ آیا۔ اب جو تیسری بار حسینؑ نے صدا دی تو برقعہ پہنا اور خیمہ سے باہر آئیں۔ اور خیمہ کی پچھلی جانب آ کر دیکھا تو خدا کسی بہن کو بھائی کی یہ حالت نہ دکھائے جو زینب نے حسینؑ کی دیکھی۔

کمر پر ہاتھ ہے اور دوسرا ہاتھ چوب قنات پر ہے۔ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔ ہر زخم سے خون بہہ رہا ہے۔ اور کہہ رہے ہیں۔ زینب تیسری دفعہ آواز دے رہا ہوں لیکن جواب نہیں دیتی۔ پس رو کر بہن نے عرض کیا میں تو حاضر ہوں کیا حسین تو ہے؟ جو سر سے پاؤں تک خون میں گلگوں ہے۔ فرمایا: ہاں! نانا کی اُمت نے یہ حال بنا دیا۔ فرمایا: اگر کوئی کپڑا ہے تو میرے پیشانی والے زخم پر پٹی باندھ دو۔ شاید خون کو روک کر سکینہ سے اور باقی سیدانیوں سے وداع کرنا چاہتے ہوں گے۔ بی بی نے رو کر عرض کی ہوگی: حسین! تیرے کس کس زخم پر پٹی باندھوں؟ جبکہ سرتاپا کوئی جگہ زخموں سے خالی نہیں ہے۔

جب علیؑ کے سر پر حسینؑ نے اپنے عمامہ سے پٹی باندھی تھی تو علیؑ نے فرمایا تھا۔ بقولے: حسین تو خوش نصیب ہے بابا زخمی ہے اور تو پٹی باندھ رہا ہے۔ جب تو زخمی ہوگا تو تیرا بیٹا تجھے پٹی تک نہ باندھ سکے گا۔

بقولے!

بی بی نے عرض کیا مجھے ماں کی وصیت پوری کرنے دیجئے۔ گردن جھکایئے تاکہ میں گردن کا بوسہ لے لوں۔ جب بی بی نے بھائی کی گردن کو بوسہ دیا تو حسینؑ نے فرمایا:

بہن! مجھے بھی اجازت دیجئے کہ تمہارے سر کے بالوں کو بوسہ دے لوں۔

چنانچہ انہوں نے سر سے چادر کا دامن ہٹایا اور حسینؑ نے بوسہ دیا۔

اور آخر میں حسینؑ نے فرمایا۔ بہن زینب! **لا ینسینی فی صلوٰۃ اللیل** مجھے نمازِ تہجد میں بھول نہ جانا۔ پس بی بی نے ہر منزل پر نمازِ تہجد کو جاری رکھا خواہ کس قدر ہی مشکل سفر تھا اور زندانِ شام میں بیٹھ کر نماز ادا کرتی رہیں۔ چنانچہ سجادؑ نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔ قیدیوں کے لیے کھانا اتنا مختصر آتا ہے کہ اگر ہم خود اپنا حصہ پورا لیں تو یتیم بچے بھوکے رہ جاتے ہیں۔ پس جب سے شام میں آئی ہوں پانی سے گذارہ کر رہی ہوں۔ لہٰذا جسم میں کھڑے ہو کر نماز کی طاقت نہیں رہی۔ شیعو! نماز کو ہرگز قضاء نہ کیا کرو۔ ورنہ کیا جواب دو گے؟

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

چودہویں مجلس

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ!

(اس دن کو یاد رکھو) جس دن ہم سب لوگوں کو اپنے اپنے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ امام کے معنی ہیں آگے چلنے والا۔ پس آگے چلنے کا وہی حقدار ہے۔ جو راستے سے اندھا نہ ہو۔

کس قدر دانشمند ہیں وہ لوگ جو خود تو اندھے ہوں لیکن ان کا پیشرو (امام) آنکھیں رکھتا ہو۔ اور کتنے احمق ہیں وہ آنکھوں والے جو آنکھوں کے باجود نابینے کے پیچھے چلنا پسند کریں۔

کس قدر نیک بخت ہے وہ شخص جس کو اللہ نے علیؑ امام عطا فرمایا ہے حالانکہ یہ مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے مانگ کر لیا تھا۔

جب عالم ملکوت کی ابراہیم علیہ السلام کو سیر کرائی گئی تو زیر عرش ایک تصویر نور کو دیکھا پس دریافت کیا کہ یہ کس کی تصویر ہے؟ تو جواب ملا کہ یہ تیری پوتی سلطان الانبیاء کی شہزادی میری کنیز خاص فاطمہ کے نور کی تصویر ہے تو ابراہیم نے

عرض کیا: اس کے سر پر نورانی تاج کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا یہ اس کے والد حضرت خاتم الانبیاء کا نور ہے۔ پھر پوچھا اس کے گلے میں نورانی ہار کیا ہے؟ تو جواب ملا یہ اس کے پاس شوہر علیؑ بن ابی طالب کا نور ہے۔ پھر عرض کیا اس کے کانوں میں دو نورانی گوشوارے سے کون ہیں؟ تو جواب ملا یہ اس کے دو شہزادوں حسنؑ و حسینؑ کا نور ہے۔ پھر پوچھا ان کے گرد۔ نو' نور کن کے ہیں؟ تو جواب ملا یہ اس کی اولاد میں سے نو اماموں کے انوار ہیں۔ پس عرض کی کہ ان چودہ کے گرد تا حد نگاہ انوار کن کے ہیں؟ تو جواب ملا ان کے قیامت تک ہونے والے شیعوں کے انوار ہیں۔ تو حضرت ابراہیم نے عرض کیا: اے اللہ مجھے ان چودہ کے شیعوں میں سے کر کے اٹھانا۔

پس شیعوں کی نسبت علیؑ کی طرف ہے بلکہ ان کی پہچان یہی ہے کہ علیؑ کے شیعہ ہیں۔ پس ان کو ایسے کردار سے گریز کرنا چاہئے جس کو دیکھ کر علیؑ بیزار ہو جائیں۔

چنانچہ مسجد کوفہ سے نکلتے ہوئے چند آدمیوں نے سلام عرض کیا تو آپ نے دریافت فرمایا:

تم کون ہو؟ تو وہ کہنے لگے ہم لوگ آپ کے شیعہ اور حب دار ہیں۔

تو آپ نے فرمایا: مَالِی لاَ اَرٰی فیکم سیما الشیعۃ.

میں حیران ہوں کہ تم میں شیعوں کی ایک بھی علامت موجود نہیں تو وہ کہنے لگے شیعوں کی کیا علامتیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا۔ ان کی آنکھوں میں خوف خدا کی وجہ سے آنسوؤں کی نمی ہوا کرتی ہے۔ پیشانی سجدہ ربانی کی گواہ ہوتی ہے اور ماہ رمضان کے روزوں سے ان کے پیٹ پشت سے ملے ہوتے ہیں۔ (ایسا نہ ہو جس

طرح عام لوگوں میں ایک فقرہ مشہور ہے۔)

"کھاوی رکھ تے پیتی رکھ............دم حیدر حیدر کیتی رکھ۔"

امام نے فرمایا:

شیعو! ہماری زینت بنو۔ ہمارے لئے داغ مت بنو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

میرے والد حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی شہر میں دس ہزار لوگوں کی آبادی ہو اور ہمارے شیعوں میں سے صرف ایک گھر ہو تو وہ ایسا ہونا چاہئے کہ اگر باہر کا مسافر آ کر پوچھے کہ اس شہر میں کوئی دیانتدار' مہمان نواز' عبادت گذار آدمی موجود ہے؟ تو نو ہزار نو سو ننانوے گھر اسی ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ وہ ایک گھر ہے۔ اگرچہ ہے شیعہ۔"

دیکھو ہم اگر بدمعاش امام کو پسند نہیں کرتے تو ہمارا امام بھی بدمعاش غلام کو پسند نہیں کرتا۔

جس طرح کہ امام حسین علیہ السلام نے اعلان جنگ کے بعد اپنی فوج کو چھٹی دے دی اور کافی آدمی چھوڑ کر چلے گئے۔ گویا امام اس سخت ترین وقت میں بھی فوج کی چھانٹی کر کے واضح کرنا چاہتے تھے کہ ہمیں بھرتی کی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے موالی تھوڑے ہوں تو بے شک ہوں لیکن جو ہوں وہ حبیب ابن مظاہر کی طرح کے ہوں۔

ابو ثمامہ صداوی نے عرض کیا حضور! ہم چاہتے ہیں کہ آخری نماز آپ کی

اقتداء میں ادا ہو جائے تو آپ نے دعا دی۔ اللہ تجھے نمازیوں میں سے کرے کہ تو نے اس مشکل وقت میں بھی نماز کو یاد کیا ہے۔

جب ہماری پہچان ہی علیؑ کے نام سے ہے۔ تو ہم ایسا کام کیوں کریں جس سے ہمارا امام ناراض ہو اور قیامت کے دن امت کا حساب امام ہی کے ذمہ ہو گا۔ اللہ کرسی عدالت پر نہیں بیٹھے گا کیونکہ جو کرسی پر بیٹھتا ہے کرسی اس کی ٹیک بنتی ہے اور جو ٹیک کا محتاج ہو وہ خدا نہیں۔ پس کرسی عدالت پر علیؑ ہوں گے۔

چنانچہ پیغمبرؐ نے فرمایا۔ حدیث وسیلہ میں ہے۔ ایک منبر نصب ہو گا جس پر میں ہوں گا اور اس کے ساتھ دوسرے منبر پر علیؑ تشریف فرما ہوں گے۔ رضوان جنت اور دربان جہنم دونوں جنت اور جہنم کی چابیاں میرے قدموں میں ڈالیں گے تو وہ علیؑ کو دے دوں گا۔ پس علیؑ اپنے موالیوں کو جنت میں اور دشمنوں کو جہنم میں پھینکے گا اور مروی ہے کہ پل صراط جو جہنم کے اوپر ہو گی جب لوگ اوپر سے گذریں گے تو علیؑ علیہ السلام دوزخ کو خطاب کر کے فرمائیں گے کہ وہ تیرا ہے اسے ہڑپ کر جا۔ اور یہ میرا ہے اس کو چھوڑ دے۔ اس لئے علیؑ کا لقب ہے۔

قسیم الجنة والنار۔

اور شیعوں کی پہچان نام علیؑ ہے اس طرح ہے کہ مثلاً کوئی تاریک رات میں کسی راستہ پر جا رہا ہو اور دائیں یا بائیں کہیں سے آواز اس کے کان میں پہنچے "یا علی............!" اگرچہ اس نے اس کو دیکھا نہیں'

نہ قد و قامت معلوم۔

نہ نر و مادہ معلوم۔

نہ جن و انسان کا پتہ ہے۔

صرف نام علیؑ سن کر یہ آدمی خود فیصلہ کرے گا کہ جو بھی ہے۔ ہے شیعہ۔

اسی طرح کسی بچے کا نام غلام علیؑ یا غلام حیدر وغیرہ ہو تو فوراً فیصلہ کرے گا کہ کسی شیعہ کا بچہ ہے۔ کسی مکان کے دروازہ پر نام علیؑ لکھا دیکھے تو پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ خود بخود سمجھ جائے گا کہ شیعہ کا گھر ہے۔ اور مسجد کے دروازہ پر نام علیؑ دیکھے تو ہر بندہ یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ شیعہ کی مسجد ہے۔ قرآن کے پہلے خالی ورق پر نام علیؑ لکھ دیا جائے تو ہر قرآن اٹھانے اور پڑھنے والا سمجھ جائے گا۔ یہ قرآن بھی کسی شیعہ کا ہے۔

حد ہے:

کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پڑھ کر خاموش ہوجائے تو کہا جائے گا یہ مسلمان والا کلمہ ہے۔ اور اگر بعد میں کہہ دے **علی ولی اللہ** تو کہا جاتا ہے پورا کلمہ شیعوں کا ہے حالانکہ پہلے دو حصوں پر تو اتفاق تھا کہ وہ مسلمانوں کا کلمہ ہے۔ گویا معلوم ہوا جس کلمہ توحید کے بعد علیؑ کا نام ہو وہ کلمۂ توحید شیعوں کا ہے اور جس کلمۂ رسالت کے بعد علیؑ کا ذکر ہو وہ کلمۂ رسالت شیعوں کا ہے۔

اذان میں بھی اگر اللہ اکبر ہے۔ لا الہ الا اللہ تک درمیان میں علیؑ کی ولایت کی گواہی نہ ہو تو اذان عام مسلمانوں کی ہے اور ولایت علیؑ کی گواہی آجائے تو اذان شیعوں کی ہے۔ آج کل تو بسوں اور کاروں پر بھی نام علیؑ لکھا دیکھ کر آسانی سے پہچان کی جاسکتی ہے کہ ان کا مالک یا ڈرائیور شیعہ ہے۔

تو علیؑ کا نام سن کر گھبرانے والوں سے پوچھا جائے تم نمازیں، روزے، حجتیں، زکوٰۃ، خیرات و صدقات تو اسی لئے ہی کرتے ہو کہ بہشت نصیب ہو لیکن جب تمہارا خیال یہ ہے کہ جہاں علیؑ ہو وہ شے شیعوں کی ہوتی ہے۔ تو پہلے اس سے

پوچھ تو لو۔ کہیں جنت کے دروازہ پر کسی علیؑ کی کرسی نہ ہو۔ ہاں ہاں.......... وہاں علیؑ کا ڈیرہ لگا ہو اور قسیم جنت وہی ہوں۔ یہاں نام علیؑ سننے سے طبیعت گھبراتی ہے۔ وہاں تو خود بنفس نفیس موجود ہوں گے پھر تم اتنا ہی کر سکو گے کہ ادھر کی آنکھیں بند کرکے اگلے گھر چلے جاؤ گے۔ اور شیعان علیؑ نعرۂ حیدری لگاتے ہوئے اسی گھر میں داخل ہو جائیں گے۔

علیؑ جس کا نام ہی علیؑ ہے اس کی عظمت کے کیا کہنے ہے "علیؑ" کا معنی ہے بلند۔ کس سے بلند۔ کتنا بلند؟ یہ نام رکھنے والا ہی بتائے گا لیکن یاد رہے۔ یہ نام ابو طالب نے نہیں رکھا اور نہ فاطمہ بنت اسد نے تجویز کیا ہے بلکہ حضرت محمد مصطفیٰ نے بھی نام نہیں رکھا بلکہ یہ اس نے رکھا ہے جس نے علیؑ کو علیؑ بنایا ہے۔

امینۂ امامت والدۂ علیؑ جناب فاطمہ بنت اسد اپنے بیت الشرف میں آرام فرما تھیں کہ توحید کے مخصوص وارلیس کے ذریعے خفیہ طور پر کان دکان اطلاع پہنچی میری امانت کی ادائیگی کا وقت قریب ہے میرے گھر آکر میری امانت ادا کیجئے چنانچہ امینۂ امامت نے اپنے بیت الشرف سے بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ پہنچ کر مقامی دستور کے مطابق یا حضرت عبد المطلب کے قانون کے مطابق کعبہ کا طواف شروع کیا۔ ابھی طواف پورا نہیں ہوا تھا کہ فوری طور پر امانت کی ادائیگی کا مطالبہ شروع ہوا۔ دیکھا در بند تھا تو پچھلی طرف دیوار کا سہارا لے کے بی بی نے عرض کی!

اے اللہ تیرے اوپر اور تیرے خلیل اپنے جد ابراہیم پر بھی ایمان رکھتی ہوں۔ تجھے اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے۔ ادائیگی امانت کی گھڑی آسان فرما اور اس کے اسباب کو مہیا فرما۔ چنانچہ کعبہ کو جنبش ہوئی اور فوراً پریشانی ہٹی مشکل کٹی دیوار پھٹی اور شہر علم کے در کے لئے نیا در کشادہ ہوا اور صاحب خانہ کی دعوت

خصوصی پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اندر داخل ہوئیں تو آسیہ و مریم کے ہمراہ حوران جنت نے بڑھ کر استقبال کیا۔ دیوار مل گئی اور در بند ہوا۔ تو تاریکی میں نور پروردگار کی کرنوں نے اجالا کر دیا۔ امانت ادا ہوئی۔ اضطراب ختم ہوا۔ حوران جنت نے ولی اللہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تین دن مسلسل دسترخوان توحید پر مہمان رہیں۔ پھر مرخص ہوئیں تو کس انداز سے؟ جہاں سے آتے ہوئے در کھلا تھا اسی مقام سے پھر در کشادہ ہوا اور امینۂ امامت اب متاع امامت کو بصورت ناطق قرآن جنتی غلافوں میں لپیٹ کر اپنے سینے کا تعویذ بنائے ہوئے باہر نکلیں۔

جب بی بی اندر گئی تھیں تو باہر بیٹھے ہوئے سرداران قریش عباس بن عبدالمطلب اور ابوجہل مخزومی حیران ہو رہے تھے کہ باشعور مستور نے سنت عبد المطلب کے خلاف آداب کعبہ کو نظر انداز کر کے طواف کو ادھورا کیوں چھوڑا؟ دیکھا دروازہ ویسے کا ویسے بند ہے اور قفل لگا ہوا ہے۔ قدموں کے نشان ایک مقام پر رک گئے کہ آگے بڑھی نہیں اوپر کو چڑھی نہیں۔ پس دریائے حیرت میں ڈوب گئے کہ واپس ہٹی نہیں۔ زمین پھٹی نہیں دروازہ کھلا نہیں تو کہاں گئی ہوں گی؟ چنانچہ یہی خبر پورے مکہ میں پھیلی اور زن مرد صحن بیت اللہ میں جمع ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں اور بی بی کے باہر آنے تک کا معاملہ تھا اور جس کی ناموس موضوع گفتگو تھی۔ (ابو طالب) وہ آرام سے اپنے گھر رہے۔

اب تیسرے دن جو باہر تشریف لائیں اور لوگوں کا ہجوم دیکھا فوراً کھڑی ہو گئیں اور خطاب کر کے فرمایا۔ مَن مِثلی میری مثل کون ہو سکتا ہے یعنی اماں حوا سے آج تک کی کوئی عورت اس شرف میں میرے ہم پلہ نہیں ہو سکتی کہ میں مسلسل تین دن کے لئے دسترخوان توحید پر بلائی گئی اور پاک مستورات میری خدمت کے

فرائض انجام دیتی رہیں۔ بے شک مریم کے لئے ایک دن کے لئے کھانا آیا تھا لیکن اسے نہ بلایا گیا بلکہ کھانا پہنچایا گیا اور میری طرف کھانا نہیں لایا گیا بلکہ مجھے دسترخوان توحید پر بلایا گیا۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ مریم کا قصہ تو سورۂ آل عمران میں ہے اور ابھی تک وحی کا نزول نہیں ہوا تھا بلکہ دس سال بعد ہونا تھا تو علیؑ کی اماں نے سورۂ آل عمران میں بیان ہونے والے مریم کے قصہ کو کس سے پڑھا تھا؟

اب تین دن تک گھر میں خاموش بیٹھے رہنے والے کو جتلانے والی ذات نے ظاہری اسباب کے بغیر جتلا دیا۔ اور وہ از خود ولی اللہ فرزند کے استقبال کے لئے بسوئے کعبہ روانہ ہوئے اور راستہ میں ملاقات ہو گئی ادھر مشام امامت میں حضرت ابو طالب کی پاکیزگی کی خوشبو مہکی تو ید الٰہی معصوم ہاتھوں کو جنبش دی تو جنتی غلاف وجہ الٰہی چہرہ انور سے ہٹاتے ہوئے باپ کے چہرہ کی زیارت کرتے ہوئے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر عرض کی۔ السلام علیک یا ابتاہ! ابو طالب نے بڑھ کر علیؑ کو لیا اور سینہ سے لگایا۔ گھر پہنچے دونوں وجہ اللہ کا دیدار کر کے خوش تھے کہ نام رکھنے کی تجویز پیش کی ہوئی تو غالباً فاطمہ بنت اسد کا خیال تھا کہ اس کا نام اسد ہو اور ابو طالب کا خیال تھا کہ نام ہاشم ہو لیکن مہذب خاندان کے مہذب فرد نہ تو ایک دوسرے کی دل شکنی گوارا ہے۔ اور نہ زبردستی اپنا نظریہ دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش ان کا دستور ہے تو ابو طالب نے کہہ دیا کہ اس کا نام وہی ہو گا جو اللہ رکھے گا۔ یعنی تم بھی اپنا خیال چھوڑو۔ اور میں بھی اپنا نظریہ ترک کرتا ہوں۔ اگر یہ ہمارے گھر پیدا ہوتا تو نام ہم رکھتے اب جس کے گھر میں پیدا ہوا ہے نام بھی وہ خود رکھے گا۔

چنانچہ در کعبہ پر پہنچے۔ دہلیز کعبہ پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ میں ولی اللہ

کو تھاما۔ پس ابو طالب گویا ہوئے

یَارب ھذَا الغسق الدجی والقمر المبلج المفی۔

اے اس تاریک رات اور روشن چاند کا پروردگار

بین لنا من امرک الخفی ماذا نسمی ذلک الصبی۔

اپنا مخفی امر واضح فرما کہ ہم اس بچے کا نام کیا رکھیں۔ یہاں یہ بات توجہ ہے کہ اس وقت مکہ کے رؤسا اور صنادید قریش کے جم غفیر میں حضرت ابو طالب اپنے بچے کا نام پوچھ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے اسے تاریک رات اور روشن چاند کا پروردگار تو ہی بتا کہ اس بچے کا نام کیا ہونا چاہئے؟ تو مشرکین مکہ کے سامنے اللہ کی ربوبیت کا اعلان کرنا اور ان کے خداؤں کو نظر انداز کرنا حضرت ابو طالب کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ مشرکین مکہ غالباً اسی دن سے سمجھ گئے تھے کہ اس کا دین اور ہے۔ اور ہمارا دین اور ہے اور اگر آج بھی اس دور کا مشرک دوبارہ زندہ ہو جائے تو ان کو ابو طالب کی توحید پرستی کا انکار نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے کانوں اعلان نبوت سے دس سال پیشتر ابو طالب کی توحید پرستی کا اعلان سن چکے تھے۔ پس ان مشرکوں سے بدتر ہیں وہ لوگ جواب بھی ابو طالب کے ایمان کا انکار کرتے ہیں۔

بہرکیف ابو طالب کی التجاء ہوئی توحید کی طرف سے جوابی کلمات فوراً فضا میں گونجے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے درخت زیتون کے پتے اور وادی مقدس کے کنکر زبان توحید بن کر گویا ہوئے تھے اور ابو طالب کے لئے مسجد الحرام کا ہر ذرہ فضا کا ہر لحہ اور کعبہ کا ہر گوشہ زبان توحید بن کر گونجا۔ اتنے ہی کلمات وہی قافیہ وہی ردیف اور وہی زبان۔ آواز آئی:

خصصتما بالولدالذکی الطاہر المنتجب الرضی۔

تمہیں زکی فرزند سے مخصوص کیا گیا ہے۔ جو طاہر برگزیدہ پسندیدہ ہے۔

اسمہ من شامخ علیٌ علیٌ اشتق من العلی

اس کا نام بلند اللہ کی طرف سے علیؑ ہے۔ جو علیٰؑ سے مشتق ہے یعنی تمہیں معمولی بچہ نہیں بلکہ ذکی فرزند عطا کیا گیا ہے یہ کفر و شرک کی نجاستوں سے وہاں جا کر پاک نہ ہوگا۔ بلکہ پاک کرکے بھیجا گیا ہے۔ یہ دنیا میں چناؤ کا محتاج نہیں ہم نے اس کو چن کر بھیجا ہے۔ اور یہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے اس کو اپنے دفتر رضا کا انچارج کرکے بھیجا ہے۔ میں خود علیؑ ہوں لہٰذا اس کا نام بھی علیؑ رکھ دیجئے۔ پس علیؑ تو وہ امام ہے جس طرح امام ہونے کا حق ہے۔ ہمیں بھی ایسا غلام بننا چاہئے جس طرح غلام ہونے کا حق ہے۔

ہمارے مذہب میں توحید و نبوت و امامت کے لئے شرائط و حدود ہیں۔ جس میں خدائی صفات موجود ہوں جو ہونی چاہئیں وہ صفات ثبوتیہ ہیں اور جو نہ ہونی چاہئیں وہ صفات سلبیہ ہیں۔ اسی طرح نبی بھی ہر دعویدار کو ہم نہیں مانتے بلکہ اس کے لئے شرائط ہیں اور اوصاف ہیں۔

ایک شرط یہ ہے کہ معصوم ہو۔ ہم غیر معصوم کو قطعاً نبی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

شیعوں کے نزدیک ایک اہم شرط ہے کہ نبی کافرزادہ نہ ہو نہ اس کا باپ کافر ہو اور نہ ماں کافرہ ہو۔ اگر کافر زادہ ہوگا تو نبی نہیں ہوگا۔ اور اگر نبی ہے تو کافر زادہ نہ ہوگا۔

نبی کی اپنی امت کو والدین کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور اگر خود اس کے اپنے ماں باپ کافر ہوں۔ پس اگر ان کی اطاعت نہ کرے۔ تو لوگوں کو ماں باپ کی

اطاعت کا حکم نہیں دے سکتا۔ اور اگر خود ان کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اعلان نبوت کے خلاف ہیں۔ کیسے ان کی اطاعت کرے گا؟

ہمارا جاہل اور نادان بچہ بھی دودھ کو نجس برتن میں ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا کیونکہ اسے پتہ ہے کہ دودھ اللہ کی نعمت اور اس کی رحمت ہے۔ اگرچہ بازاری قیمت کے لحاظ سے ایک روپے کا ہے تو جب ہمارا جاہل بچہ اللہ کی ایک روپیہ کی قیمتی نعمت اور رحمت کو نجس برتن میں ڈالنا نعمت کی توہین سمجھتا ہے تو خالق کائنات نے نور محمدی کو جس کے سر پر انبیاء کی سلطانی کا تاج ہے۔ نجس رحموں یا نجس صلبوں میں کیسے رکھا؟

ہم میں سے کوئی آدمی جب قرآن بازار سے خریدنے کے لئے جاتا ہے تو پہلے گھر میں دیکھتا ہے کہ قرآن کے شایان شان کوئی اس کے رکھنے کی جگہ بھی ہے اگر گھر میں جگہ نہیں ہے تو اس کی جگہ بنائے گا پھر قرآن کو لائے گا۔ جب اس صامت قرآن کو ناموزوں مقام پر رکھنا۔ ایک عام آدمی برداشت نہیں کرسکتا تو خالق کائنات نے مناسب صلب اور مناسب رحم کی تخلیق کے بغیر نور محمدی کو (جس نے عالم کو پاک کرنا تھا) کیسے خلق فرما دیا؟

جس طرح نبوت کے لئے شرائط ہیں اسی طرح ہمارے نزدیک امامت میں شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ پس جس طرح کسی کافر کا بیٹا نبی نہیں ہوسکتا اسی طرح کسی کافر کا بیٹا نبی کا قائم مقام اور اس کا مسند نشین بھی نہیں ہوسکتا۔ پس حضرت علیؑ کی تمام مائیں فاطمہؑ بنت اسد سے لے کر حوا تک اور تمام آباء حضرت ابو طالب سے لے کر آدمؑ تک پاک تھے۔

تو شیعہ ہونے کے لئے بھی اوصاف ہیں۔ کچھ ثبوتیہ اور کچھ سلبیہ۔ یعنی

مومن کے صفات جو بیان کئے گئے ہیں اس میں ہونے چاہئیں۔ اور وہ صفات جو مومن کی شان سے بعد ہیں ان سے اس کو پرہیز کرنا چاہئے تاکہ روز محشر اگر ہم خوش ہو کر کہیں کہ علیؑ ہمارا امام ہے۔ تو علیؑ بھی بسم اللہ کر کے کہے یہ میرا غلام ہے۔

دیکھئے کربلا کے مجاہدین نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ شیعہ کیسے ہونا چاہئے؟ پس تھوڑے تھے لیکن یزیدیت کے ایک بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے خود کٹ گئے لیکن راہ حق سے کوئی طاقت انہیں ایک انچ بھی ہٹا نہ سکی۔ آخر کار یزیدیت کا آسمان بوس قلعہ دھڑام سے گرا اور پاش پاش ہوا اور حسینیت کا پرچم آج تک بلند ہے اور بلند رہے گا عزدارو حسینؑ نمازیوں کا امام ہے۔

دیکھئے آپ ہر شیعہ کا احترام کرتے ہیں۔ حسینؑ کے جوان فرزند نے بھی ایک شبیہ چھوڑی ہے اور وہ ہے اذان۔ تو اس مسجد میں ہونے والی اذان کو علیؑ اکبر کی اذان کی صدائے بازگشت سمجھ کر لبیک کر لیا کرو۔ تاکہ شہزادہ علیؑ کی روح تم پر راضی ہو اور جس کے حق میں علی اکبرؑ نے سفارش کر دی۔ وہ یقیناً جنتی ہے۔

آیئے دیکھئے حسینؑ کے کم سن نو عمر بچے بھی نماز کو قضا نہیں ہونے دیتے تھے۔

امیر مسلم کے دو کم سن فرزندوں کا حال آپ ہمیشہ سنتے رہتے ہیں کہ انہوں نے آخر میں بھی دو رکعت نماز ادا کرنے کی قاتل سے درخواست کی تھی۔ ایک سال برابر قید میں رہے۔ قید سے آزاد ہوئے تو کوفہ سے باہر رات کو نکل نہ سکے۔ پس ایک درخت پر چڑھ گئے۔ حارث کی کنیز پانی بھرنے کے لئے آئی تو دو نورانی پرتو پانی میں دیکھ کر اوپر نگاہ کی تو وہ ہاشمی چاند نظر آئے۔ پوچھا کون ہو؟ بتایا ہم امیر مسلم کے دو یتیم ہیں اور ابن زیاد کے ظلم کے ڈر سے درخت پر چھپ کر بیٹھے ہیں۔

رات ہو گئی تو شہر سے نکل جائیں گے اس نے عرض کی کہ میرے گھر کی ملکہ مومنہ ہے آؤ تمہیں اس کے پاس لے چلوں۔ وہ تمہاری خدمت کرے گی۔ چنانچہ درخت سے اترے اور اس کے ہمراہ مومنہ کے گھر وارد ہوئے۔

امیر مسلم کے فرزند سمجھ کر مومنہ نے بہت عزت کی۔ کھانا پیش کیا اور رات کو الگ کمرہ میں ان کو جگہ دی۔ بچے سو گئے آدھ رات ڈھلے حارث گھر میں آیا جو تھکے ہوئے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ مومنہ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ کہنے لگا کہ امیر مسلم کے دو فرزند ابن زیاد کی قید سے بھاگ گئے ہیں اور بہت زیادہ انعام ان کی گرفتاری پر مقرر ہوا ہے سارا دن مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن کہیں ان کا نشان نہ ملا۔ اس لئے تھکا ہوا ہوں۔ فوراً مجھے کھانا دو تا کہ کچھ آرام کر کے پھر ان کی تلاش میں نکلوں۔ مومنہ عورت نے منتیں کیں کہ اولاد رسول کی دشمنی سے باز آ جاؤ۔ لیکن جھڑک دے کر اس کو خاموش کر دیا۔

روٹی کھا کر سویا ہی تھا کہ دوسرے کمرے سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ شہزادوں نے عالم خواب میں رسول اللہؐ کی زیارت کی جب کہ وہ حضرت امیر مسلم سے کہہ رہے تھے کہ تم اپنے بچوں کو نرغہ اعداء میں چھوڑ کر آ گئے ہو۔ پس بچوں نے یہ خواب دیکھ کر ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر رونا شروع کیا تو حارث نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ مومنہ نے جواب دیا۔ کسی ہمسایہ کے بچے ہوں گے یہ کہنے لگا اگر ہمسایہ کے ہوتے تو ان کو کوئی تسلی دینے والا ہوتا۔ ماں پیار کرتی۔ باپ محبت کرتا۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی لاوارث بچے ہوں۔ جن کو دلاسہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ پس اٹھا اور اس قریبی کمرے میں داخل ہوا۔ پس دیواریں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا گیا اچانک اس کے ہاتھ شہزادوں کے سروں

پر پڑے۔.............. ہائے اس ظالم نے کیا سلوک کیا ہو گا؟

پوچھا کون ہو؟ بچوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ تیرے مہمان ہیں۔ سید زادے ہیں۔ امیر مسلم کے یتیم ہیں۔ پس بچوں کی زلفوں میں ہاتھ ڈالا اور کھینچا تو دونوں یتیموں کے قدم زمین سے بلند ہو گئے۔ یہ ظالم کہنے لگا۔ میں سارا دن تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں اور مجھے پتہ نہ تھا کہ تم میرے ہی گھر میں موجود ہو۔

پس ان کو بقول مشہور:

ایک ستون سے باندھ دیا اور خود ساری رات سوتا رہا۔ بچے کراہتے رہے' روتے رہے' بلبلاتے رہے۔ صبح سویرے ان کو قتل کرنے کے لئے لے چلا پہلے اپنی بیوی بیٹے کو قتل کیا اور دریا کے کنارے پر لے آیا۔ کہا قمیصیں اتارو۔ بچوں نے معذرت کی تو اس نے ظلم کیا۔ بچے رو رو کر چپ ہو گئے۔

ایک قول کے مطابق:

یتیموں نے کہا اگر تو طمع زر و دولت کے لئے ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے تو بازار میں جا کر ہمیں فروخت کر دے اس لئے کہ ہم یوسفؑ سے حسن میں کم نہیں۔ انعام سے بدرجہا زیادہ تجھے پیسہ ملے گا۔ لیکن اس ظالم نے ایک نہ سنی آخر کار ایک کو قتل کیا۔ لاش پانی میں رک گئی پھر دوسرے کو قتل کیا اور دریا میں ڈالا دونوں بھائیوں کی لاشیں اکٹھی ہو گئیں۔ خدا جانے سیتب کیسے پہنچیں حالانکہ دریا کا پانی ادھر سے ہی آتا ہے۔

بہر کیف دربار ابن زیاد میں دونوں سروں کو لایا گیا جو کہ خون میں غلطان تھے۔ تخت پر سروں کو رکھا۔ ابن زیاد نے پوچھا: کیا ہے؟ میں نے ان کے زندہ گرفتار

کرنے کا حکم دیا تھا تو نے ان کو قتل کیوں کیا ہے؟ پس حکم دیا کہ اس کو اسی جگہ لے جا کر قتل کر دو جہاں اس نے بچوں کو ذبح کیا ہے۔ ایک مومن کو موقع ملا۔ اس نے اس کو وہیں لے جا کر قتل کیا اور لاش کو دریا میں پھینکا۔ لیکن دریا نے اس لاش کو قبول نہ کیا۔ پیش لکڑیوں کا انبار لگا کر اس کو اوپر رکھا اور اس کے نجس مردے کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

ایک قول کے مطابق:

ابن زیاد نے حکم دیا کہ کوئی ان سروں کو دھو کر لے آئے۔ چنانچہ ایک مومن نے ان دونوں سروں کو جھولی میں لیا اور گھر لایا۔ زوجہ نے کہا گوشت لانا تھا تو الگ کپڑے لے جاتا۔ اس قمیض کو نجس کیوں کر دیا؟ کہنے لگا اس خون کو تو نہیں سمجھتی۔ عام گوشت نہیں امیر مسلم کے دو یتیموں کے سر ہیں۔ دھونے کے لئے مانگ کر لایا ہوں۔

پس مومنہ نے طشت میں رکھے اور اوپر پانی ڈالا۔ مدت کے گرد آلود بال تھے۔ پھر خاک وخون میں لت پت تھے۔ طشت کا سارا پانی لال ہو گیا۔ دھو بھی رہی تھی اور بارگاہ بتول میں رو رو کر عرض بھی کر رہی تھی۔ حسینؑ کی اماں اس کنیز پر ناراض نہ ہونا کہ تیرے دو یتیموں کے خون میں آج میرے بھی ہاتھ رنگین ہیں۔ لیکن آپ کی خوشنودی کے لئے ان کو نہلا رہی ہوں۔ پس دھو کر سروں کو طشت میں رکھا۔ بالوں پر کنگھی دی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور چاند سے چہروں کو دیکھ کر ماتم کیا۔

ہائے تمہاری ماں دیکھتی تو اس کا کیا حال ہوتا۔ پس اوپر رومال ڈال دیا اور وہ مومن اٹھا کر دوبارہ ابن زیاد کے دربار میں حاضر ہوا۔

جب سروں کو تخت پر رکھا گیا تو ابن زیاد ملعون اگرچہ بہت سنگ دل تھا لیکن تڑپا اور کئی بار اٹھا اور بیٹھا اور کہنے لگا جب پہلی دفعہ میں نے ان کے چہرے دیکھے تھے تو بالکل بے داغ تھے لیکن آج دیکھ رہا ہوں سیاہ داغ موجود ہیں۔ ممکن ہے شہیدوں کے گلوئے بریدہ سے آواز آئی ہو............ ظالم ہمارا قاتل ساری رات ہمیں ستون سے باندھ کر طمانچے مارتا رہا۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن

پندرہویں مجلس

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

کیا برابر ہیں وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔

اللہ نے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر فیصلہ طلب کیا ہے کہ کیا تمہاری عقلیں یہ فیصلہ کرسکتی ہیں کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے سب ایک جیسے ہیں؟ یقیناً تمہارا ضمیر اور تمہاری عقل اس برابری کے قائل نہ ہوں گے۔ کیا دھوپ اور سایہ برابر ہیں؟ کیا ظلمت و نور برابر ہیں؟ کیا غم و خوشی برابر ہیں؟

جس طرح یہ برابر نہیں۔

حلال و حرام برابر نہیں۔

خبیث و طیب برابر نہیں۔

اور عالم و جاہل برابر نہیں۔

برابری کا قائل وہی ہوسکتا ہے جس میں عقل نہ ہو۔ کیونکہ اگر ہر شے کے افراد برابر ہوتے تو عقل کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

ہم نیک و بد، مومن و منافق، اور مسلم و کافر کو برابر نہیں سمجھتے پس مومن سے

محبت اور منافق سے نفرت فطری امر ہے۔ اور اسی کی دوسری تعبیر ہے۔ تولّی و تبرّی یعنی نیک سے محبت اور بد سے نفرت۔

پیغمبرؐ کے بعد سارے صحابی برابر نہیں۔ کیونکہ سب صحابہ نے وقتاً فوقتاً علیؑ سے مسائل دریافت کئے اور کسی بڑی یا چھوٹی کتاب میں کسی قوی یا ضعیف راوی نے نقل نہیں کیا کہ کبھی علیؑ نے بھی کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا ہو۔ پس ان کا علیؑ کی طرف رجوع کرنا اور علیؑ کسی کی طرف رجوع نہ کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے۔ کہ وہ سب برابر نہیں تھے بلکہ علیؑ عالم قرآن تھے اور مرجع خلائق تھے۔ اور عالم و جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔

شارح نہج البلاغہ سے (علی مانقل عنہ) خطبہ میں عجیب فقرہ کہا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ قَدَّمَ الْمَفْضُوْلَ عَلَی الْفَاضِلِ۔

منزہ ہے جملہ عیوب سے وہ اللہ جس نے فاضل پر مفضول کو ترجیح دی۔ وہ اپنی تجویز کردہ خلافت کے صحیح ہونے پر اللہ کو بھی اپنے ساتھ شامل کر رہا ہے اور اللہ کے عیوب کی نفی میں مفضول کی فاضل پر ترجیح کا ذکر کیا (اس احمق کو یہ نہ سوجھی کہ مفضول کو فاضل پر ترجیح دینا کتنا بڑا عیب ہے۔)

اس کے بعد علیؑ کے فاضل ہونے پر اس نے استدلال بھی کیا کہ صفات متضادہ تو انسان میں جمع نہیں ہوسکتیں اور صفات کمال میں سے بعض متضاد ہیں جو نہیں ہوسکتیں جیسے شجاعت اور رحم۔ لیکن

علیؑ وہ ذات ہے جو صفات متضاد کا جامع ہے کہ مثلاً رحیم بھی ہے اور شجاع بھی ہے یعنی رحم دل بھی ہے اور سخت دل بھی ہے، حالانکہ دل ایک ہے۔ یا سخت ہوتا ہے یا نرم اور اللہ کا جبار قہار اور ستار و غفار ہونا اپنے مقام پر ہے کہ وہ دل نہیں رکھتا

اب علیؑ کا ان صفات متضادہ کا جامع ہونا' اس کا یہ مطلب ہے کہ علیؑ عام انسانوں سے بلند تر اور مظہر ذات پروردگار ہے مصلائے عبادت پر علیؑ سے زیادہ نرم دل نظر نہیں آتا۔(اور میدان میں علیؑ سے بڑا بہادر کوئی نہیں)

صرف لیلتہ الھریر میں ایک طرف ایک ہزار دشمنانِ دین بھی قتل کئے اور مصلائے عبادت پر ایک ہزار رکعت نماز بھی ادا فرمائی۔

اس قدر ذکر کرنے کے باوجود پھر مفضول کو فاضل پر ترجیح دینا اس کو نصیب ہو اور یہ ترجیح خدا نے نہیں دی۔ کیونکہ یہ ظلم ہے اور اللہ ظلم سے پاک ہے۔ بلکہ یہ ترجیح ان لوگوں نے دی جن کی نگاہوں میں ظلم و عدل یکساں ہیں۔ ہم شیعہ لوگ مفضول کو ترجیح دینا تو درکنار' مفضول کو فاضل کے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔

مجھ سے ایک فاضل غیر شیعہ نے سوال کیا تھا۔ کہ تمہارے نزدیک خلافت کا معیار کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ فاضل ہونا پس ایک مولوی کی زبان سے نکلا اگر فاضل ہونا معیار خلافت ہے تو ہم جیت گئے اور تم ہار گئے کیونکہ پیغمبرؐ کے بعد تمام امت سے فاضل وہ تھا جس کو ہم نے خلیفہ مانا ہے اور اس کے فاضل ہونے کی دلیل پیغمبر کا یہ فرمان ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ شخص ہوتا۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ یہ حدیث تو حضرت عمر کے متعلق ہے لیکن وہ مصر رہا کہ حضرت ابوبکر کو حضورؐ نے فرمایا تھا ان کا جھگڑا بڑھا تو میں نے کہا۔ فضول جھگڑ رہے ہو۔ میرے نزدیک وہ دونوں ایک جیسے تھے۔ خواہ یہ پیش گوئی اول کے حق میں ہو یا ثانی کے حق میں سہو۔

میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے نزدیک نبوت کا معیار

کیا ہے۔؟

تو انہوں نے کہا آپ ہی بتا دیں۔ تو میں نے کہا شیعہ مذہب میں نبوت کا معیار کم از کم یہ ہے کہ زندگی کے کسی حصہ میں ایک لحہ کے لئے بھی مشرک نہ رہا ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ اس معیار کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں۔

تو میں نے پھر سوال کیا کہ اس معیار نبوت کا خود حضرت پیغمبر کو علم تھا یا نہ تھا؟ اگر نہ تھا تو خود نبی کیسے بن گئے؟ جن کو معیار نبوت کا بھی پتہ نہ ہو اور اگر آپ کو اس معیار کا پتہ تھا تو کسی ایسے شخص کے متعلق نبوت کی پیش گوئی کیسے دے سکتے ہیں؟ جو چالیس سال تک مشرک رہا ہو۔ لہٰذا آپ کی بیان کردہ حدیث خواہ اول کے حق میں ہو یا ثانی کے حق میں ہو۔ غلط ہے اور جھوٹ ہے۔ اور پیغمبرؐ کی طرف ایسی حدیث کی نسبت دینا' پیغمبرؐ کی ناقدر شناسی ہے۔ اس کا ان کے پاس جواب کوئی نہ تھا۔

پھر مجھ سے سوال کیا گیا کہ مذہب شیعہ کے حق ہونے کی آپ کے پاس دلیل کیا ہے؟

میں نے کہا توحید و نبوت و عقیدۂ قیامت وغیرہ میں تو ہمارا اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف مسئلہ خلافت میں اختلاف ہے؟ لہٰذا اب میں سوال کرتا ہوں کہ مذہب یقین کا نام ہے یا شک کا نام ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مذہب یقین کا نام ہے ۔ تو میں نے کہا: بلا فصل کے شیعہ قائل ہیں شیعوں کو سو فیصد یقین ہے۔ یقین وہ ہے جس پر انسان بلا دریغ قسم کھا سکے۔ ہمارا ادنیٰ سے اعلیٰ تک' جاہل سے عالم تک' ہر صغیر و کبیر' ہر جگہ' ہر گھر پر برملا قرآن اٹھا کر قسم کھا سکتا ہے کہ علیؑ امام حق ہے لیکن یہ قسم تم لوگ نہیں اٹھا سکتے اس لئے کہ یقین وہ ہے جو دو طرفہ ہو اور وہ صرف شیعوں کے پاس ہے۔

اس نے کہا کہ ہمارا بھی یقین ہے کہ جس کی خلافت کے ہم قائل ہیں وہ برحق تھا میں نے کہا اپنے نفس کو دھوکے میں نہیں ڈالا جا سکتا' میں سادہ کاغذ کو جیب میں رکھ کر ہزاروں کو قائل کر سکتا ہوں کہ میری جیب میں ایک سو کا نوٹ ہے لیکن ہزاروں کو قائل کرنے کے باوجود اپنے نفس کو قائل نہیں کر سکتا کہ یہ سو کا نوٹ ہے بلکہ مجھے میرا ضمیر بھی ملامت کرتا رہے گا کہ جھوٹ ہے' فریب ہے' دھوکا ہے۔

میں نے کہا اگر ایک شخص کے متعلق سارے شہر والے حلفیہ بیان دے کر کہیں کہ یہ چور نہیں ہے لیکن وہ خود پولیس کے سامنے چوری کا اعتراف کر لے تو ان لوگوں کے یقین و حلف کا کیا مقام رہے گا؟ میں ایک شخص کے متعلق کہوں کہ وہ سید ہے لیکن وہ خود انکار کر دے تو میرے یقین کی کیا قیمت ہو گی؟

دیکھئے ہمیں یقین ہے کہ اللہ ایک ہے اور ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ اور یہ یقین دو طرفہ ہے کیونکہ اللہ نے بار بار اعلان فرمایا ہے کہ میں ایک ہوں۔ اسی طرح ہمارا یقین محمد رسول اللہ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہے۔ وہ خود بھی اپنی رسالت کا بار بار حلفیہ اعلان فرما چکے ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ علی محمد مصطفٰے کے برحق جانشین ہیں علیؑ بیان دے چکے ہیں کہ میں ان کا برحق جانشین ہوں ۔ چنانچہ منبر پر آتے ہی فرمایا:

اَلاٰنَ رَجَعَ الْحَقُ اِلٰی محلہ۔

کہ اب حق اپنے مقام پر پلٹ کر آ گیا۔ یعنی محمد حق تھے اور اب میں آ گیا ہوں تو گویا حق پلٹ کر دوبارہ اپنے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ پس ہمارا یقین اور ہمارا حلف دو طرفہ ہے۔

لیکن اپنے خلیفہ کے متعلق اگر آپ حلف اٹھا بھی لیں کہ وہ برحق جانشین

پیغمبرؐ تھے تو بھی وہ خود قطعاً حلف نہیں اٹھا سکتے کہ میں ان کا برحق جانشین ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خلافت کے پہلے دن بھی اپنی نا اہلیت کا اعلان فرمایا کہ میں خود اس کے اہل نہیں ہوں تم لوگوں نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے اگر مجھ سے غلطی سرزد ہو تو وہ شیطان کی طرف سے ہو گی۔ پس مجھے سیدھا کر لینا اور زندگی کے آخری دن بھی عبد الرحمٰن بن عوف کے سامنے اعتراف کیا کہ کاش میں رسول اللہ سے پوچھ لیتا کہ اس مقام کا اہل کون ہے؟ پس جس کو نہ پہلے دن یقین ہے اور نہ اڑھائی سال کے بعد آخری دن یقین ہے تو آپ لوگوں کو چودہ سو سال کے گذرنے کے بعد کس نے یقین دلا دیا کہ وہ برحق جانشین پیغمبرؐ تھا اور اس یک طرفہ یقین کی قیمت کیا ہو گی؟

دیکھئے جس شخص (عمر) نے پہلے دن اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اس نے اپنے دور خلافت میں برسر منبر کہا تھا۔

اِنَّ بَیْعَةَ اَبِی بَکْرٍ کَانَتْ فَلْتَةً وَقَی اللّٰهُ شَرَّهَا.

یعنی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت غیر آئینی تھی۔ (فراڈ) تھا۔ جس کے انجام بد سے اللہ نے بچالیا۔ خبردار............اس قسم کی غلطی کو پھر نہ دہرایا جائے۔ (یعنی ہم غلط اور ناجائز خلیفہ بنالیں تو گرفت سے بالاتر ہیں اور کوئی دوسرا آدمی ایسا قدم اٹھائے تو وہ قابل گرفت ہو گا۔ اب دیکھئے کہ جس نے اس کو خلیفہ بنایا تھا جب اس کو یقین نہیں بلکہ اس کے حق نہ ہونے کا یقین تھا تو آپ کو سینکڑوں برس کے بعد اس کے برحق ہونے کا یقین کیسے ہو گیا۔؟

پس ہم سب کے برابر ہونے کے قائل نہیں۔ بلکہ علیؑ برحق جانشین پیغمبرؐ ہے۔ اور آنے والا وقت بتائے گا جب ادھر پردۂ غیب اٹھا کر پیغمبرؐ کا آخری

جانشین آئے اور ادھر سابق انبیاء میں آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام چرخ چہارم سے اتریں گے۔ وہ بتول مریم علیہ السلام کا بیٹا اور یہ بتول زہراؑ کا فرزند۔ پس صحن بیت اللہ میں اکٹھے ہوں گے تو مہدیؑ کہیں گے اے چچا عیسیٰ علیہ السلام! نماز پڑھاؤ۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام معذرت پیش کریں گے اور جرأت نہ کریں گے۔

پس جب محمد رسول اللہ کے مصلے پر کھڑے ہونے کی ایک نبیؑ جرأت نہیں کرسکتا تو اس مقام پر کوئی دوسرا خاکی آدمی کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟ اور جب عیسیٰ علیہ السلام محمدؐ کے آخری وصی کو نماز نہیں پڑھا سکتے تو کوئی خاکی محمد کے بلافصل وصی علیؑ کو نماز کیسے پڑھا سکتا ہے؟

اگر عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے سابق کے تمام نبی ہوتے تو سب عیسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں نماز ادا کرتے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھیں گے حضرت مہدیؑ کے پیچھے اور حضرت مہدیؑ نماز پڑھیں گے حسن عسکری کے پیچھے اور یہ سلسلہ بڑھتا ہوا حسن وحسین تک پہنچے گا تو وہ نماز پڑھیں گے علیؑ کے پیچھے۔ اب مڑ کر دیکھئے تو علی کے پیچھے سابقہ کی کل نبوتیں اور آنے والی کل امامتیں موجود ہیں لہٰذا علیؑ اگر اقتداء کرے گا تو محمد مصطفےٰؐ کی کرے گا۔

ہمارے ہاں ایک غریب آدمی شیعہ ہوا تو لوگوں نے بائیکاٹ کر دیا۔ پس مولویوں کو لائے کہ اس کو واپس راہ راست پر لاؤ۔ چنانچہ جب لوگ اکٹھے ہوئے تو مولویوں نے زور دیا کہ بھائی تم توبہ کرلو۔ اس نے کہا کس سے توبہ کروں؟ انہوں نے کہا مذہب شیعہ سے۔ اس نے کہا۔ مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو کہ اللہ نے جو فرمایا ہے: کہ قیامت کے دن ہر آدمی اپنے امام کے ساتھ محشور ہوگا۔ تو اس کا جواب شیعہ تو یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمارے گیارہ اماموں کا بھی امام علیؑ ہے اور علی

" کا امام نبی ہے۔ لہٰذا یہ سب تو نبی کے پیچھے ہوں گے۔ لیکن مذہب اہل سنت کے چار فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے امام کے ساتھ اٹھے گا لیکن یہ بتاؤ کہ ان چار اماموں کا امام کون ہے؟ جس کے پیچھے یہ امام اٹھیں گے؟ اس لئے کہ پیغمبرؐ کے زمانہ سے ان کے زمانہ تک کافی فاصلہ ہے؟ اس کا ان کے پاس جواب نہ تھا لہٰذا شرمندہ ہو کر اٹھ کر چلے گئے اور کہہ گئے کہ اس کے ساتھ بات کرنا گناہ ہے کیونکہ یہ نہیں مانتا۔

ہم لوگ صحابہ کے قائل ہیں اور صحابہ کا بھی احترام کرتے ہیں لیکن سب کو برابر نہیں سمجھتے۔ ہم صرف ان لوگوں کا احترام کرتے ہیں۔ جو آل محمد کا احترام کرتے ہیں اور جن کے دلوں میں آل محمد کا احترام نہیں۔ ہمارے دلوں میں ان کا احترام نہیں اور اگر آل محمد کا احترام نہ کرنا ان کا قابل معافی جرم ہے تو ان کا احترام نہ کرنا ہمارے لئے قابل معافی کیوں نہیں؟

نظام الدین اولیاء دلی والے سے کسی مرید نے کہا: تم بھی ولی ہو اور علی بھی ولی ہے تو فرق کیا رہا؟ اس نے جواب دیا کہ تم جس شہر میں رہتے ہو دیا۔ غذا اس کے والی کی بھی گندم اور تمہاری بھی گندم۔ پس نظام الدین اولیاء نے کہا پھر تم میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ جبکہ غذا دونوں کی ایک ہے؟ مرید نے جواب دیا بڑا فرق ہے کہ جو گندم اس کی غذا ہے وہ اس کی ذاتی جاگیر سے ہے اور جو گندم ہماری غذا ہے وہ اس کے دراوزہ سے گدا کردہ ہے پس نظام الدین اولیاء نے فوراً کہا: یہی فرق ہماری اور علیؑ کی ولایت میں ہے کہ علیؑ کی ولایت علیؑ کی ذاتی جاگیر ہے جو ان کو اللہ نے عطا فرمائی۔ اور ہماری ولایت اسی کے درفیض سے گدا کردہ ہے۔

صحابہ بھی جنتی اور علیؑ بھی جنتی۔ لیکن علیؑ جنت کا مالک ہے اور صحابہ جنت میں وہی جائیں گو جن کے خود علیؑ بھیجے گا۔ اسی طرح صحابہ کوثر پئیں گے۔ لیکن وہ جن

کو علیؑ دے گا۔ وہ پینے والے اور علیؑ پلانے والا۔ لہٰذا جب داتا موجود ہے تو گداگر اس سے گدا کرتا ہے۔

ہم محمد مصطفےٰ کی آل کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے جو ان کا غلام ہم اس کے غلام ہیں۔

اپنی اولاد کے قاتل کو معاف کر سکتے ہیں لیکن محمد کی اولاد کے قاتلوں کو نہ ہمارے بزرگوں نے معاف کیا اور نہ آج ہم معاف کرتے ہیں اور نہ قیامت تک ہماری نسلیں معاف کریں گے۔

ہمارے پاس کیا بچا؟ جب ہماری مخدوم زادیاں قید ہوگئیں۔ کہتے ہیں کہ اونٹوں میں ایک خاکستری رنگ کا اونٹ تھا جو اپنی بولی میں کچھ کہتا تھا اور سارے اونٹ روتے تھے۔ جب فضہ نے یہ ماجرا ذکر کیا تو بی بی نے فرمایا: گرچہ نانا کی امت نے ہماری قدر نہیں کی لیکن یہ اونٹ جانتے ہیں کہ ہم رسول زادیاں ہیں۔ پس وہ اونٹ دوسروں سے بیان کرتا ہے۔ کہ خبردار.......... تمہارے اوپر حسین کی بہنیں' بیٹیاں سوار ہیں۔ تیزی سے قدم نہ اٹھانا۔ تاکہ بیبیوں کو تکلیف نہ ہو۔ پس وہ سارے سن کر رو رہے ہیں۔ لیکن ہائے افسوس.............. وہ ظالم تازیانے مار مار کر اونٹوں کو تیز دوڑاتے تھے کہ بچے گرتے جاتے تھے اور بیبیاں فریاد کرتی رہتی تھیں۔ لیکن کوئی سنتا نہ تھا چنانچہ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کافی بچوں کی قبریں راستہ میں بن گئیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیبیاں ان کو پکڑتی کیوں نہ تھیں۔ تو عزادارو! پکڑا جاتا ہے ہاتھوں سے اور بیبیوں کے ہاتھ پس گردن رسن بستہ تھے۔

راستہ میں ظالموں نے دوپہر کے وقت ایک ٹھنڈی جگہ پر درختوں کے جھنڈ میں آرام کیا اور قیدیوں کو ایک ٹیلے پر قیام کرنے کا حکم دیا تو حضرت سجاد علیہ

السلام کے زنجیر جب گرم ہوئے تو اٹھ کر ایک خیمہ کے سائے میں ستانے کے لئے آ بیٹھے کڑی پر کڑی جو لگی تو سردار خیمہ حسین بن نمیر نے نوکر سے کہا اس قیدی سے کہو یہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ کسی قیدی کا ہمارے خیمہ کے سائے میں بیٹھنا ہماری توہین ہے۔

اس نوکر نے کہا تو حضرت سجادؑ نے فرمایا: میرے زنجیر گرم ہو گئے ہیں ٹھنڈا ہونے پر چلا جاؤں گا۔ آخر کار وہ کمینہ ظلم کا تازیانہ لے کر نکلا اور کہا کہ خود اٹھو گے یا میں اٹھاؤں۔ پس شاید ادھر سے سکینہ خاتون نے دیکھا ہو گا تو گڑگڑا کر عرض کی ہو گی بھائی سجاد! یہ شخص ظالم ہے۔ آپ ادھر آ جائیں میں خود سورج کے آگے کھڑے ہو کر تیرے اوپر سایہ کر لوں گی۔

زندانِ شام میں ایک قول کے مطابق:

بی بی زینت خاتون نے محسوس کیا کہ کسی نے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ پوچھا کون ہو؟ تو خاموشی چھا گئی۔ اس وقت رات ڈھل چکی تھی اور زندان میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھر بی بی سو گئیں تو دوبارہ ہاتھ سر پر آیا۔ پوچھا کون ہو؟ تو پھر خاموشی رہی جب تیسری دفعہ ہاتھ آیا تو بی بی اٹھ بیٹھیں اور فرمایا کون ہو؟ میرے سر پر بار بار ہاتھ لگانے والے اس وقت دھیمے دھیمے لہجے سے گریہ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

پھوپھی جان!

ناراض نہ ہونا۔ میں آپ کے مظلوم بھائی حسین کی یتیم بچی ہوں۔ بی بی نے فرمایا: تجھے نیند کیوں نہیں آتی۔ حالانکہ تیری عمر کے بچے تو سر شام سو جایا کرتے ہیں؟ بتاؤ کیا مانگتی ہو؟ پس رو رو کر بچی نے عرض کیا۔ اگر مل سکے تو بابا کا سینہ مانگتی ہوں

پس ایک ایک بی بی نے باری باری اٹھایا لیکن بچی نے رونا بند نہ کیا تو سجادؑ نے فرمایا:

اسے میرے سینہ پر سلا دو۔ شاید بابا کا سینہ سمجھ کر خاموش ہو جائے۔

چنانچہ سجادؑ زمین پر لیٹے اور بچی کو اوپر سلایا گیا۔ کچھ دیر تک تو بچی خاموش رہیں لیکن پھر اٹھ بیٹھیں اور حضرت سجاد کی داڑھی میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پس رو کر عرض کی بھائی جان! آپ تو میرے بھائی سجاد ہیں۔ آپ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ میرے بابا حسین کہاں گئے۔

چنانچہ دن رات رونے والی بچی کی رپورٹ ہوئی کہ وہ ہر وقت روتی ہے تو یزید نے طشت طلا میں حسین کا سر رکھ کر اوپر رومال ڈالا اور اس بچی کے سامنے طشت میں رکھ کر پوچھا گیا۔ بی بی بتاؤ اس سر والے کو پہچانتی ہو؟ جب بچی نے دیکھا کہ یہ تو میرے بابا کا سر ہے۔ فوراً سر کے اوپر منہ رکھ لیا اور کہا بابا جان!

مجھے ظالموں میں چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے؟ اور آپ کی ان نازنین رگوں کو کس ظالم نے تیغ جفا سے کاٹا؟ کس نے تیری ریش اقدس کو خون سے رنگین کیا؟ ہائے اس کو میری کمسنی پر رحم نہ آیا۔ ہائے اس کو میری یتیمی پر ترس نہ آیا۔ اس نے اس قدر رونا شروع کر دیا کہ ہچکی بندھ گئی جب کچھ دیر کے بعد ہچکی رکی اور رونے کی آواز بند ہوئی تو نبض پر ہاتھ رکھا گیا بچی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

سولہویں مجلس

حُبُّ عَلِيٍّ يَأْكُلُ الذُّنُوْبَ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ.

"علی کی محبت گناہوں کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جایا کرتی ہے۔"

ہر شئی کے چار وجود ہوا کرتے ہیں اور ان میں سے صرف ایک کارآمد ہوتا ہے۔ (وجود حقیقی، وجودِ ذہنی، وجود ملفوظی اور وجودِ مکتوبی) مثلاً ایک ہے پانی کا وجود حقیقی جو دریا میں ہے، کنویں میں ہے یا گلاس میں ہے۔ دوسرا اس کا وجود ہے جو ہم ذہن میں تصور کرتے ہیں۔ یہ وجود ذہنی ہے اور تیسرا ہم منہ سے بولتے ہیں۔ پ' ا' ن' ی یہ وجود ملفوظی ہے۔ اور چوتھا جو ہم کاغذ پر لکھتے ہیں۔ پانی یہ اس کا وجودِ مکتوبی ہے۔ اگر کسی کو پیاس لگے تو نہ وجود ذہنی اس کو ختم کرے گا۔ ہزار بار پانی کا تصور کیجئے پیاس نہ بجھے گی بلکہ الٹا بڑھے گی۔ اسی طرح ہزار دفعہ منہ سے پانی پانی کہتے رہو' پیاس ویسے کی ویسے رہے گی' اور کاغذ پر ہزار ہا بار لکھو پانی پانی پیاس نہ بجھے گی بلکہ پیاس کو ختم کرے گا تو پہلا وجود یعنی خود پانی' جو پانی کا حقیقی وجود ہے۔

علیؑ وہ ذات شریف ہے جس کے چاروں وجود کارآمد ہیں۔ اس کا وجود حقیقی جو حضرت محمد مصطفیٰ کا قائم مقام ہے۔ ان کے باقی ہر سہ وجود بھی بے کار نہیں۔

علیؑ کا تصور کرنا اور ان کی محبت کا دل میں رکھنا عبادت (وجود ذہنی)

علیؑ کا زبان سے ذکر کرنا عبادت اور زبان کے گناہ معاف (وجود ملفوظی)

علیؑ کا نام لکھنا اور اس کے فضائل کو قلمبند کرنا' عبادت اور ہاتھ کے گناہ معاف (وجودِ مکتوبی)

علیؑ کی محبت گناہوں ایسے کھاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے

اس کی تشبیہہ بتاتی ہے کہ جس طرح آگ کے وجود سے پہلے لکڑیوں کا انبار لگا ہو تو جب آگ آئے گی اس انبار کو کھا جائے گی لیکن پھر جب تک روشن رہے گی وہاں نئی لکڑی جنم لے ہی نہیں سکتی۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ علی کی محبت کے آنے سے پہلے جس قدر گناہ تھے وہ سب جل گئے لیکن اب جب تک علی کی محبت کی شمع روشن رہے گی نیا گناہ نہ آ سکے گا۔

اور علیؑ کے شیعوں کی یہی شان ہونی چاہیے۔ دیکھئے ہر غلام اپنے سردار کی زیارت کو جایا کرتا ہے اور علی وہ سردار ہے جس کی زیارت آدم سے عیسیٰ تک تمام نبیوں کے لیے باعث فخر ہے۔ اب کس قدر نیک بخت ہوگا وہ غلام جس کی زیارت کو علی جیسا سردار خود چل کر جائے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کا دستور تھا کہ میثم تمار کی زیارت کے لیے اس کی دکان پر جایا کرتے تھے۔ میثم تمار وہ آدمی ہے جس کے جیب میں پیسہ نہیں لیکن دل کا خزانہ دولت ایمان سے پر ہے۔ منڈی سے کچھ کھجوریں لا کر بازار میں کہیں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا جس سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک دن حضرت علیؑ تشریف لائے میثم تمار ضروری کام کے لیے چلا گیا اور دکان مولا کے حوالے۔

ایک عورت آئی جس نے کچھ پیسے دیے اور مولا نے اسے کھجوریں دیں۔

جب میثم واپس پلٹا تو دیکھا کہ وہ پیسے سب کھوٹے تھے۔ علیؑ نے فرمایا: عادل امامؑ کے ہاتھ کا سودا ہے اگر پیسے کھوٹے ہیں تو اس ہاتھ سے کھجور کا بھی کوئی کھرا دانہ نہ گیا ہوگا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد عورت واپس آئی۔ قبلہ! وہ کھجور کے دانے تو اس قدر خراب تھے کہ کھانے کے قابل ہی نہ تھے۔ آپ نے فرمایا۔ تو اپنے پیسے واپس لے جا اور کھجوریں یہاں رکھ دے۔

ایک دن میثم تمار کو علیؑ نے فرمایا۔ اگر محبت کا امتحان دینا پڑے تو تو کیا کرے گا۔ عرض کیا کہ یہ آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔ آپ نے فرمایا۔ فلاں شخص یا خاندان والوں کے دروازے کے سامنے تجھے سولی پر لٹکایا جائے گا۔ میثم نے سر تسلیم خم کر لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ زمانہ بدلتا رہا اور میثم انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا۔

ایک دن اسی دروازہ سے گزرا تو ایک شخص دروازہ کے سامنے کھجور کا پودہ لگا رہا تھا۔ میثم نے شکر پروردگار ادا کیا کہ مولا کے فرمان کے پورا ہونے کی یہ بھی ایک علامت ہے۔ ہر روز خود اسے پانی سے سیراب کرتا تھا۔ آخر وہ وقت آیا کہ جب میثم پر محبت علی کا مقدمہ چلایا گیا اور نتیجہ کے طور پر اسی درخت پر اسے سولی پر لٹکایا گیا اور ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے لیکن اس نے زبان سے ذکر علی کو ترک نہ کیا۔ اگر کسی کہنے والے نے کہہ بھی دیا تو میثم نے سردار انگڑائی لے کر کہا جب تک منہ میں زبان ہے نام علی اس کا ورد رہیگا اور دیواروں پر میرے خون کی رنگینی اور زمین پر میرے خون کا بہتا ہوا ہر قطرہ ایک یادگار چھوڑ جائے گا اور قیامت تک کے شیعوں کو درس دے گا کہ علیؑ کے سچے محبّ و موالی کا سر تو باطل کی تلوار سے کٹ سکتا ہے لیکن اس کا سر دشمنِ علی کے آگے جھک نہیں سکتا۔ اور نہ علیؑ کے مشن سے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ بعض غلام ایسے ہوا کرتے ہیں جن کی طرف سردار چل کر آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک مومنہ عورت کا ذکر بھی خالی از فائدہ نہیں ہے۔ وہ جس نے اطاعت رسول میں اپنے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی اور ذاتی جذبات کو کچل کر راہ حق پر ثابت قدم ہو کر صنف نازک کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔

ہم اس زمانہ میں آئے ہیں جبکہ ہر طرف سے کفر ولادینی کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب غلافِ کعبہ کو پکڑ کر آنے والے زمانے کے بعض دلسوز حالات پیغمبرؐ نے ذکر کیے تو سلیمان جیسے صحابہ کی چیخیں بلند ہوئیں۔ آپ نے فرمایا۔ ایسا زمانہ ہوگا جب عورتیں بے لگام ہوں گی اور ان کے سامنے مرد بے بس ہوں گے سلیمانؓ نے عرض کیا۔ وہ عورتیں کس مذہب سے تعلق رکھنے والی ہوں گی؟ تو آپ نے فرمایا۔ میری امت سے ہوں گی سلیمانؓ سخت روئے لیکن جن حالات کو سن کر سلیمانؓ روتے تھے آج وہ حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ایسے حالات ہیں کہ نصیحت کرنے والے خود گھبراتے ہیں کہ کیا کہا جائے؟ ایسا زمانہ کہ بے دینی دین ہے اور دین پسماندگی کا نام ہے۔

انسان جتنا دین سے دور اتنا ترقی یافتہ اور جس قدر دین کے قریب اتنا ہی معتوب اور پسماندہ۔

میں ایک مومنہ عورت کا ذکر کر رہا تھا۔ مدینہ میں شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر سفر میں تھا۔ اچانک اس کا باپ بیمار ہوگیا اور اس کو اطلاع پہنچی پس حضرت پیغمبرؐ کی طرف اس نے اپنی کنیز کو بھیجا کہ میرا شوہر سفر میں ہے اور میرا باپ بیمار ہے

چونکہ شوہر سے اجازت لینا ناممکن ہے' اس لیے آپ دین اور شریعت کے وارث ہیں اگر اجازت دے دیں تو میں باپ کی بیمار پرسی کے لیے چلی جاؤں۔ جب اس عورت کی کنیز نے پیغمبرؐ سے درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا۔ جا کر اپنی مالکہ سے کہو کہ میں اللہ کے دین کو پہنچانے والا ہوں تا کہ اللہ کے دین میں خیانت کرنے والا۔ کہو صبر کر کے بیٹھی رہو میں اللہ کے حکم کو توڑنے کا حق نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کا باپ مر گیا۔ پھر اس نے کنیز کو بھیجا اور حضورؐ نے وہی جواب دہرایا۔ آخر کار اس کا باپ دفن ہو گیا اور پھر بھی کنیز وہی جواب حضورؐ سے لے کر واپس آئی تو وہ مومنہ عورت خاموشی سے گھر میں باپ کا غم کرتی رہی اور خدا و رسولؐ کے فیصلہ سے سرتابی نہ کی۔

عورت کی اس اطاعت گزاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ نے ستر ہزار فرشتہ جبریل کی معیت میں بھیجے۔ جنھوں نے حضورؐ کا سلام کر کے عرض کی اللہ اس عورت پر راضی ہے اور فرمایا: آپ بنفس نفیس اپنے قدموں سے چل کر اس عورت کو اس امتحان سے کامیابی کی مبارک باد پیش کریں کہ خدا نے اس کے اور اس کے باپ کے گناہ بخش دیے۔

چنانچہ حضرت پیغمبرؐ ملائکہ کی تعداد کثیر کے ساتھ اس عورت کے گھر کے دروازہ پر پہنچے۔ "دق الباب کیا۔ دروازہ کھلا۔ اجازت ملی اور آپ نے اندر قدم رنجہ فرمایا اس عورت نے بستره بنایا حضورؐ تشریف فرما ہو گئے۔

آپ نے فرمایا۔ مجھ سے پوچھو کیوں آیا ہوں؟ عرض کی اللہ کی رحمت خود چل کر آئے اور میں کہوں کیوں آئی ہے؟ آپ خود فرمائیں تو حضورؐ نے فرمایا: تو نے اللہ کے دین کی لاج رکھی ہے اور اطاعت خدا و رسولؐ کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اب اللہ نے جبریل کو ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کے صلہ میں اس

نے تیرے اور تیرے باپ کے گناہ بخش دیئے ہیں۔ اور تو اس عظیم امتحان میں کامیاب ہے۔

حضورؐ کا فرمان ہے کہ اگر عورت شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھے تو اس پر زمین و آسمان کے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ جب تک واپس گھر میں قدم نہ رکھے۔ اور گھر سے باہر اس کی کوئی عبادت بھی قبول نہیں اگر شوہر کی اجازت نہیں۔ لیکن آج کل کی زہریلی فضاء میں کنیزان بتول کا اللہ حافظ ہے۔

سلیمانؑ رو رہے تھے کہ حضرت پیغمبرؐ نے اپنے آخری وصی مہدی ہادی کا ذکر کیا کہ وہ آئیں گے تو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ جس طرح ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔ سلیمان نے عرض کیا کہ میں تین سو سال کا بوڑھا تو نہیں دیکھوں گا وہ وقت کیسے ہو گا؟

آپ نے فرمایا:

خدا تجھے دوبارہ زندہ کرے گا۔ سلیمان نے عرض کیا: یہ دلجوئی ہے یا وعدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ دلجوئی نہیں' وعدہ ہے اور صرف میرا نہیں بلکہ میرا اور میرے اللہ کا اور میرے اوصیاء کا بھی وعدہ ہے کہ صرف تو ہی نہیں بلکہ جو جو مومن حضرت مہدی کے زمانہ کے انتظار میں مر جائیں گے اس وقت اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

اور حضرت مہدی علیہ السلام خود اس انتظار میں ہیں کہ اللہ مجھے اذن دے اور میں قاتلانِ حسین سے بدلہ لوں کیونکہ ان کو بھی شب و روز روتے گزرتے ہیں۔

میرا بیان یہی تھا کہ علی کی محبت گناہوں کو مٹا سکتی ہے یعنی جہاں علی کی محبت ڈیرہ جما لے وہاں گناہ جا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ محبت علی جلوہ گر ہے۔ پس

محبت علی خود ایک واعظ ہے جو دل میں موجود ہے۔ اگر آنکھ غلط نگاہ کرنا چاہے تو دل میں محبت علی جو موجود ہے وہ روک دے گی۔ اسی طرح کان اگر غلط آواز سننا چاہے گا تو محبت علی اس کو روک دے گی۔ اسی طرح زبان' ہاتھ' پاؤں' وغیرہ تمام اعضاء کو محبت علی خود روک دے گی اور اگر دعویٰ ہو علی کی محبت کا لیکن اس کو محبت علی ان بدکاریوں سے روک نہ سکے تو سمجھے کہ محبت کمزور ہے پھر اس کا علاج سوچنا چاہیے۔

عالم کا فرض ہے کہ معاشرتی اصلاح کے لیے زبان کھولے لیکن آج کل کا مبلغ یہ سوچتا ہے کہ مجھے یہ لوگ کیا دیں گے؟ اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ میں ان کو کیا دوں گا اور واعظ دوسروں کو تب ہی وعظ کرے گا جب اپنے وعظ پر خود عامل ہو گا کیونکہ آپ لوگوں کے کان میری آواز کو دور سے سن رہے ہیں لیکن میرے اپنے کان میری آواز کو بہت نزدیک سے سن رہے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت پیغمبرؐ کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لائی۔ اور عرض کیا کہ میرے بچے کو شہد کے زیادہ استعمال سے روکیں۔

آپ نے فرمایا:

اس کو کل لے آنا۔ چنانچہ وہ دوسرے دن حاضر ہوئی۔ تو آپ نے بچے سے فرمایا۔ بیٹا! ماں کی اطاعت کرنا فرض ہے۔ شہد کو جس طرح وہ حکم دے ترک کر دو۔ بچے نے حضورؐ سے وعدہ کر لیا تو اس عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ! اتنی سی بات اگر آپ نے کل ہی فرما دی ہوتی تو میرا بیٹا یہی وعدہ کر لیتا اور انکار نہ کرتا۔ آپ نے کل نہ فرمایا بلکہ آج کے آنے کی فرمائش کر دی۔ آپ نے فرمایا: تمہارے آنے سے پہلے میں خود شہد کھا چکا تھا اور مجھے شرم آتی ہے کہ کسی کو ایسی چیز سے کیسے منع کروں جس کو میں خود کر چکا ہوں؟ کل جس وقت سے تم گئی ہو میں نے اس

وقت سے ابھی شہد کو استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ نصیحت کرنے والے کی نصیحت تب کامیاب ہوتی ہے جب خود اس پر عامل ہو۔

اس لیے معصومؑ نے فرمایا۔ ہماری امت کے غلط کار علماء کا حشر فرعون، نمرود وغیرہ کے ساتھ ہوگا اور نیک علماء کا حشر انبیاء و اولیاء کے ساتھ ہوگا۔ اور علمائے سوء کو یہود کے علمائے سوء سے مشابہہ قرار دیا گیا۔

ایک حدیث میں ہے جب علماء کو امراء کے دروازوں کا طواف کرتے ہوئے دیکھو تو سمجھ لو کہ بدترین علماء ہیں۔ اور جب امراء کو علماء کے دروازوں کا طواف کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ بہترین امراء ہیں۔

خداوند کریم حضرت قائم آل محمدؐ کے ظہور میں تعجیل فرمائے تاکہ نیک لوگوں کا وقار بلند ہو اور باطل کا علم سرنگوں ہو۔ پڑھنے والا سمجھتا ہے مجلس وہ مقبول ہے جسے عوام قبول کرلیں۔ حالانکہ معیار مقبولیت عوام نہیں بلکہ درحقیقت مجلس وہ مقبول ہے جسے آئمہ طاہرین قبول فرمالیں۔ اگر ایک آدمی بھی کلمات حقہ سن کر اور وعظ سن کر ایک گناہ سے توبہ کرلے تو مجلس کی مقبولیت کی وہ سند ہے۔

دین کے لیے کیا کیا مصائب جھیلے آل محمدؐ نے۔ دل کانپتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہائے کوفہ کا بازار اور زینبؑ جیسی پردہ دار بلکہ تبلیغ دین کے لیے بی بی نے سب کچھ برداشت کیا۔ جب کوفہ کے مجمعے کھچا کھچ بازار سے گزر ہوا اور لوگوں کا ہر طرف ہجوم دیکھا تو بی بی نے اونٹ کی پشت پر ایک خطبہ دیا۔ پہلے فرمایا۔ اے اہل کوفہ خاموش!...... اس لفظ میں اس قدر تاثیر تھی کہ ہوا کی سرسراہٹ اور پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ رک گئی اور آدمی تو بجائے خود اونٹوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بھی خاموش ہو گئیں۔ پس بی بی نے علیؑ کے لہجہ میں آواز بلند کی لوگو! آؤ نبی

زادیوں کا تماشہ دیکھ لو۔ (جن کو باغی کہہ کر مغالطہ دیا گیا تھا۔) سب سمجھ گئے کہ یہ باغی نہیں بلکہ خاندانِ رسولؐ کی شہزادیاں ہیں۔ پس ایک کہرام بپا ہوا اور گریہ کی صدا آسمان تک پہنچی۔ کہتے ہیں ام حبیبہ بھی کوٹھے پر چڑھ کر قیدیوں کا تماشہ دیکھ رہی تھی کہ قریب سے گزرتے ہوئے سکینہ کے خشک ہونٹوں پر نگاہ ڈالی۔ پس کہنے لگی اے کم سن قیدن شہزادی! میں تجھے پانی پلاتی ہوں۔ میرے لیے تین دعائیں کرو۔

۱۔ جس طرح تم کمسنی میں قید ہوگئی خدا میری اولاد کو اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔

۲۔ جس طرح تم یتیم ہوگئی خدا میری اولاد کو یتیمی میں مبتلا نہ کرے۔

جناب سکینہ نے یہ دونوں دعائیں دیں اور پوچھا کہ تیری تیسری دعا کیا ہے۔

۳۔ ام حبیبہ نے عرض کی میں مدینہ میں رہ کر آئی ہوں اور جناب زینب بنت علی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے جب سے کوفہ میں آئی ہوں میں اپنی مرشد زادی کی زیارت کے لیے ترس رہی ہوں۔ دعا کرو کہ خدا مجھے حج نصیب کرے تاکہ مکہ کے بعد مدینہ جاؤں اور اپنی مخدومہ زینب بنت علی کی زیارت کرلوں۔

یہ سنتا تھا کہ سکینہ خاتون نے اپنے گریہ پر کنٹرول کرتے ہوئے فرمایا: اگر تجھے۔ زینب بنت علیؑ کی زیارت نصیب ہو جائے تو مدینہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کہنے لگی اس گندے بازار میں تو میری مرشد زادی کا نام لینا بھی ان کی شان کے خلاف ہے بازار کجا اور وہ پردہ دار کجا؟

سکینہ خاتون نے فرمایا:

وقت بدلتے رہتے ہیں اور زمانہ کروٹیں لیا کرتا ہے۔ اگر سوئے اتفاق سے بی بی یہاں ہو تو تم اسے پہچان لوگی؟ ام حبیبہ نے کہا جس کی خدمت میں سالہا سال رہی ہوں کیسے نہ پہچانوں گی؟ پس سکینہ نے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ زینب خاتون نے خود فرمایا:

ام حبیبہ بچی سے کیا پوچھتی ہو؟ میری طرف دیکھو اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔ ام حبیبہ نے جواب دیا چہرہ دیکھا ہوا ہے لیکن پہچان نہیں سکتی۔

بی بی نے سر کے بالوں کو جھٹکا دے کر ایک طرف کیا اور فرمایا علی کی بیٹی زینب میں ہوں اور سامنے نیزہ پر میرے بھائی حسینؑ کا سر ہے اور عباس و اکبرؑ قاسم اور عون و محمد سب مارے گئے اور میں اجڑ کر قید ہو کر تیرے شہر میں آ گئی ہوں۔

دربار شام میں داخلہ ہوا تو شرابی حاکم شراب کے نشہ میں مست تھا۔ پس کھڑے کھڑے قیدیوں کو کافی دیر ہوئی تو اس کمینے نے حسینؑ کے سر کی ایسی بے ادبی کی کہ تمام قیدیوں میں صدائے گریہ بلند ہوئی اس نے طشت طلا میں موجود سر حسین کے اوپر سے رومال ہٹایا اور اپنے ہاتھ کی چھڑی سے دندانِ مبارک پر چوٹ لگائی تو ہائے ہائے کی صدا بلند ہوئی۔

امام محمد باقر کا سن چھوٹا تھا۔ تقریباً ۴ برس کے قریب اور ان کی ماں فاطمہ بنت حسنؑ ان کو اٹھائے ہوئے تھیں۔ تھکا ہوا بچہ ماں کی گود کی ٹھنڈک پا کر ماں کے کندھے پر سر رکھ کر سو گیا۔ جب یہ گریہ کی آواز بلند ہوئی اور ماں کے گرم گرم آنسو محمد باقر کے رخسار پر پڑے تو آنکھ کھلی اور دریافت کیا۔ اماں رونے کا سبب کیا ہے؟ کیا دربار کی پیشی سے گھبرا گئی ہو؟ فرمایا نہیں میرے لال میں اکیلی نہیں۔ تیری دادی

زینب اور تمام بیبیاں بھی رو رہی ہیں۔ اور تیرا باپ سجاد بھی رو رہا ہے۔ شہزادے نے عرض کیا۔ اماں اگر دربار کی پیشی سے گھبرائی ہو تو یہ خیال کرو کہ دادی زہراء بھی تو دربار میں پیش ہوئی تھی۔ اور کوئی دوسری وجہ ہے تو فرمایئے۔

بی بی نے فرمایا:

فرعون وقت تخت پر ہے اور اس کے سامنے تیرے دادا کا سر طشت طلا میں ہے۔ ہم سب اس لیے رو رہے ہیں کہ وہ کمینہ شراب کے نشے میں حسینؑ کے دندانِ مبارک پر چھڑی مار کر کہتا ہے۔ حسین کیا یہی شراب حرام ہے اور پھر پیالے میں بچی ہوئی۔ شراب اوپر گرا دیتا ہے۔

و سیعلم الذین ظلموای منقلب ینقلبون۔

سترہویں مجلس

الحسین منی و انا مِنَ الحسین.

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ یہ فقرہ اس زبان سے نکلا ہے جو کنبہ پرور نہیں بلکہ حق پرور ہے۔ خاندان پرست نہیں بلکہ حق پرست ہے۔ اور اقرباء نواز نہیں بلکہ حق نواز ہے اگر کسی کی تعریف کرتا ہے تو اپنا قریبی سمجھ کر نہیں بلکہ حق سمجھ کر کرتا ہے اور کسی کی شکایت کرتا ہے تو اپنے سے دوری کی بناء پر نہیں بلکہ حق سے دور سمجھ کر کرتا ہے۔ پس علیؑ کی تعریف کی تو بھائی سمجھ کر نہیں بلکہ حق سمجھ کر کی۔ اور زہراء کے حق میں کچھ فرمایا تو بیٹی سمجھ کر نہیں بلکہ حق سمجھ کر فرمایا۔ اور حسینؑ کے متعلق بھی جو کچھ فرمایا صرف فرزند سمجھ کر نہیں بلکہ حق سمجھ کر فرمایا:

جو حدیث میں نے آپ حضرات کے گوش گزار کی ہے اس کے جو حصے ہیں ایک حصہ کا سمجھنا تو نہایت آسان ہے لیکن دوسرے حصے کو سمجھنا بڑا مشکل ہے پہلا فقرہ (حسین مجھ سے ہے) اس کو ہر بندہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کیونکہ بیٹا باپ سے ہوتا ہے اور فرع اصل سے ہوتی ہے لیکن دوسرا فقرہ کہ (میں حسین سے ہوں)

اس کو سمجھنا مشکل ہے اس لیے کہ باپ بیٹے سے نہیں ہوا کرتا اور نہ اصل فرع سے ہوتی ہے۔

میں ان دو حصوں کی وضاحت اپنے انداز سے کروں گا بشرطیکہ آپ کہانی سمجھ کر صرف کانوں کو متوجہ نہ کریں بلکہ حقیقت آموز درس سمجھ کر دل و دماغ کو متوجہ فرمائیں۔ دیکھئے انسان کے متعارف ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس میں ذاتی کمال کا پایا جانا اور دوسرا ہے کسی صاحب کمال کی طرف منسوب ہونا ذاتی کمال کا نام علمی اصطلاح میں حسب ہے اور نسبی کمال نسب ہے۔

ایک شخص ذاتی کمال کی بدولت متعارف ہوا کرتا ہے کہ بڑا عالم ہے' فاضل ہے یا دنیاوی اعتبار سے فلاں عہدہ پر فائز ہے' اور دوسرا شخص دینی یا دنیاوی کوئی عہدہ نہیں رکھتا بلکہ اس کا باپ عہدہ دار ہے پس وہ اپنے باپ کی طرف سے متعارف کرایا جائے گا کہ فلاں صاحب کمال کا فرزند ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ذاتی کمال پائیدار اور نسبی کمال و شرف عارضی ہے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ذاتی کمال اور نسبی کمال میں تلازم نہیں ہے یعنی حسب اور نسب میں لازم و ملزوم کی حیثیت نہیں ہے۔ پس ضروری نہیں کہ جس کا حسب بلند ہو اس کا نسب بھی اعلیٰ ہو یا جس کا نسب اعلیٰ ہو اس کا حسب اور کردار بھی بلند ہو۔ ہاں جس کا نسب اعلیٰ ہو اس کو نسبی اور جس کا حسب اعلیٰ ہو اس کو حسبی کہا جائے گا۔

حضرت آدمؑ کا فرزند قابیل نسب میں بلند ہے کہ نبی زادہ ہے لیکن ذاتی حسب و کردار میں پست ہے کہ اپنے بھائی کا قاتل ہے اور اپنے باپ کی شریعت کا دشمن ہے اسی طرح حضرت نوحؑ کا فرزند کنعان نسب اعلیٰ رکھتا ہے لیکن عمل و کردار

کے اعتبار سے پست ہے۔ پس اس قسم کے آدمیوں کو حسبی نہیں کہا جائے گا۔ البتہ نسب اعلیٰ رکھتے ہیں لہٰذا نسبی ہیں۔

ان کے مقابلہ میں ایسے آدمی بکثرت موجود ہیں جن کا نسب پست ہے اور حسب و کردار بلند ہے ان میں سلیمان فارسیؓ بلال حبشیؓ اور محمد بن ابی بکر کی واضح مثالیں موجود ہیں جن کا نسب بلند نہیں لیکن حسب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ جو حدیث میں نے پڑھی ہے۔ حسین منی و انا من الحسین اس میں حضورؐ اپنے فرزند حسینؑ کو متعارف کرانا چاہتے ہیں کہ حسینؑ کو صرف نسبی بلندی کے اعتبار سے نہ دیکھو بلکہ اس کا اپنا حسب و کردار بھی بہت بلند ہے اور اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اگر حسینؑ کا نسبی مقام دیکھنا ہو تو حسین مجھ سے ہے لیکن اگر اس کا حسب دیکھنا ہو تو میں حسینؑ سے ہوں۔

دیکھئے حضرت پیغمبرؐ کا نسب ہے ابن عبداللہ بن عبدالمطلبؑ بن ہاشمؑ بن عبد منافؑ حضرت آدمؑ تک اور ان کا حسب یعنی ذاتی کمال۔ آپ سلطان الانبیاء شافع محشر صاحب معراج بانی اسلام اور صاحب قرآن ہیں۔ حضورؐ کے آبائے طاہرین عبداللہ سے لے کر آدمؑ تک نسب کے لحاظ سے تو آپ کے باپ دادا ہیں لیکن حسب کے لحاظ سے وہ سب کے سب آپکی امت میں داخل ہیں۔ پس حضور کے فرمان کا مقصد یہ ہوا کہ اگر میں نہ ہوتا تو حسین کا نسب نہ بنتا اور اگر حسین نہ ہوتا تو میرا حسب محفوظ نہ رہتا۔ پس نسب میں وہ مجھ سے ہے اور حسب میں میں اس سے ہوں۔

نسب کے دو پہلو ہیں۔ ایک طول دوسرا عریض۔ نسب کا طول اوپر کی طرف باپ، دادا، پردادا آدم تک اور نیچے بیٹا، پوتا آخر تک یہ ایک زنجیر ہے جس کی

ہر کڑی دوسری سے ملی ہوئی ہے اور عرض نسب ہے بھائی بہن جو سلسلہ طول میں داخل نہیں ہے۔ عام انسانوں میں کوئی انسان نہ اپنے طولی سلسلہ کی ضمانت دے سکتا ہے اور نہ اپنے عرضی سلسلہ پر اطمینان کر سکتا ہے۔

حسینؑ سلسلہ نسب کا وہ سلطان ہے جس کا طول بھی شک و ریب سے بالاتر ہے اور عرضی بھی لائق فخر ہے۔ طول میں اوپر علیؑ سے آدمؑ تک ہر صلب پاک اور جناب زہراء سے حوا تک ہر رحم پاک اشھدانک كُنْتَ نُوْراً فِی الْاَصْلَابِ الشَّامِخَةِ وَالْاَرْحَامِ لمطھرۃ لَمْ تُنَجِّسكَ الْجَاهِلِيَّه بَاَنجسھا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہمیشہ بلند صلبوں میں اور پاکیزہ رحموں میں رہتے رہے اور کسی دور میں بھی جاہلیت (شرک و کفر) آپ کو اپنی نجاستوں سے آلودہ نہ کر سکی پس آپ کا طولانی سلسلہ اوپر کی طرف آدمؑ و حواؑ تک پاک اور تحتانی سلسلہ سجادؑ سے مہدیؑ تک پاک۔ پس اوپر کا سلسلہ بھی پاک اور نیچے کا سلسلہ بھی پاک گویا اصل بھی پاک اور نسل بھی پاک۔

حسین نسب کے اعتبار سے عظمتوں میں گھرا ہوا ہے نانا عظیم باپ عظیم، ماں ملکہ عظمت یا یوں عرض کروں نانا ہے تو سید الانبیاء باپ ہے تو سید الاولیاء، دادا سید عرب نانی سیدہ عرب، اماں سیدہ نسا العالمین اور خاتون جنت بھائی سید جوانان جنت، بہن سیدہ صبرام المصائب بیٹا سید الساجدین۔ غالباً اسی بناء پر حضورؐ کا ایک ارشاد منقول ہے کہ مقام نسب میں خود میں بھی حسینؑ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حسینؑ کا نانا سید الانبیاء ہے اور میرا نانا ایسا نہیں۔ حسینؑ کا باپ سید الاوصیاء ہے اور میرا باپ ایسا نہیں۔ حسینؑ کی اماں خاتون جنت ہے اور میری ماں کا یہ مقام نہیں، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ کا بھائی حسینؑ کے بھائی جیسا نہیں۔ پیغمبرؐ کی نانی حسینؑ کی

نانی جیسی نہیں، پیغمبرؐ کی بہن حسینؑ کی بہن جیسی نہیں اور پیغمبرؐ کے بیٹے حسینؑ کے بیٹوں جیسے نہیں۔ پس حسینؑ سلسلہ نسب کا وہ سلطان ہے جس کی مثال ہے تو صرف ایک حسن اور بس۔ علامہ شیخ محمد حسینؒ آل کاشف الغطا (جو ہمارے استاذ الاساتذ ہیں) انھوں نے ایک مقام پر فرمایا کہ ہمیشہ مقام تعارف میں بے ہمتا انسان اپنا نسب پیش کرتا ہے اور باہمت اپنا کردار حسب پیش کرتا ہے یعنی باہمت آدمی دنیا میں اپنے کمال سے متعارف ہوتا ہے اور بے ہمت آدمی (پدرم سلطان بود) کے نعرہ پر ہی محدود ہوتا ہے اور درحقیقت زندہ انسان وہ ہے جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو۔ اگر دیکھو کہ کوئی زندہ اپنے مردوں کے سہارے پر زندہ ہے تو اس زندہ کو زندہ مت کہو اور اس مردہ کو مردہ مت کہو جس کا یہ سہارا لیتا ہے بلکہ درحقیقت مردہ ہے یہ زندہ جو زندگی کے باوجود مردوں کا سہارا لیتا ہے اور زندہ ہے وہ مردہ جس کا زندوں کو سہارا ہے۔

حسین تخلیق پروردگار کا وہ عظیم شاہکار ہے جس نے نباض انسانیت ہو کر ظلم وجور کی چکی میں پسی ہوئی اور ظلم استبداد و تشدد کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی اور کراہتی ہوئی انسانیت کو عظیم انقلاب کے ذریعے یزیدیت و فرعونیت کے طوفانوں کے منہ موڑنے اور ان کی شوکت کو توڑنے کا جذبہ دیا۔

پس ایسے عظیم انسان کے لیے ناممکن تھا کہ اپنے تعارف کے لیے اپنے آباء یا بزرگوں کا سہارا لیتے ورنہ چاہتے تو اپنے نانا کی عظمت اور باپ کی جلالت پر ہی فخر کرنے تک محدود رہتے لیکن حسین نے اپنے بلند عزم کے ماتحت غلامی کی زنجیروں میں جکڑی انسانیت کو راہ آزادی کی نشاندہی کے لیے انتہائی کٹھن مراحل سے گزرنے کو اپنے دستور العمل میں شامل کر دیا ایسے کٹھن کہ جن کے تصور سے بھی

عام انسان لرز جاتا ہے۔ پس جب حسین نے وہ مراحل طے کر کے پوری کامیابی کے ساتھ منزل مراد حاصل کر لی اور مظلوم اقوام کے لیے آزاد زندگی کی راہ ہموار کر لی اور عظمت انسانی اور روح اسلامی کو تازگی و تابندگی بلکہ تاابد کی زندگی بخش دی تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے بابا اور نانا کی عظمتوں کا سہارا لیتے خود نانا اور بابا تک محدود نہیں بلکہ تا آدمؑ تمام بزرگوں نے حسینؑ کی عظمت کا لوہا مان لیا اور مل کر خراج عقیدت پیش کرنے اور داد دینے پر مجبور ہوئے۔

اب دیکھنا ہے کہ حسینؑ کا حسب کیا ہے؟ جس پر نسب کو ناز ہے۔

تو اس مقصد تک پہنچنے کے لیے چند امور کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایک تاریک گھر میں معمولی چراغ روشنی دے سکتا ہے لیکن جہاں پہلے روشنی موجود ہو تو وہاں مزید روشنی کے لیے معمولی چراغ کام نہیں دے گا کیونکہ جب اندھیرا تھا تو اسی چراغ سے کام لینا دانشمندی کا تقاضا تھا لیکن روشن گھر میں اسی چراغ کا لانا حماقت کی علامت ہے۔ بلکہ یہاں وہ چراغ آئے گا جس کی روشنی موجودہ روشنی پر چھا جائے پس اگر پہلے زیرو کا بلب ہے تو ساٹھ نمبر کا لایا جائے اور ساٹھ کا ہے تو سو کا لانا چاہیے اور سو کا ہے تو ہزار کا لائیں گے۔ وعلی ہذا القیاس۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ ان پڑھ گھرانے میں پڑھنا مشکل ہے لیکن اگر پڑھ لے تو چمکنا آسان ہے اس لیے کہ وہ اندھیرے گھر کا چراغ ہے اور اس کے برعکس پڑھے لکھے گھرانے میں پڑھنا اگرچہ آسان ہے لیکن چمکنا اور نامور ہونا مشکل ہے اس لیے کہ یہ روشن گھر کا چراغ ہے یہ اس وقت چمکے گا جب موجودہ روشنیوں پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہوگا۔

اسی طرح بخیل گھرانے میں کچھ دے کر سخی بننا مشکل ہے لیکن اگر کوئی

دینے کی ہمت کرے تو شہرت یافتہ ہونا اور چمکنا آسان ہے کیونکہ تاریک گھر کا چراغ ہے اور اس کے برعکس سخی گھرانے میں رہ کر سخاوت کرنا آسان ہے لیکن چمکنا مشکل ہے کیونکہ روشن گھر کا چراغ ہے یہ تب چمکے گا جب تمام گھر والوں سے بازی لے جائے۔

تیسری بات جو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ باپ یا خاندان جتنا گھٹیا یا گمنا ہو ابھرنے والے بلند ہمت فرزند کے لیے بلندی اور ناموری آسان ہے اور اس کے برعکس باپ یا خاندان جس قدر بلند ہوگا نئی پود کے لیے بلندی کا مقام حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ مثلاً مقام تعلیم میں باپ ان پڑھ ہے تو بیٹا معمولی سی تعلیم کے ساتھ باپ سے بڑھ سکتا ہے اور نام پیدا کر سکتا ہے لیکن اگر باپ تعلیم یافتہ ہو تو جس قدر اس کی تعلیم کم ہوگی بیٹے کے لیے بلندی اسی قدر آسان ہوگی۔ مثلاً وہ پرائمری پاس ہے تو بیٹا تھوڑی محنت کر کے مڈل پاس ہو کر باپ سے قدم بڑھا لے گا اور اگر باپ مڈل پاس ہو تو بیٹا میٹرک کر کے اپنی شان بنا لے گا اگر وہ میٹرک ہو تو یہ بی اے کر لے وہ بی۔ اے ہو تو یہ ایم اے کر لے۔ مقصد یہ ہے کہ باپ جس قدر بلند ہوتا جائے گا۔ بیٹے کے لیے مشکل بڑھتی جائے گی۔

اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہی غور کیجئے اگر باپ یا خاندان بخیل ہو تو بیٹا سخاوت کر کے سخی کہلائے گا لیکن وہ بھی سخی ہوں تو ان کو بلندی حاصل کرنے میں ان سے بڑھ کر قدم رکھنا پڑے گا۔ ورنہ نامور ہونا مشکل ہوگا کیونکہ مثال کے طور پر اگر باپ حاتم طائی جیسا سخی ہو تو بیٹا پانچ یا دس روپے میں سخی نہیں کہلائے گا بلکہ لوگ اس کو بخیل کہیں گے یعنی جہاں بخیل گھرانے کا فرد ایک روپیہ دے کر سخی کہلا سکتا ہے وہاں سخی گھرانے کا فرد پانچ روپے دے کر بھی بخیل کہلائے گا۔ اسی طرح ان پڑھ

گھرانے کا فرد جہاں پرائمری پاس کر کے تعلیم یافتہ کہلا سکتا ہے وہاں تعلیم یافتہ گھرانے کا فرد مڈل پاس ہو کر بھی ان پڑھ کہے جانے کا مستحق ہوگا۔

ان باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد سرکار حسین علیہ السلام کی عظمت کا اندازہ کیجئے۔

حسینؑ تاریک گھر کا چراغ نہیں۔ حسینؑ بخیل گھر کا سخی نہیں، حسینؑ بزدل گھر کا بہادر نہیں، حسینؑ ان پڑھ گھرانے کا عالم نہیں، حسینؑ بے نماز گھر کا نمازی نہیں اور حسینؑ گمنام گھر کا نامور نہیں بلکہ حسینؑ اس گھر میں آئے جہاں معرفت و سخاوت و شجاعت و عبادت کے عظیم فانوس روشن تھے جہاں نیک نامی و سعادت و سیادت و معرفت و عبادت کی گوناگوں قندیلیں چہار دانگ عالم میں ضیاء پاشی کے لیے مصروف کار تھیں۔

ایک تاریک گھر کا چراغ ہوتا تو معمولی چمک سے ابھر سکتا تھا اور اگر پہلے معمولی درجہ کی روشنی ہوتی تو یہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی چمک سے نمایاں مقام حاصل کر سکتے تھے۔ حسینؑ جس گھر میں آئے وہاں روشنی پھیلانے والے زیرو کے یا گھٹ درجہ کے بلب روشن نہیں تھے بلکہ ہائی درجہ کے بلب موجود تھے یا یوں عرض کروں کہ اس گھر میں روشن ہونے والا نبوت کا بلب ایک لاکھ چوبیس ہزار نمبر کا تھا۔

اور جس مالک و کارخانہ دار (اللہ) نے یہ بلب تیار کیا ہے اس نے یہ نمبر ہی آخری قرار دیا ہے۔ نہ اس نے بلند درجہ کا پہلے بنایا اور نہ بعد میں بنایا جائے گا۔ اسی طرح ولایت کا بلب آخری نمبر کا عصمت طہارت کا بلب آخری نمبر کا پھر ان ہائی روشنیوں میں آ کر حسینؑ نمایاں طور پر اپنی روشنی پھیلائے اور سابق کے تمام روشن ماحول سے بھی اپنی روشنی منوائے تو کیسے؟

یہ حسینؑ کے عظیم مشن کا عظیم منشور تھا جس کو حسینؑ نے نبھایا اور بزرگوں سے منوایا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ باپ جس قدر گمنام اور گھٹیا ہو تو بیٹے کے لیے بلندی کا مقام آسان لیکن باپ جس قدر بلند ہو تو بیٹے کے لیے اسی قدر مشکلات میں اضافہ ہو گا۔

حسینؑ اس عظیم باپ کا فرزند ہے جس نے بلندی کا کوئی زینہ چھوڑا ہی نہیں جس پر قدم نہ رکھا ہو۔ اسی لیے تو اللہ نے اس کا نام بھی علی رکھا ہے۔ پست ہوتے تو عالم الغیب نے اس کا نام علی کیوں رکھا ہوتا؟

اگر کمالات کے متعدد شعبہ جات ہوں اور باپ ایک شعبہ میں بلند مقام حاصل کر لے تو بیٹا دوسرے شعبہ میں آخری ڈگری حاصل کر کے باپ کے برابر کرسی حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً باپ علم الحساب کے آخری زینہ پر ہو تو بیٹا الجبرا میں آخری ڈگری پر اسی طرح باپ علم تاریخ میں ماہر ہو تو بیٹا علم جغرافیہ میں صاحب کمال وعلی ہذا القیاس لیکن حسین اس باپ کا فرزند ہے جس نے کمالات انسانیہ میں سے کوئی شعبہ چھوڑا ہی نہیں جس کے آخری زینہ پر قدم نہ رکھا ہو مقام علم میں باب مدینة علوم نبویہ۔ مقام معرفت میں سلطان العارفین' مقام شجاعت میں اسد اللہ الغالب' مقام تقویٰ میں امام المتقین مقام اسلام میں اوّل المسلمین' مقام ایمان میں ایک طرف ایمان کل اور دوسری طرف امیر المومنین مقام ولایت میں سید الاولیاء آخرت میں قسیم الجنتہ والنار اور بارگاہ پروردگار میں حاضری کے وقت حامل لواء الحمد انبیاء اولیاء کی پناہ گاہ۔

اب حسینؑ اس باپ سے بڑھے تو کیونکر؟ جب کہ اس کے بعد ترقی کا کوئی زینہ ہی نہیں۔

اور اس عظیم باپ سے اپنی عظمت منوائے تو کیسے؟

لیکن تیرے عزم و استقلال کا کیا کہنا حسینؑ! تو نے ہر میدان میں قدم ایسا جما کے رکھا کہ فتح و نصرت نے بڑھ کر تیرے قدم چوم لیے اور نانا اور بابا بھی تجھے داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

دیکھیے مقام عبادت میں حسینؑ کے نانا سے بڑا عبادت گزار اور نمازی کوئی نہیں ہو سکتا لیکن حسینؑ نے اپنا مقام طے کر لیا اور نماز ایسی پڑھی کہ ان کی نماز نے تمام اولین و آخرین کے نمازیوں کی نماز کی لاج رکھ لی حتیٰ کہ ایک شاعر نے برملا کہہ دیا۔

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے
اک ضرب ید الٰہی اور اک سجدہ شبیری

حالانکہ اس شاعر نے حلقہ اسلام میں پڑھی جانے والی ہر نماز کو حسینؑ کی نماز کے مقابلہ میں کالعدم قرار دے دیا اور میں نے نہیں سنا کہ اس شاعر کو کسی نے کافر کہا ہو۔

وجہ یہ ہے کہ ہر نماز درجہ مقبولیت تک نہیں پہنچتی بلکہ وہ نماز مقبول ہوتی ہے جس میں خضوع و خشوع موجود ہو اور خضوع و خشوع کے لیے ضروری ہے کہ فضاء مناسب ہو اور ماحول سازگار ہو یعنی نمازی پر سکون ہو' با اطمینان ہو۔ کسی قسم کی بے چینی و پریشانی سے دو چار نہ ہو بے شک حضورؐ نے نمازیں پڑھیں اور انتہائی خضوع و خشوع سے پڑھیں لیکن ماحول سازگار اور فضاء پر سکون تھی۔ مثلاً مسجد کی چھت کے نیچے اور سائے میں کھا پی کر پورے اطمینان کے ساتھ اقتداء کرنے والے ہزاروں معتقدین کے آگے کھڑے ہو کر نہ گرمی نہ درد نہ غم نہ فکر ادھر جبریلؑ کی آمد فتح و نصرت کی خوشخبری' اسلام کی توسیع' قرآن کا نزول' رحمت پروردگار کا سایہ' نہ دشمن کا غلغلہ' نہ شور و غل نہ عزیزوں کا قتل' نہ جسم پر زخم' نہ بہن بیٹی کے پردہ کی فکر پس ہر طرح

سے بے فکر ہو کر آرام و اطمینان سے نمازیں ادا فرماتے رہے۔

اور حسینؑ نے ایک نماز ایسی حالت میں پڑھی کہ دنیا میں جس درد و غم کا تصور ہو سکتا ہے۔ وہ سب حسین کے لیے موجود تھے اور ہر قسم کی گرمی وجودِ اطہر پر موجود بھی۔ سورج کی گرمی' ملک گرم' فضاء گرم' ہوا گرم' موسم گرم' وقت گرم' جسم پر بے حد زخموں کی گرمی' تیروں کی برسات' مارو مارو کی صدائیں' کسی طرف علی اکبرؑ کی لاش' کہیں قاسمؑ و عباسؑ و عونؑ و محمدؑ کے لاشے' ادھر سکینہؑ کے بین باقی سیدانیوں کے رونے کی آوازیں' ان تمام دردوں میں گھر کر پورے اطمینان کے ساتھ خون آلود ریگ صحرا پر تیمم کر کے بہتر لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر قبلہ کی طرف رخ کر کے کہتے ہیں اللہ اکبر یہ حسین کی وہ نماز تھی جس نے ملاء اعلیٰ میں کہرام بپا کر دیا اور غالباً زیارت مطلقہ کے الفاظ ارواح انبیاء اور ملائکہ کی زبان سے بھی بے تحاشہ نکلے ہوں گے۔ اَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوۃَ۔

بے شک علی نے زکوۃ دی لیکن حسین کا رنگ نرالا ہے۔ علیؑ نے زکوۃ میں انگوٹھی دی اور حسینؑ نے بھی انگوٹھی دی۔ علیؑ نے دی رکوع میں' حسین نے دی سجدہ میں۔ علیؑ نے مسجد کے سائے میں اور حسینؑ نے گرم ریت پر علی نے صرف انگوٹھی دی انگلی بچ گئی لیکن حسینؑ نے دی تو (بقولے) انگلی کٹ گئی۔ غالباً بہن نے سوال کیا ہو گا کہ ایک ہاتھ کی انگلیاں تو پانچ ہیں لیکن دوسرے کی انگلیاں چار کیوں ہیں؟ اور جب حضرت علیؑ کی روح کربلا میں پہنچی ہو گی تو کہا ہو گا۔

اَشْهدانک قد اقمت الصّلوٰۃ واتیت الذکوہ زیارت مطلقہ میں ہے حسین میں گواہی دیتا ہوں کہ نماز تو نے پڑھی اور زکوۃ بھی تو نے دی۔

اس میں شک نہیں کہ شجاعت و بہادری میں علیؑ سے کوئی نہیں بڑھ سکتا لیکن

جس طرح میں نے پہلے کہا ہے کہ عبادت میں خضوع و خشوع کے لیے پرسکون ماحول اور پراطمینان فضاء کا ہونا ضروری ہے اسی طرح شجاعت کے لیے بھی فضائے سازگار ضروری ہے ورنہ جس بہادر کے سر میں درد ہو' یا پیٹ میں تکلیف ہو یا اس کے سامنے اس کا بیٹا تڑپ رہا ہو یا وہ ہوش ربا مصائب میں خود گھرا ہوا ہو تو وہ میدان میں جو ہر شجاعت نہیں دکھا سکتا۔ بے شک علیؑ لڑے لیکن ہر قسم کی فکر سے آزاد ہو کر لیکن جب حسین نے تلوار اٹھائی تو ہر قسم کے افکار میں گھر کر میدان خیبر میں علی لڑے تو ماحول ہمت افزا تھا اور حسین میدان میں آئے تو فضاء ہمت شکن اور ہوشربا تھی۔ علیؑ نے گھوڑا طلب کیا تو غالباً پیغمبرؐ نے پیش کیا ہو گا' تلوار مانگی تو پیغمبرؐ نے عطا کی ہو گی۔ یہاں حسین نے تلوار مانگی تو زینب در پر کھڑی ہو گئی اور گھوڑے پر سواری کا ارادہ کیا ہو گا تو نظر یمیناً وَ شِمالاً' دائیں بائیں دیکھ کر فرمایا کہاں ہو ہژبرو' شجاعت کے شیرو! آج میں بلاتا ہوں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ شاید بہن نے جواب دیا ہو کس کو بلاتے ہو؟ کون بچ گیا ہے؟ اگر حکم ہو تو صرف بہن حاضر ہے۔

علیؑ میدانِ خیبر میں آگے بڑھے تو پیچھے محمدؐ کی دعا اوپر رحمت خدا دائیں جبریل بائیں میکائیل آگے عزرائیل پاؤں چومنے کے لیے نصرت پروردگار اور در خیبر میں ہاتھ ڈالا اور اسے اکھیڑ پھینکا۔ میں عرض کروں گا یا علیؑ سازگار ماحول اور پرسکون فضاء میں قوت یداللہی سے درخیبر کا اکھاڑنا آسان ہے لیکن انتہائی ہوشربا اور روح فرسا حالات میں اور ناساز ماحول میں علی اکبر جیسے نوجوان فرزند کے سینے سے برچھی کا نکالنا مشکل ہے۔

جو شخص ہمارے رونے پر اعتراض کرتا ہے میں اس سے دریافت کرتا ہوں کہ تیرا ایسا نوجوان فرزند ہوتا جس کی عمر ۱۸ برس ہوتی شکل میں یوسفؑ تین دن کا

پیاسا ہوتا۔ جیٹھ ہاڑ کی گرمی دوپہر کا وقت اور سینے میں برچھی ہوتی اور ستر قدم کے فاصلہ پر دیکھنے والی ماں موجود ہوتی اور کمسن بہن کے سر پر قرآن ہوتا' اگر تیرا ہوتا تو تو کیا کرتا؟........... مدہوش کھڑی تھی ماں کہ کم سن بچی نے شاید دامن کھینچ کر کہا ہو گا اماں کیا دیکھتی ہو علی اکبر گھوڑے سے اتر گئے۔

ہائے کتنا پیارا بیٹا تھا لیلیٰ کا جس کا نام ہے علی اکبرؑ۔ اب میں نفسیاتی انداز سے مصائب پڑھتا ہوں۔ ان کو لفظ بہ لفظ کتابوں سے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔ شیعہ نوجوانو! تم ماتم کر کے اپنے سینے اور سر کا خون قربان کرتے ہو اور کس قدر قیمتی خون ہے نوجوانوں کا جو علی اکبر کے صدقہ میں گلی کوچوں میں گرایا جاتا ہے۔ اگر چودہ سو سال کا جوانوں کا خون اکٹھا ہوتا تو شاید ایک دریا کی شکل میں بہہ جاتا لیکن میرا عقیدہ ہے کہ شیعہ جوانوں کے خون کا موجزن سمندر بھی ہو تب بھی حسین کے نوجوان علی اکبر کے ناحق خون کے قطرہ کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔

جب دسویں کے دن ڈھلے ماں کے دروازہ پر آ کر سلام کے لیے کھڑا ہو گا تو وہ کیسا سماں ہو گا؟ ماں نے کہا ہو گا بیٹے کیسے تشریف لائے ہو تو جھجکتے ہوئے لہجے سے علی اکبرؑ نے کہا ہو گا اماں!.......... تو ترستی تھی کہ میرا جوان مجھ سے کوئی چیز مانگے اور میں بسم اللہ کر کے دوں۔ آج میں مانگنے کے انداز سے حاضر ہوا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں؟...... ماں نے کہا ہو گا...... بسم اللہ جو چاہو مانگو۔ لیکن میری حیثیت کا اندازہ کر کے مانگنا۔ اماں جان وہی چیز مانگوں گا جو تیرے پاس ہو گی...... اچھا مانگو میرے لعل...... عرض کی اماں...... ذرا جگر پر ہاتھ رکھو تو مانگتا ہوں۔ بیٹا...... میں ہاجرہ تو نہیں ہوں تیرے صابر باپ کے در کی کنیز ہوں جو جی چاہے مانگ لو۔ عرض کی ماں...... اور کچھ نہیں مانگتا بس موت کی اجازت مانگتا ہوں۔

یہ علیؑ اکبر کی ماں کا ہی حوصلہ تھا کہ بیٹے کی زبان سے موت کا نام سن کر سہہ گئی اور کہہ دیا بیٹے تو نے مانگ لیا اور میں نے دے دیا۔ پس کنیز سے فرمایا کہ علی اکبر کے غلام کو کہو گھوڑا تیار کر کے اندر بھیج دے آج میں خود علی اکبرؑ کو گھوڑے پر سوار کروں گی۔ کیونکہ یہ میرے بیٹے کی آخری سواری ہے چنانچہ گھوڑا تیار کر کے غلام نے اندر بھیج دیا تو علی اکبر کی اماں نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور اپنے جوان فرزند کے سامنے لائی اور فرمایا بیٹا! بسم اللہ سوار ہو جا۔ ماں نے ''کوچ'' میں ہاتھ رکھا ہو گا' رکاب تھامی ہو گی بس جوان کو سوار کر کے باگ اس کے حوالے کی اور کہا ہو گا کہ چہرہ سے تحت الحنک الگ کر کے تمام بیبیوں کو سلام کرو۔

چنانچہ سلام کرنے کے بعد علی اکبرؑ نے عرض کی اماں جان اجازت دیجئے تو ماں نے اجازت دی۔ پس علی اکبر نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور خیام سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ میں نے ایک روایت میں پڑھا ہے بقول حمید بن مسلم خیمہ کا پردہ تین دفعہ اٹھا اور گرا اور اس کے بعد صدائے گریہ و ماتم بلند ہوئی۔

تین دفعہ پردہ کا اٹھنا اور گرنا اس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ بیبیوں نے باری باری پیار کیا ہو گا اور شہزادے کو رکنا پڑ گیا ہو گا۔ غالباً پہلی دفعہ جب شہزادے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور گھوڑا روانہ ہوا تو پیچھے سے کسی نے دامن کو کھینچا تو شہزادے نے پوچھا کون ہو؟ روکنے والے۔ گریہ میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی تیری پھوپھی ہوں علی اکبرؑ۔ عرض کی جب اجازت مل گئی تو روکتی کیوں ہو؟...... بھرائی ہوئی آواز میں کہا بیٹا' روکتی نہیں ہوں بلکہ ایک ارمان پورا کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ جب میں میدان میں ملنے کے لیے آؤں گی تو تیری صورت خاک و خون میں غلطان چومنے کے قابل نہ ہو گی اس لیے اگر ہو سکے تو زین سے جھک کر مجھے گلے سے لگا

لو تا کہ ایک ایک دفعہ دایاں اور بایاں رخسار چوم لوں۔ پس علی اکبرؑ جھکے ہوں گے اور پھوپھی نے چوما ہو گا۔

دوبارہ گھوڑے کو باگ کا اشارہ کیا تو پھر کسی پردہ دار نے دامن کو کھینچا علیؑ اکبر نے پوچھا کون ہو؟ تو گریہ کے لہجہ میں جواب دیا۔ تیری ماں ہوں عرض کی اماں جان! جب اجازت دے دی تو روکنے کا کیا مطلب؟ وہ دیکھو بابا اکیلا ہے۔ بی بی نے جواب دیا جب پھوپھی کو موقعہ دیا ہے تو میں ماں ہوں مجھے بھی محروم نہ کرو۔ حسرت پوری کر لوں ایک دفعہ منہ چومنے دو چنانچہ دوبارہ علی اکبرؑ جھکے اور ماں نے چوم لیا اور پیچھے ہٹ گئیں۔ اب جو تیسری بار علی اکبرؑ نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور پھر دامن کو کسی نے کھینچا۔ تو علی اکبر نے پوچھا کون ہو روکنے والے؟ خاموشی چھا گئی اور جواب نہ ملا۔ پس گھوڑے سے فرمایا۔ کیوں رک گئے ہو؟ تو گھوڑے نے زبان حال سے اپنی مجبوری بیان کی تو شہزادے نے فرمایا۔ کون سی مجبوری ہے؟ گھوڑے نے گردن ہلا کر اپنے قدموں کی طرف اشارہ کیا بس علی اکبرؑ نے جھک کر دیکھا تو کمسن بچی گھوڑے کے سموں کو تھامے ہوئے ہے۔ علی اکبرؑ نے کہا سکینہ گھوڑے کے سم چھوڑ دو۔ پس بھائی کا حکم مان کر اٹھ کھڑی ہوئی اور عرض کی میرے جوان بھائی میری کم سنی پر رحم کرو۔ اماں کا قد دراز تھا اور پھوپھی کا قد بھی دراز تھا کہ انھوں نے چوم لیا۔ میرا قد چھوٹا ہے اور گھوڑے سے اترنے کو نہیں کہتی۔ ذرا اپنا دایاں قدم رکاب سے نکال لو تا کہ اسے سینے سے بھی لگا لوں اور جی بھر کر چوم بھی لوں تا کہ شام تک یاد کرتی رہوں گی کہ میں نے علی اکبر کے قدم چومے تھے۔

اٹھارویں مجلس

هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.

کیا برابر ہیں وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔

انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر اللہ یہ فیصلہ طلب کر رہا ہے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے سب برابر ہیں؟

گویا اللہ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم نے برابر بنائے نہیں تم برابر کیسے سمجھتے ہو؟ اجناس کائنات میں سے کسی جنس کے افراد میں برابری نہیں ہے۔ زمینیں سب برابر نہیں' آسمان سب برابر نہیں' ہوائیں سب برابر نہیں' پہاڑ سب برابر نہیں' پانی سب برابر نہیں' پتھر سب برابر نہیں' حیوان سب برابر نہیں' بندے سب برابر نہیں' مومن سب برابر نہیں' فرشتے سب برابر نہیں' پیر سب برابر نہیں' ولی سب برابر نہیں' نبی سب برابر نہیں' تو جن نبیوں کا تم کلمہ پڑھتے ہو وہ خود برابر نہیں ہیں تو ان کے پاس بیٹھنے والے کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟

بعض پتھر موتی کی شکل میں شاہی تاج میں جڑنے کے قابل ہیں اور بعض سڑکوں پر پاؤں کے نیچے روندنے کے لائق ہیں۔ بعض پانی منہ لگانے کے قابل نہیں

اور بعض ۳ روپے میں ایک بوتل بکتی ہے۔ گنگا کا پانی بھی پانی ہے اور کوثر کا پانی بھی پانی ہے۔ عام پہاڑ بھی پہاڑ اور طور بھی پہاڑ ہے۔ سور بھی حیوان ہے اور بکری بھی حیوان ہے اگرچہ قد میں برابر ہوں۔ عمر برابر ہو لیکن سور' سور ہے اور بکری' بکری ہے۔ یہ بھی گدھے ہیں جن پر مٹی اینٹیں لادی جاتی ہیں اور وہ بھی گدھے تھے جن پر نبی سوار ہوتے تھے۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سب برابر ہیں؟ مجھے اپنے پیغمبرؐ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ کبھی کسی گدھے پر سوار ہوئے ہوں البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام گدھے پر سوار ہوتے تھے۔

وہ فرشتہ جس نے سب سے پہلے ولاء علی کا اقرار کیا وہ سید الملائکہؑ ہوا۔

ہواؤں میں سے وہ ہوا

جس نے سب سے پہلے ولاء علی کا دم بھرا وہ بادنسیم قرار دی گئی۔ کہ پانی

جس نے سب سے ولائے علی کا اقرار کیا وہ کوثر بنا۔ زمین کا وہ ٹکڑا۔

جس نے سب سے پہلے ولائے علی کا اقرار کیا اس کو مکان کعبہ قرار دیا گیا۔ مہینوں میں سے

وہ جس نے سب سے پہلے ولائے علی کا اقرار کیا وہ ماہِ رمضان بنا۔ انبیاء میں سے جس نے سب سے پہلے ولائے علی کا اقرار کیا وہ اولوالعزم ہوا۔ راتوں میں سے جس رات نے سب سے پہلے ولائے علی کا اقرار کیا وہ شب قدر بنی اور دنوں میں سے جس نے سب سے پہلے ولائے علی کا اقرار کیا وہ یوم جمعہ قرار دیا گیا۔ سب برابر نہیں۔

اس لیے میں کہا کرتا ہوں وہ بندہ بندہ نہیں جس کا علیؑ بندہ نواز نہیں۔

وہ آدمی آدمی نہیں جس کا علی آدمیت ساز نہیں۔

وہ انسان انسان نہیں جس کو علیؑ کی پہچان نہیں۔

وہ مسلمان مسلمان نہیں جس کا علیؑ کی طرف دھیان نہیں۔

وہ مومن مومن نہیں جس کا نظر میں علیؑ کل ایمان نہیں۔

وہ پیر پیر نہیں جس کا علیؑ پیر نہیں۔

وہ مرشد مرشد نہیں۔ جس کا علیؑ مرشد نہیں۔

وہ شاہ شاہ نہیں جس کا علیؑ شاہ نہیں۔

وہ داتا داتا نہیں جس کا علیؑ داتا نہیں۔

وہ سلطان سلطان نہیں جس کا علیؑ سلطان نہیں۔

وہ امام امام نہیں جس کا علیؑ امام نہیں۔

وہ ہادی ہادی نہیں جس کا علیؑ ہادی نہیں۔ (ولکل قوم ھاد)

وہ ولی ولی نہیں جس کا مشکل کشاء علیؑ نہیں۔

اور وہ نبی نبی نہیں جس کا علی ولی نہیں۔

(لم یبعث نبی وما الا بولاء علی بن ابی طالب) یعنی کوئی نبی مبعوث بہ نبوت نہیں ہوا جب تک اس نے علی کی ولایت کا اقرار نہیں کیا۔ (ینابیع المودۃ)

اگر سب برابر ہوں تو اللہ کو عقل پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ عقل تو اس لیے ہے کہ لائق و نالائق میں' نیک و بد میں' عالم و جاہل میں اور مومن و منافق میں' فرق کرے تا کہ لائق محبت سے محبت کی جائے اور لائق نفرت سے نفرت کی جائے۔ اور یہی ہے تولا و تبرا کا مقصد۔ پس اگر فرق ہی نہ ہو تو عقل کی تخلیق بے فائدہ ہے۔

دیکھیے سکولوں میں درجہ بدرجہ امتحانات کیوں ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ لائق

و نالائق کو پرکھا جا سکے اگر سارے برابر ہوتے تو امتحان لینا فضول ہوتا۔ اسی لیے کسی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کے لیے انٹرویو اس لیے ہی ہوا کرتا ہے تاکہ لائق کا انتخاب کیا جا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ڈگری اور ایک سند رکھنے والے بھی سب برابر نہیں ہوتے بلکہ کچھ اپنی ذاتی قابلیت سے پاس ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دے دلوا کر کامیابی کی سند حاصل کر لیتے ہیں۔

البتہ جس کے پاس عقل نہ ہو اس کے لیے سب برابر ہوتے ہیں اور اس قسم کے آدمی کو پھر آزادانہ زمین پر چلنے کی اجازت نہیں ہوتی اسے رسہ یا زنجیر سے باندھ کر پابند کر دیا جاتا ہے یا اسے پاگل خانہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔

دیکھیے حیوان کے پاس عقل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ آزاد نہیں پھر سکتا۔ بلکہ رسہ یا زنجیر کا پابند ہوا کرتا ہے۔ چڑیا گھر کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ شیر جیسے طاقتور جانور کو پنجرہ میں بند کرانے والی چیز ہے۔ بے عقلی' ہاتھی جیسے دیو قامت ہیبت ناک جانور کو پابند سلاسل کیا ہے تو بے عقلی نے۔ اونٹ جیسے کوہ پیکر جانور کی ناک میں نکیل ڈالی ہے تو بے عقلی نے۔ اسی طرح گھوڑے جیسے طاقت ور جانور کے منہ میں لگام ڈلوائی ہے تو بے عقلی نے۔ اگر یہ عقلمند ہوتے تو انسان کی غلامی کی زنجیروں میں پابند رہنا قطعاً برداشت نہ کرتے۔

حیوان کی بے عقلی کی ادنیٰ مثال ہے جس نے رسہ پکڑ لیا وہ اس لیے پیچھے خواہ رسہ پکڑنے والا بچہ ہو یا جوان' مالک ہو یا چور' عالم ہو یا جاہل' مومن ہو یا منافق اور حیوان یہ بھی نہیں فرق کرتا کہ میرا رسہ عورت کے ہاتھ میں ہے یا مرد کے ہاتھ میں ہے؟ خواہ وہ حیوان کا رسہ پکڑ کر شیر سے اسے مروا ڈالے۔

انسان کے گلے میں بھی ایک رسہ ہے جس کا نام ہے جبل اللہ اور اللہ نے

عقل والوں کو اس رسہ کے پابند ہونے کی دعوت دی ہے۔ لیکن مجبور نہیں کیا۔ (لا اکراہ فی الدین) پس جس انسان نے اللہ کا یہ رسہ قبول کیا ہے جو جبل اللہ یا دین اللہ ہے تو اس کو سب سے پہلے یہ دعوت دی گئی ہے کہ خبردار! عالم و جاہل کو برابر نہ سمجھنا اور چور و مالک کو ایک جیسا نہ کہنا۔ حیوان کا کام ہے کہ جو بھی رسہ پکڑے اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اے انسان تو حیوان زادہ نہیں بلکہ انسان زادہ ہے۔ جو شخص تیرے دین کے رسہ کو پکڑ کر اپنی طرف لے جانا چاہے تو عقل کو استعمال کر کے پہلے فرق کر لینا کہ یہ دین کا رسہ مالک کے ہاتھ میں ہے یا چور کے ہاتھ میں ہے؟ اگر یہ فیصلہ کر لیا کہ سب برابر ہیں جو بھی پکڑے اس کے پیچھے چلنا ہے تو پھر تیرے اور حیوان کے درمیان فرق کیا رہا؟

البتہ حیوان میں ایک اچھی عادت بھی ہے اور وہ یہ کہ سارا دن چرانے والا حیوانوں کو جنگل میں پھراتا رہے لیکن شام کو جب شہر کے قریب پہنچ کر تمام جانوروں کو اپنی پابندی سے آزاد کر دے تو وہ ہر جانور کو گھر تک پہنچانے کے لیے ساتھ نہیں جاتا بلکہ وہ خود اپنی فطرت و عادت سے چھٹی کا وقت سمجھ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے راستہ میں اچھے اچھے مکانات عالیشان محلات بھی آئیں گے لیکن وہ کسی کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھتے بلکہ گلیوں کے موڑ کاٹتے ہوئے سیدھے اپنے مالک کے کچے مکان کے سامنے آ کر سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں خواہ چارہ ملے یا نہ ملے۔ مالک کے گھر کی چار دیواری کو اپنا مقدر سمجھ کر سر تسلیم جھکا لیتے ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسان صاحب عقل ہونے کے باوجود جب آزاد ہو تو اپنے مالک کے گھر (مسجد) اور شیطان کے گھر (سینما) میں فرق نہیں کر پاتا۔ حالانکہ عقل کا فیصلہ ہے کہ جس طرح سب بندے برابر نہیں اسی طرح سارے گھر بھی برابر نہیں۔

آیئے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد پر نگاہ ڈالیے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ہابیل اور قابیل۔ ان کے آدم کے ساتھ چار رشتے تھے وہ باپ یہ بیٹے۔ وہ استاد یہ شاگرد۔ وہ صاحب شریعت یہ ان کی امت اور وہ نبی اور یہ صحابی۔ اور یہ عام صحابی نہیں کہ صرف پہلو میں بیٹھنے والے ہوں بلکہ بیٹے ہونے کی حیثیت سے گود میں پلتے رہے تو جب نبی کی گود میں پلنے والے دو صحابی برابر نہیں تو پہلو میں بیٹھنے والے چار کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟

کسی عام انسان کو میں علیؑ کے برابر کیسے کہوں؟ جبکہ علیؑ کے اپنے بھائی علیؑ کے برابر نہیں۔ حضرت ابو طالبؑ و فاطمہ بنت اسد کے چار فرزند ہیں۔ طالب، عقیلؑ، جعفر طیارؑ اور علیؑ۔ علیؑ کا اپنا مقدر کہ اپنے گھر میں بھی چوتھے نمبر پر ہیں وہ تین بھائی بڑے ہیں اور علیؑ سب سے چھوٹے اور سب کے عزیز ہیں لیکن وہ بڑے ہونے کے باوجود شان و رتبہ میں علی کی اپنی اماں کے بیٹے علیؑ کے برابر نہیں ہیں تو دنیا کی کسی اماں کے بیٹے علی کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

علی صرف اپنے بزرگ بھائیوں کا امام نہیں بلکہ علیؑ اپنے ابا کا بھی امام ہے اور علیؑ اپنی اماں کا بھی اماں ہے اور صرف اپنے ایک ابا ایک اماں کا امام نہیں بلکہ ہر ابا اور ہر اماں کا امام ہے۔ ابو طالبؑ سے لے کر آدمؑ تک ہر ابا کا امام ہے اور فاطمہ بنت اسد سے لے کر حوا تک ہر اماں کا امام ہے۔ اور جس طرح اوپر کی طرف ہر ابا کا امام ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف حسن سے لے کر مہدیؑ تک ہر بیٹے کا امام ہے۔ پس علی واحد امام ہے جو اپنے ہر بزرگ کا امام ہے اور اپنی ساری نسل کا بھی امام ہے۔

ہمارے باقی آئمہ کا بھی یہ مقام نہیں ہے مثلاً حضرت امام حسنؑ، مہدیؑ

تک ہر عزیز کے تو امام ہیں لیکن اپنے باپ علیؑ کے امام نہیں ہیں۔ اسی طرح حسین علیہ السلام اولاد کے امام ہیں لیکن اپنے بابا کے امام نہیں ہیں۔ پس یہ شرف صرف علی کا ہے کہ اپنے ہر ابا کے بھی امام اور اپنے ہر بیٹے کے بھی امام ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ علیؑ اپنی اماں کا بھی امام ہے تو یہ جذباتی فقرہ نہیں تھا بلکہ اصولِ کافی میں ہے۔ حضرت رسالت پناہ یا یوں عرض کروں کہ برج رسالت کے نیرِ اعظم آسمان نبوت کے آفتاب مکرم اور بزم نبوت کے تاجدارِ معظم اپنی کرسی عظمت پر جلوہ گر تھے کہ مملکت ولایت کے تاجدار حامل ذوالفقار حیدر کرار نے حاضر بارگاہ ہو کر سلام نیاز پیش کیا۔ حضورؐ نے جواباً سلام کہہ کر ناطق قرآن، کے صحیفہ نور (وجہ اللہ) کی زیارت کرتے ہی فرمایا۔ یا علیؑ آج تیری آنکھیں پُرنم ہیں، شکل پُرغم ہے، چہرہ کملایا ہوا ہے عرض کی یا رسولؐ اللہ! میں کیوں نہ روؤں آج میری مہربان اماں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی ہیں۔ حضورؐ سن کر اس قدر روئے کہ محاسن شریف ریش مقدس آنسو سے تر بتر ہو گئی اور فرمایا یا علیؑ وہ اکیلی تیری اماں نہیں تھی بلکہ وہ تو میری بھی اماں تھی۔ کیا کہنا اس بی بی کے مقام کا کہ بارہ اماموں کی ماں ہونے کا شرف بھی ہے اور سلطان انبیاء نے فرمایا اور میری بھی ماں ہے۔ تو جناب زہراءؑ کو کہنا پڑتا ہے کہ میری بھی ماں ہے پس یہ واحد مستور ہے جس کو چودہ معصوم اماں کہہ کر بلا سکتے ہیں۔

حضورؐ بنفس نفیس علیؑ کے گھر تشریف لائے اور مدینہ کی پاکباز عورتوں کو غسل پر مامور فرمایا:

جب غسل مکمل ہو چکا تو اپنے جسد پُرنور سے قمیص کو الگ فرما کر غسالہ عورت کے حوالے کی اور فرمایا کہ میری اماں کو میری قمیص کا کفن پہنا دو یعنی دنیا کی

مستورات بیشک بازاری خریدا ہوا کفن نہیں لیکن یہ میری اماں ہے میں نہیں پسند کرتا کہ بازاری کفن پہن کر جائے۔ پس حضرت پیغمبرؐ کی قمیص کفن بن گیا علیؑ کی اماں کا۔

حضورؐ نے قبر تیار کرائی اور جب قبر تیار ہوگئی تو بنفس نفیس قبر میں لیٹے اور باہر آئے پھر اماں کو قبر کے حوالے فرمایا۔ پوری کائنات میں واحد یہ مستور ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کو حوالہ قبر کرنے کے لیے دو سلطان بیٹے موجود تھے معمولی سلطان نہیں بلکہ ایک مملکت نبوت کا سلطان اور دوسرا اقلیم امامت کا سلطان۔

جب تعویذ قبر بند ہوا اور قبر تیار ہوئی تو حضورؐ خود قبر کے کنارے بیٹھے اور پنجہ پرنور قبر کی مٹی پر ٹیک کر میت کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا:

ابنک، ابنک یعنی اب اپنے بیٹے کا نام لو بیٹے کا نام لو بیٹے کا نام لو۔

لوگوں نے پوچھا ہوگا کہ تین کام آپ نے نئے انجام دیے ہیں یعنی آج تک کسی کو نہ اپنی قمیص کا کفن پہنایا نہ کسی کی قبر میں لیٹے اور نہ کسی کی قبر پر بیٹھ کر تلقین کے یہ الفاظ ادا فرمائے (اور یہ یاد رہے کہ اسلام میں یہ پہلی تلقین میت تھی جو حضورؐ نے بنفس نفیس فاطمہ بنت اسد کی قبر پر پڑھی) حضورؐ نے فرمایا ایک دن میں نے اماں کے سامنے دربار توحید کی پیشی کا ذکر کیا تھا مقصد یہ ہو کہ ہر لباس کو زمین بوسیدہ کرسکتی ہے لیکن وہ لباس جو محمدؐ کے جسم سے مس ہو چکا ہو اس کو زمین بوسیدہ نہیں کرسکتی پس جب میری اماں محشور ہوگی تو میری قمیص میں ملبوس ہوکر حاضر دربار ہوگی۔

پھر ایک دن فشار قبر کا میں نے ذکر کیا تو گھبرا گئی پس میں نے وعدہ کیا کہ تیری قبر میں پہلے میں خود لیٹوں گا پھر تجھے حوالہ قبر کروں گا چنانچہ وعدہ پورا کیا اور

مقصد یہ ہے کہ قبر میں فشار ہوتا ہے لیکن جس قبر کی مٹی میرے جسم سے مس ہو جائے تو وہ قبر جنت الفردوس بن جاتی ہے۔

جب دفن کر چکے تو حسب دستور دو فرشتے میری اماں کی قبر میں پہنچے اور انھوں نے سوالات شروع کر دیے۔ پوچھا تیرا رب کون ہے؟ اماں نے جواب دیا اللہ میرا رب ہے۔ انھوں نے پوچھا تیرا نبی کون ہے؟ تو اماں نے کہا محمدؐ! تیرا دین کیا ہے؟ جواب دیا اسلام۔ تیرا قبلہ کون سا ہے؟ تو جواب دیا کعبہ! تیری کتاب کون سی ہے؟ تو جواب دیا قرآن۔ ان کا آخری سوال تھا کہ تیرا امام کون ہے؟ تو بی بی خاموش ہوگئی تو میں نے تعلیم دی کہ اپنے بیٹے کا نام لو بیٹے کا نام لو بیٹے کا نام لو۔

امامت کے سوال کے جواب میں خاموش ہونا غالباً اس لیے نہیں تھا کہ جواب نہ آتا تھا بلکہ شاید اس لیے خاموش ہوگئیں کہ سوچ میں پڑ گئی ہوں گی کہ عظیم بارگاہ کی جانب سے میرے عظیم فرزند کی امامت کا سوال ہو رہا ہے تو کون سا لب و لہجہ استعمال کروں؟ اور اپنے بیٹے کا نام کس لقب سے پیش کروں؟ امیر المومنین کہوں، امام المتقین کہوں، یعسوب الدین کہوں، امیر کہوں خبر گیر کہوں، حیدر کہوں، صفدر کہوں، ابو تراب کہوں، ابوالحسن کہوں، قسیم جنت کہوں، ساقی کوثر کہوں؟ کس لقب سے نام پیش کروں؟ تو حضرت پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہ ہو گا کہ اماں القاب ہوا کرتے ہیں غیروں کے لیے۔ مثلاً کسی ملک کا صدر ہو تو ساری دنیا اسے صدر مملکت کہے گی۔ حضور والا، جناب عالی وغیرہ کے خطابات سے نوازے گی لیکن وہی صدر جب اپنی اماں کے سامنے آئے گا تو وہ ہر لقب و خطاب سے بے نیاز ہوکر کہے گی آؤ میرے بیٹے۔" ماں کا بیٹے کو بیٹا کہہ کر بلانا، ہر لقب سے بلند لقب ہے۔ لہٰذا پیغمبرؐ نے فرمایا اماں! کیوں لقب تلاش کرتی ہو ساری دنیا علی کو القاب سے یاد کرے لیکن تیرا تو بیٹا

ہے فرشتوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کھلے دل سے جواب دو میرا بیٹا میرا امام ہے
میرا بیٹا میرا امام ہے۔ (اسی لیے فرمایا بیٹے کا نام لو)

یہاں تمام شیعہ وسنی حضرات کے لیے ایک درس آموز فقرہ عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ قبر میں تھی علیؑ کی اماں اور وہ عام مومن کی ماں نہیں بلکہ امیر المومنین کی ماں ہے تو جب قبر میں علیؑ کی اپنی ماں کا وقت بغیر علیؑ کا نام لیے نہیں گزر سکتا تو کسی دوسرے کی ماں کا وقت کیسے گزرے گا؟ اور یہ مومنوں کے امیر کی ماں ہے۔ جب مومنوں کے امیر کی اماں کا بغیر نامِ علیؑ کے چارہ نہیں تو مومنوں کی اماں کا علیؑ کے بغیر کیسے گزارا ہوگا؟ اور جب مومنوں کی اماں کا یہ حال ہے تو مومنوں کے ماموں کا کیا حال ہوگا؟

دیکھئے صحابہ بھی جو کامل الایمان ہیں جنت میں جائیں گے لیکن علیؑ وہ ہے جو جنت میں لے جائے گا کیونکہ قسیم جنت ہے پس جانے والے اور ہیں اور لے جانے والا اور ہے۔ اسی طرح صحابہ کوثر پئیں گے لیکن علیؑ پلائے گا کیونکہ ساقی کوثر ہے۔ پس کوثر پینے والے اور ہیں اور پلانے والا اور ہے۔ اسی طرح صحابہ پل صراط سے گزریں گے اور علیؑ گزارے گا اور جہنم سے کہے گا۔ یہ تیرا ہے اسے لے لے اور یہ میرا ہے اسے جانے دے پس پل سے گزرنے والے اور ہیں اور گزارنے والا اور ہے پس ایک جیسے کیسے؟

گویا جن لوگوں نے نبیؐ کو اپنے جیسا سمجھا انھوں نے نبی کے منبر پر بھی اپنے جیسے کو بٹھا دیا اور جنھوں نے نبی کو اپنے جیسا نہیں سمجھا انھوں نے اپنے جیسے کو اپنے جیسا سمجھا اور نبی جیسے کو نبیؐ کے منبر کا وارث قرار دیا۔

نیک بخت ہے وہ انسان جس نے علی کو اپنا امام تسلیم کر لیا اور بدنصیب

ہے وہ بندہ جس کا ہاتھ دامن مرتضےٰ سے کوتاہ ہوا۔ اگر سب برابر ہوتے تو حضرت عمار نے جب سوال کیا تھا کہ حضورؐ فتنہ و فساد کے زمانہ میں ہمیں کیا کرنا چاہیے تو آپ نے فرمایا اگر تمام لوگ ایک وادی میں ہوں اور اکیلا علیؑ دوسری وادی میں ہو تو علی کو نہ چھوڑنا کیونکہ علی تجھے گمراہی میں ہرگز نہیں لے جائے گا اور حضورؐ نے عمار کو پیشین گوئی کے طور پر فرمایا تھا (کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا) تو ان فرمودات کا صاف مطلب یہ ہے کہ باغی اور ہیں اور ہادی اور ہیں۔ سب برابر نہیں۔

جس طرح سب امام برابر نہیں اسی طرح سب غلام بھی برابر نہیں۔ علیؑ شریفوں کا امام ہے کمینوں کا نہیں۔ اے علیؑ کے حبدارو! تم بھی یاد رکھو کہ علیؑ وہ امام ہے جس طرح امام ہونا چاہیے۔ تم بھی اس کے ایسے غلام بننے کی کوشش کرو جس طرح علی کا غلام ہونا چاہیے جس طرح تمھیں بدمعاش امام کی ضرورت نہیں اسی طرح علی کو بھی بدمعاش غلام کی ضرورت نہیں۔

بعض غلام وہ ہیں جن کی زیارت کو سردار خود تشریف لے جاتے ہیں۔ ان غلاموں میں سے ایک میثم تمار ہے جس کی طرف چل کر علی خود جایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک مومنہ نے جب اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھا حتیٰ کہ اس کا باپ مر گیا لیکن پیغمبرؐ کے حکم کے ماتحت گھر سے نہ نکلی اور صبر کر کے گھر بیٹھی رہی۔ تو بحکم پروردگار حضورؐ بنفس نفیس اس کے گھر اس کو مبارکباد کہنے کے لیے آئے کہ چونکہ تو نے اللہ کے حکم کی لاج رکھی ہے۔ اور محمدؐ کے فرمان کی اطاعت کی ہے تو اللہ نے اس کے صلہ میں تیرے اور تیرے والد کے تمام گناہ بخش دیے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ علیؑ کی غلامی کا شرف تاج سکندری سے بہتر ہے اور حدیث میں ہے کہ جس کے کانوں پر علی کا نام آیا اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا (بہت سے

کانوں پر علیؑ کا نام آتا ہے لیکن کلیجہ قسمت والوں کا ٹھنڈا ہوتا ہے) پس ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنی شریف ماں کا شکر ادا کرے جس نے اس کے باپ کا حق میں خیانت نہیں کی۔

لوگوں نے بھی ہمیں علی تقسیم کر کے دے دیا ہے۔ ان کا گھریلو فیصلہ ہے کہ علیؑ شیعوں کا ہے اور باقی سب ہمارے۔ دیکھو زبان سے اگر کوئی نہ کہے تو عمل سب کا یہی بتاتا ہے چنانچہ آپ تجربہ کر لیں اگر کوئی شخص شب تاریک میں کسی راستہ سے گزر رہا ہو اور دائیں بائیں کسی جانب سے نعرہ حیدری یا علیؑ کی صدا گونجنے لگے تو اس گزرنے والے نے اگرچہ اسے دیکھا نہیں پہچانا نہیں بلکہ نہ شکل کا پتہ سیاہ ہے یا سفید' خوبصورت ہے یا بدصورت' عورت ہے یا مرد' وطن کا ہے یا مسافر' اور جن ہے یا انسان؟ یہ شخص فوراً فیصلہ کر لے گا کہ جو بھی ہے ہے شیعہ! اس لیے کہ نام علیؑ جس طرح شیعہ کی زبان سے پیار کے انداز میں نکلتا ہے وہ دوسری زبان سے نہیں نکلتا کیونکہ جب کوئی عام آدمی علیؑ کا نام لے گا تو جھجک کر لے گا اٹک اٹک کر لے گا لیکن جب شیعہ نام علی لے گا تو بے دھڑک لے گا اور کڑک کر لے گا۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص علیؑ کا نام لے گا تو آہستہ لے گا اور تاوان سمجھ کر لے گا لیکن جب مومن موالی شیعہ حیدر کرار نام علی کا نعرہ لگائے گا تو باآواز بلند لے گا اور ایمان سمجھ کر لگائے گا۔

اسی طرح اگر گزرتے ہوئے کسی بچہ سے کسی نے پوچھ لیا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اور اس نے جواب دیا کہ میرا نام ہے غلام علیؑ' غلام حیدر' یا غلام صفدر' وغیرہ تو پوچھنے والے کو تسلی ہو جائے گی کہ شیعہ کا بچہ ہے کیونکہ جب باپ نے بچہ کا نام غلام

حیدر رکھا ہے وہ ضرور حیدری ہی ہوگا۔ اگر کسی مکان کے دروازہ پر لکھا ہوا ہو یا علیؑ تو ہر گزرنے والا سمجھے گا یہ گھر شیعہ کا ہے۔ گھر تو گھر! اگر کسی مسجد کے دروازہ پر نام علیؑ لکھا ہوا ہو تو ساری دنیا اسے شیعہ کی مسجد کہے گی۔ بلکہ قرآن کے پہلے خالی ورق پر اگر نام علیؑ لکھ دیا جائے تو کھولتے ہی پتہ چل جائے گا کہ یہ شیعہ کا قرآن ہے۔

گویا شیعہ قوم کی پہچان ہی نام علیؑ سے ہوتی ہے۔ تو ہمیں کردار وہی ادا کرنا چاہیے جسے علیؑ پسند فرمائیں۔

دیکھئے تاریخ انسانیت کا ورق ورق الٹ کر نظر غائر سے مطالعہ کیجئے کبھی کوئی سلطان آپ کو نہ ملے گا جس نے اعلان جنگ کر کے اپنی فوج کو چھٹی دے دی ہو پس اگر اللہ کی پوری کائنات میں کوئی ایسا سلطان ہے تو صرف حسین جس نے اپنے زمانہ کی سپر پاور سے اعلان جنگ کے بعد اپنی پوری فوج کو چھٹی دے دی اور کیا کہنا ان فوجیوں کا جنھوں نے اعلان جنگ کے بعد چھٹی ملی لیکن قبول نہ کی اور وہ ہے سپاہ حسینؑ! اسی بنا پر اگر مولانا زکریں تو ان کو زیبا ہے کہ میرے صحابہ جیسے کسی کے صحابی نہیں ہیں حتیٰ کہ میرے نانا کے صحابی وہ تھے جن کو بوقت ضرورت وہ بلاتے رہے اور واپس کسی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور میرے صحابہ وہ ہیں جن کو مصیبت کے وقت میں رخصت کرتا ہوں تو جانے کو کوئی تیار نہیں ہے۔

حسین یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ حق و باطل کی جنگ میں افرادی کثرت یا قلت کو معیار نہیں سمجھا جاتا بلکہ حق اپنے دلائل و آثار سے واضح ہوتا ہے اور باطل

اپنی کمینہ حرکتوں سے آشکار ہوتا ہے بس حسینؑ چاہتے تھے کہ میرے صحابہ وہ ہوں جو میرے مشن میں سو فیصد میرے ساتھ ہوں ۔ بے شک ردی قسم کے انسان جانا چاہیں تو چلے جائیں میں ان کو روکتا نہیں ہوں پس میرے پاس وہ رہیں جو اگرچہ تعداد میں کم ہوں لیکن کردار میں حبیب بن مظاہر جیسے ہوں۔

چنانچہ زہیر قین نے عرض کی حضورؑ! آپ کے سامنے ستر دفعہ قینچی سے کتر دیا جاؤں تب بھی آپ کے قدموں سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔

❁……❁……❁

انیسویں مجلس

من مات علی حب آل محمد مات شهيداً جو آل محمدؐ کی محبت پر مرا
الاو من مات علی جب آل محمد مات مغفورا وہ شہید ہوا جو
الاومن مات علی حب آل محمد مات كامل الايمان بھی محبت
آل محمد پر مرا وہ بخشا ہوا مرا۔ وہ کامل الایمان ہو کے مرا جو آل محمد کی محبت پر مرتا ہے اس کی قبر ملائکہ رحمت کی زیارت گاہ بن جاتی ہے۔

جو آل محمدؐ کی محبت پر مرتا ہے اس کی قبر میں جنت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری احادیث ہیں۔

من مات علی بغض آل محمد مات كافرا.

جو آل محمد کا دشمن ہو کر مرتا ہے وہ کافر ہو کر مرتا ہے۔ جو شخص آل محمد کی دشمنی لے کر مرتا ہے اس کی قبر میں دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو آل محمد کی دشمنی پر مرتا ہے اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہے۔

یعنی جو بھی نہ مرے، جہاں مرے، جس ملک میں مرے، جس حالت میں مرے اگر محبت آل محمد لے کر مرتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے اور اس کے آگے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر دشمن آل محمدؐ ہو کر مرے تو وہ کافر مرتا ہے اور اس کے سامنے دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مرنے والا جو بھی ہو، مرد ہو یا عورت ہو، عالم ہو یا جاہل ہو، اور کہیں کا ہو، کی ہو، مدنی ہو، گورا ہو، کالا، سوہرا سالا ہو، اگر محبِ آل محمد ہے تو اس کی موت ایمان پر ہے اور شہید ہے۔ لیکن اگر دشمن آل محمدؐ ہے تو اس کی موتکفر کی ہے۔

ان احادیث کے مقابلہ میں ایک اور حدیث ہے جس کو سنی و شیعہ سب نے نقل کیا ہے۔ **من مات ولم یعوف امام زمانه مات میتة جاهلیة.**

یعنی جو اپنے زمانہ کے امام کی معرفت کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرتا ہے۔ اس حدیث اور پہلی احادیث میں مطابقت تب ہو سکتی ہے کہ امام کو آل محمدؐ سے ہی ہو کیونکہ اگر امام آل محمدؐ سے نہ ہو اور اس کی معرفت ہو جائے لیکن آل محمدؐ سے دشمنی ہو تو معرفت والی حدیث کہتی ہے کہ وہ کفر کی موت نہیں مرا۔ لیکن حُب والی حدیث کہتی ہے کہ وہ کفر کی موت مرا ہے اسی طرح وہ امام جو آل محمد سے نہیں اگر اس کی معرفت نہ ہو لیکن آل محمد سے محبت ہو تو معرفت والی حدیث کی رو سے اس کی موت کفر پر ہے اور حُب والی حدیث کی رو سے اس کی موت شہادت کی ہے تو ان دو قسم کی حدیثوں میں مطابقت اس وقت ہوگی جب امام اسی خاندان سے ہو جس کی محبت واجب ہے پس چونکہ محبت آل محمد سے واجب ہے اس لیے امام بھی آل محمدؐ سے ہونا ضروری ہے۔

جب معصوم سے پوچھا گیا کہ موت کیا ہے؟ تو فرمایا: مومن کے لیے موت

جنت کی طرف کھلنے والے دروازے کا نام ہے اور کافر کے لیے موت دوزخ کی طرف کھلنے والے دروازے کا نام ہے۔

اگر انسان ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونا چاہے تو اس کے پاس دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے اس ملک سے جانے کا اجازت نامہ جس کو پاسپورٹ کہا جاتا ہے اور اس ملک میں داخل ہونے کا اجازت نامہ جس کو ویزا کہا جاتا ہے اگر پاسپورٹ نہ ہو تو یہاں سے جانا مشکل اور اگر ویزا نہ ہو تو وہاں کا داخلہ ناممکن۔

پس جب دنیا سے ہر آدمی جاتا ہے اور آخرت کے لیے ملک ہیں صرف دو ایک دوزخیوں کی رہائش گاہ جس کا نام جہنم ہے اور دوسری مومنوں کی قیام گاہ جس کا نام بہشت ہے اور حضرت پیغمبرؐ نے صریح الفاظ میں فرمایا ہے کہ مملکت جنت کی سلطانی حسنؑ و حسینؑ کے پاس ہے۔ اور وہی اس ملک کے حکمران و سلطان ہیں۔ پس یہاں سے جانے کا پاسپورٹ تو ہر آدمی کے پاس موجود ہے **کل نفس ذائقة الموت!** اگر جنت میں جانے کا خواہشمند ہے تو ویزا بہشت کی حکومت سے لینا ضروری ہے۔ کیونکہ ویزا سرحد پار کرنے کے بعد نہیں ملا کرتا۔ پس حسینی سرکار کے نمائندوں سے جنت کا ویزا یہاں رہ کر حاصل کرنا پڑے گا ورنہ جنت میں داخلہ ممکن نہیں ہوگا۔

بے شک حسینؑ و حسنؑ جنت کے سلطان ہیں۔ دیکھیے کسی ملک کا بادشاہ ملک کے اندر ہو یا باہر جہاں بھی ہو اپنے ملک سے جو چاہے منگوا سکتا ہے چاہے تو وہاں سے کھانا منگوا لے چاہے لباس منگوالے دنیا کے بادشاہوں کو فخر ہوتا ہے کہ میرا لباس لندن یا واشنگٹن سے آیا ہے۔ حسینؑ و حسنؑ وہ سلطان ہیں جن کا لباس جنت سے

آیا بلکہ ضرورت پڑی تو درزی جنت کا' دھوبی جنت کا' اور رنگ ریز بھی جنت کا اور حتیٰ کہ جھولا جھلانے والا خادم بھی جنت کا۔

کتنا نیک بخت ہے وہ مرنے والا جس کی روح نے جب یہاں سے پرواز کی تو جنت کے ائیر پورٹ پر حسینؑ و حسنؑ نے اسے اہلاً و سہلاً کہہ کر فوراً اپنا مہماں بنا لیا۔

مرنے والے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی موت موجودہ لوگوں کے لیے راحت کا پیغام ہوتی ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی موت موجب غم ہوتی ہے تو معصومؑ کے فرمان کے مطابق مومن وہ ہے جو دنیا میں آئے تو راحت لے کر آئے اور دنیا والے اس کی آمد کو رحمت سمجھیں اور دنیا سے جائے تو دنیا والے اس کے فراق کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیں۔ پس دنیا میں آؤ تو راحت بن کر آؤ اور جاؤ تو عبرت بن کر جاؤ یعنی آؤ تو ہنسنے والے تمہارا استقبال کریں اور جاؤ تو رونے والے تمہیں الوداع کہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آؤ تو تمہاری آمد کو دنیا مصیبت اور تاوان سمجھے اور جاؤ تو دنیا تمہاری موت کو راحت جاں سمجھے۔ کسی نے پوچھا ہم لوگ موت کو کیوں نہیں پسند کرتے؟ تو جواب ملا اس کی وجہ یہ ہے کہ عمرتم الدنیا و خاربتم الاخرہ یعنی تم نے دنیا کو آباد کر رکھا ہے اور آخرت کو برباد کیا ہوا ہے۔ اس لیے آباد سے نکل کر بربادی کی طرف جانے کو پسند نہیں کرتے اگر تمہاری آخرت آباد ہوتی اور دنیا کو قید خانہ سمجھتے تو قید خانہ سے نکل کر آبادی کی طرف جانے کو ضرورت پسند کرتے' ہاں دنیا کافر کے لیے جنت ہے اور آخرت اس کے لیے قید خانہ ہے اس لیے وہ جنت سے نکل کر قید خانہ میں جانا پسند نہیں کرتا۔

ایک دفعہ غالباً یہودی نے معصومؑ سے سوال کیا کہ دنیا کافر کے لیے جنت

اور مومن کے لیے قید کس طرح ہے؟ دیکھئے میں یہودی ہوں اور دنیاوی لحاظ سے بدحال و کنگال ہوں اور آپ کی امیرانہ زندگی ہے یہ تو آپ کے لیے جنت ہے اور میرے لیے قید خانہ ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تو نے اپنا آخرت کا گھر جہنم دیکھا ہوتا تو مجھے پتہ چلتا کہ آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیا کی یہی بدحالی زندگی تیرے لیے جنت ہے اور تو نے میرا مقام جنت میں دیکھا ہوتا تو سمجھتا کہ جنت کے نعمات و لذت کے مقابلہ میں دنیاوی امیرانہ زندگی بھی جہنم ہے۔

گناہوں کو چھوڑنے کے لیے ہمارا جی نہیں چاہتا اس لیے کہ آخرت کے انعامات کو دیکھا نہیں ورنہ اگر آخرت کی امارت کا علم ہوتا تو دنیا میں قینچی سے کترا جانا برداشت کر لیتا۔ لیکن گناہ کی طرف قدم نہ بڑھاتا۔

ایک شخص نے حضرت پیغمبرؐ سے عرض کی کہ مجھ سے گناہ نہیں چھوٹتے۔ آپ نے فرمایا۔ صرف ایک نیکی کا مجھ سے وعدہ کر لو۔ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں گے اور وہ یہ کہ روزانہ میرے پاس آیا کرو اور جھوٹ نہ بولا کرو۔ اس نے عرض کی یہ تو آسان بات ہے پس وعدہ کر کے چلا گیا۔ اب جو گناہ کرنے کا وقت آیا تو سوچا کہ پیغمبرؐ کے پاس بھی جانا ہے اور جھوٹ بھی نہیں بولنا۔ اگر یہ گناہ کر لوں تو ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ جبکہ جھوٹ بولنا نہیں۔ پس اس گناہ کو چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ اسی طرح وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا۔

ایک شخص نے حضرت سجاد علیہ السلام سے اپنے گناہوں کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا میری چند باتوں پر عمل کرو اور بے شک گناہ کرتے رہو۔ اس نے عرض کی حضورؐ فرمائیے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ اللہ کا رزق کھانا چھوڑ دو۔ پھر بے شک گناہ کرتے پھرو۔ اس نے عرض کی حضورؐ! اس کا رزق کھائیں تو کیا کھائیں؟ آپ نے

فرمایا اگر اس کا رزق نہیں چھوڑ سکتے تو اس کے ملک سے نکل جاؤ۔ پھر بیشک گناہ کرتے رہو۔ تو اس نے عرض کی مولا! یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ جہاں بھی جاؤں اسی کا ہی ملک ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ پھر اپنے جسم میں اس قدر طاقت پیدا کرلو کہ جب ملک الموت آئے تو اس کو دھکے مار کر گھر سے نکال دو اور اس کو روح قبض نہ کرنے دو۔ اس نے عرض کی حضورؑ! یہ بھی مشکل ہے تو آپ نے فرمایا اے بندہ خدا۔ جب تم اس قدر عاجز و بے بس ہو کر نہ اس کے رزق بغیر تمہارا گزارا ہو سکتا ہے نہ اس کے ملک سے نکل سکتے ہو نہ اس سے چوری کر سکتے ہو اور نہ موت سے گریز کر سکتے ہو تو پھر شرم کرو پس اس نے فوراً توبہ کر لی۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو گناہ کرنا مشکل ہے اور نیکی کو بجا لانا آسان ہے۔ مثلاً چوری کر کے کھانا مشکل ہے کیونکہ انتہائی خطرہ مول لے کر چوری کی طرف قدم بڑھا جاتا ہے ساتھ ساتھ بے آرامی' فکرمندی' گرفتاری کا خطرہ' لیکن اس کے مقابلہ میں گھر میں آرام سے رہکر اپنی روکھی سوکھی کھا کر پیٹ بھر لینا آسان ہے۔ حرام پانی پر کس قدر دولت صرف کی جاتی ہے اور حلال پانی بالکل مفت ہے۔ پس حرام خوری جو مہنگی بھی ہے اور مشکل بھی ہے اس کو کر گزرنا' اور حلال خوری جو سستی بھی ہے اور آسان بھی' اس سے گریز کرنا صرف اللہ کی ناقدر شناسی ہے کہ نافرمانی پر رقم خرچ کرنا گوارا ہے اور نیکی جس پر کوئی خرچ نہیں وہ پسند نہیں۔

دیکھئے عقل کہتی ہے کہ بے قیمت شے کو ضائع کر دینے میں قباحت نہیں لیکن قیمتی متاع کو ضائع کرنا سعادت نہیں مثلاً اگر جیب سے ایک روپیہ گر جائے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ اور شے کی قیمت جس قدر زیادہ ہو گی اس کے ضائع ہونے کا اتنا ہی درد ہو گا اور اس کے خرچ کرنے میں اتنی ہی احتیاط ہو گی۔

اور دنیا کی ہر قیمتی شے سے زندگی بہت قیمتی ہے کیونکہ زندگی کا ایک لمحہ بھی پوری دنیا کے مقابلہ میں قیمتی ہوا کرتا ہے جب موت سر پر آتی ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ جس قدر خرچ ہو جائے پرواہ نہیں صرف ایک لمحہ زندگی کا حاصل ہو جائے چنانچہ سنا ہے کہ ایران کے شاہی دور کے وزیر اعظم عباس ہویدا کو جب شرعی اسلامی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا تو اس نے چند لمحات کروڑوں ڈالروں کے بدلہ میں مانگے تھے۔ لیکن شرعی عدالت نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ پس اس قدر قیمتی شئی کو برباد کرنے میں ہم کس قدر غیر محتاط ہیں۔ چنانچہ ایک روپیہ کو خرچ کرنے میں تو ہم احتیاط کرتے ہیں لیکن زندگی کی قیمتی گھڑیاں تاش میں یا کسی دوسرے کام میں ضائع کرنے کا احساس تک نہیں کرتے اور پوری زندگی میں سے جوانی کی زندگی انتہائی قیمتی ہے اور جتنا اس قیمتی حصہ زندگی کو بے دریغ خرچ کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی کم قیمت چیز کو بھی بے دردی سے نہیں ضائع کیا جاتا تو کس قدر بے حس ہے یہ انسان جو بے قیمت چیز کو ضائع کرنے سے بچتا ہے اور قیمتی متاع زندگی کو ضائع کرنے کی پرواہ تک نہیں کرتا۔

البتہ وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب یہی انسان کہے گا۔ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ فِيمَا تَرَكْتُ. اے پروردگار ایک دفعہ مجھے واپس پلٹا دے اب میں زندگی کو تیرے امر کے مطابق خرچ کروں گا۔ تو جواب ملے گا اب ہرگز مہلت نہیں مل سکتی پس حسرت لے کر موت کا جام پینا پڑتا ہے۔

ہم نے عظمت پروردگار کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تاکہ غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کے کانوں میں اذان کی آواز آتی۔ وضو کرتے تو ان کا رنگ بدل کر پیلا ہو جاتا تھا اور لوگوں کے پوچھنے پر فرماتے تھے بہت

بڑی بارگاہ میں حاضری کے لیے جانا ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام شب تاریک میں اپنی ریش مبارک کو پکڑ کر گڑگڑا کر روتے تھے اور عرض کرتے تھے **آہ من قلة الزاد و بعد الطریق** ہائے زاد کم ہے اور راستہ لمبا ہے۔

بہر صورت زندگی سے قیمتی چیز دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ پس اگر زندگی کو خرچ کرنا ہے اور قربان کرنا ہے تو تاش یا تماشہ کے بدلہ میں نہیں بلکہ کسی ایسی قیمتی چیز پر اس کو قربان کیا جائے کہ زندگی دینے کے بعد پچھتاوا اور پریشانی نہ ہو بلکہ راحت و شادمانی نصیب ہو۔

عظمت پروردگار کے پیش نظر اس کے دین کی خاطر اپنی زندگی نذرانہ پیش کرنا موت نہیں بلکہ شہادت ہے اور اس مقصد کو جس طرح حسینؑ نے واضح کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا کوئی دوسرا پیش نہیں کر سکا مثلاً جوان بیٹے کی لاش' بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں کے لاشے اوران کے علاوہ دیگر جانثاروں کے ریگ صحرا پر تڑپتے ہوئے لاشوں کے بیچ میں گرم ریت پر تیمم کر کے قبلہ رخ ہو کر کہنا ''اللہ اکبر'' اور سجدہ پروردگار میں سر رکھ کر یہ الفاظ رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں۔ **ترکت الخلق طرانی هواک وایتمت عیالی کیے اراک.** اے پروردگار ان عزیزوں اور جانثاروں سے تو کیا پوری مخلوق سیکنارہ کشی آسان ہے لیکن تیری محبت سے کنارہ کشی مشکل ہے پس سب خلق کو تیری محبت میں خیر باد کہہ رہا ہوں اور اپنی اولاد کو یتیم کرنا گوارا کر رہا ہوں تیرا وصال نصیب ہو۔ پس اپنے آپ کو دین توحید میں فنا کر کے حسینؑ نے موت کو مار دیا اسی لیے حسینؑ کا ذکر بھی عبادت ہے۔

ہائے کس قدر بے درد تھے وہ لوگ جو زبان پر کلمہ رسول جاری کرتے تھے اور آل رسول کو اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ جن کو پیغمبرؐ کی زبان جوانانِ جنت کا

سردار کہہ چکی تھی۔ کہتے ہیں گیارہویں محرم کو جب فوج اشقیا نے اپنے نجس مردوں کو دفن کرنے کا پروگرام بنایا تو بنت علی نے فضہ سے کہا جا کر عمر بن سعد سے کہو اگر تم حسینؑ کو دفن نہیں کرتے تو نہ سہی ہمیں اجازت دے دو تا کہ ہم باقی لاشے نہ سہی کم از کم فرزندِ رسولؐ کو دفن کر دیں۔ تو فضہ پیغام لے کر گئی لیکن روتی ہوئی پلٹی۔ بی بی نے پوچھا کیوں روتی ہو؟ تو اس نے جواب دیا وہ ظالم کہتا ہے ہمیں صرف مسلمانوں کی لاشوں کو دفن کرنے کا حکم ملا ہے۔'' ہائے جناب زینبؑ نے سنا تو منہ پیٹ لیا ہو گا اور نانا کی قبر کی طرف منہ کر کے کہا ہو گا۔ **نانا.......... آج تیری امت تیرے** حسینؑ کو مسلمان بھی نہیں سمجھتی۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

حضرت آیت اللہ علامہ حسین بخش جاڑا نور اللہ مرقدہ

آپ 1920ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گمنام گاؤں جاڑا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی ایک معزز اور متدین شخصیت تھے۔ جونہی وہ مذہب اہل بیتؑ سے متعارف ہوئے تو ارادہ کیا کہ اپنا بیٹا علوم آل محمدؐ کے لیے وقف کروں گا۔ خدا نے انہیں دو بیٹے دیئے۔ آپ نے دونوں کے لیے علوم اہل بیتؑ کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ علامہ موصوف اہل سنت کے حلقہ دروس سے بھی استفادہ کرتے رہے۔ پاکستان میں درس نظامی کی تکمیل کے اور کافی عرصہ مختلف مدارس میں تدریس فرماتے رہے۔ اپنی تدریسی صلاحیت کا لوہا منوا چکے تھے۔ پھر ۱۹۵۲ء میں حوزہ علمیہ نجف اشرف چلے گئے۔ (علامہ اس وقت دار العلوم محمدیہ سرگودھا کے پرنسپل تھے اور وہاں سے نجف گئے اور نجف سے مدرسہ کی انجمن کے سیکرٹری کو خط لکھا کہ نجف میں زیر تعلیم ہو گیا ہوں۔)

آپ نے تین سال نجف اشرف میں دروس خارج پڑھے اور آپ نے علمی فقہی تشنگی دور کی۔ نجف اشرف میں حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے سید محسن حکیم نور اللہ، حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے شاہرودی، حضرت آیت العظمیٰ آقائے خوئی نور اللہ، حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید جواد شیرازی جیسے مجتہدین سے درس خارج اور علم اصول وفقہ حاصل کیا۔

آپ بہت زیادہ ذہین تھے اس لیے اساتذہ نے تین سال کافی سمجھے اور حکم دیا کہ آپ صاحب رائے ہیں اپنے ملک میں خدمات سرانجام دیں۔ آپ 1955ء میں وطن واپس آئے اور آپ نے اپنے ہی گاؤں میں ایک دینی مدرسہ ''باب النجف'' کی تاسیس کی اور اسے اپنے وسائل سے تعمیر کیا۔ آپ کی علمی شخصیت اس قدر روشن تھی کہ 50 سال قبل ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے باوجود ایک گمنام گاؤں میں دور دراز سے طلباء علمی تشنگی دور کرنے آپہنچے تھے۔ وہ طلباء پھر مستقبل کے برجستہ علماء بنے۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ حجۃ الاسلام جناب قبلہ سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعۃ المنتظر، لاہور
۲۔ حجۃ الاسلام جناب سید کرامت علی شاہ، پرنسپل جامعۃ المصطفیٰ، لاہور
۳۔ حجۃ الاسلام جناب مولانا غلام حسن، پرنسپل باب النجف، جاڑا
۴۔ حجۃ الاسلام جناب مولانا سید امداد حسین شیرازی، پرنسپل باب الاسلام، ملتان
۵۔ حجۃ الاسلام جناب شہید ملت علامہ اشیر جاڑوی، پرنسپل مظفر المدارس، لاہور
۶۔ حجۃ الاسلام جناب مولانا محمد ہاشم، پرنسپل خاتم الانبیاء، چکوال
۷۔ حجۃ الاسلام جناب علامہ ملک اعجاز حسین، پرنسپل دار العلوم کربلا خوشاب
۸۔ حجۃ الاسلام جناب علامہ نذر حسین ظفر، نائب پرنسپل دار العلوم محمدیہ، سرگودھا
۹۔ حجۃ الاسلام جناب سید ضمیر باقر نجفی آف کلورکوٹ، بھکر
۱۰۔ راقم الحروف ناصر مہدی جاڑا، وائس پرنسپل منہاج الحسین، لاہور

آپ تدریس، تقریر اور تحریر تینوں میدانوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے پڑھائے ہوئے دروس آج تک آپ کے شاگردوں کو لفظ بہ لفظ یاد ہیں پاکستان کے مختلف مدارس میں تدریسی فرائض انجام دیے اور پاکستان کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں انہوں نے خطابت نہ فرمائی

ہو۔ پوری ملت شیعہ پاکستان کی خوبصورت اور بہترین انداز کی تقاریر سے استفادہ کرتی رہی۔

تصنیفات:

۱۔ تفسیر انوار النجف، چودہ جلدی کامل
۲۔ لمعۃ الانوار فی عقائد الابرار
۳۔ اصحاب الیمین (شہداء کربلا کی شہادتیں)
۴۔ اسلامی سیاست
۵۔ امامت وملوکیت در جواب خلافت وملوکیت
۶۔ نماز امامیہ
۷۔ انوار الشریعہ فی فقہ الجعفریہ
۸۔ معیار شرافت
۹۔ مجالس الفاخرہ (آپ کی مجالس کا مجموعہ)
۱۰۔ آداب النساء
۱۱۔ مناظرہ بغداد (جس پر حکومت کی طرف سے پابندی ہے)
۱۲۔ احباب رسولؐ در جواب اصحاب رسولؐ
۱۳۔ اسلامی فکر

آپ لاہور کی دینی درسگاہ جامعہ امامیہ میں کرسی درس پر بیٹھے بیٹھے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ناصر مہدی جاڑا

فہرست کتب ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

☆	نام کتاب	ہدیہ
☆	تلاش حق	120
☆	ذکر حسینؑ	100
☆	برزخ چند قدم پر	120
☆	اسلامی معلومات	100
☆	محمدؐ تا محمدؐ	100
☆	محمدؐ تا علیؑ	100
☆	سورج بادلوں کی اوٹ میں	120
☆	شہید اسلام	100
☆	قیام عاشورہ	50
☆	قرآن اور اہل بیت	100
☆	دینی معلومات	45
☆	نوجوان پوچھتے ہیں کہ شادی کس سے کریں؟	25
☆	ظالم حاکم اور صحابی امام	10
☆	توضیح ۱۶	200

☆	تفسیر سورۂ فاتحہ	100
☆	مشعل ہدایت	100
☆	اسم اعظم	150
☆	سوگنامہ آل محمدؐ	200
☆	افکار شریعتی	250
☆	گفتار شریعتی	150
☆	سیرت آل محمدؐ	150
☆	110 بہترین مناظرے	250
☆	ٹاپ (10) خطباء	200
☆	سیرت رسولؐ	125
☆	نبی امی	50
☆	آسان مسائل (چار جلد)	240
☆	تاریخ جنت البقیع	100
☆	عمدۃ المجالس	100
☆	حقوق زوجین	25
☆	ارشادات امیر المومنینؑ	15
☆	صدائے مظلوم	45
☆	مراسم عروسی و معجزات بتولؑ	30

☆	اسلامی پہیلیاں	25
☆	لڑکی سونا لڑکا چاندی	25
☆	فکر حسینؑ اور ہم	10
☆	پیام عاشورہ	30
☆	معصومینؑ کی کہانیاں	25
☆	ارشادات مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ	30
☆	آزادی مسلم	6
☆	فقہ اہل بیتؑ	45
☆	صحیفہ پنجتن	100
☆	حرف احساس	100
☆	حسینؑ میرا	100
☆	جام غدیر	150
☆	زندہ تحریریں	100
☆	شاہکار رسالت	60
☆	محشر خاموش	200
☆	اسلام اور کائنات	200
☆	غریب ربذہ	100
☆	فطرت	125